

تذکرہ معاصرین

جلد: 03



مصنف: مالک رام

جمال پرنٹنگ پریس، دہلی



PDF By :
Meer Zaheer Abass Rustmani

Facebook Group Link :

<https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/>

تذکرہ مُعاصرین

۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۵ء میں وفات پانے والے
ادباز کے حالات اور کلام

۳

مالک رام

مکتبہ جامعہ انٹرنیٹ دہلی

© مالک رام ۱۹۷۸ء

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - اردو بازار، دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - پرس بلڈنگ، بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

قیمت ۲۲/-

جون ۱۹۷۸ء

پہلی بار

(جمال پرنٹنگ پریس دہلی)

ڈاکٹر سید عابد حسین
کی نذر

نشانِ سجدہ من نیز ہم بر آستانِ بینی

تعارف

تذکرہ معاصرین کی اس جلد میں ان ۵۶ ادیبوں، شاعروں، صحافیوں کے حالات شائع کیے جا رہے ہیں، جو ۱۹۷۲ اور ۱۹۷۵ء کے دو برسوں میں ہم سے جدا ہوئے۔ وہ اس جگہ گئے، جہاں ہم میں سے ہر ایک آگے پیچھے پہنچنے والا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے اپنی حیاتِ مستعار میں کیا کیا ابتدرت نے انھیں جو صلاحیتیں و بعت کاتھیں، کیا انھوں نے ان کا اپنی بساطِ سحر ٹھیک استعمال کیا، کیا انھوں نے اپنے دل و دماغ کی خداداد قوتوں کو اپنے سموطنوں اور سنی نوعِ انسان کی بھلائی اور بہتری کی راہ میں صرف کیا، کسی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا یہی معیار رہا ہے، اور یہی آئینہ بھی رہیگا۔ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے، تو بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے امانت میں خیانت نہیں کی، اور کم و بیش کامیاب زندگی گزاری۔

ان میں سے بعض اصحاب اس پالیے کے تھے کہ کوئی نو رخ ادب اردو انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ انھوں نے اپنے پیچھے ایسے امیتا آثار چھوڑے ہیں اور اپنے بعد کے آنے والوں کی راہ اس حد تک سموار کر دی ہے کہ اردو کا ہر ایک طالب علم ان کا ممنون رہیگا۔ حالات کی فراہمی میں طریقہ کار وہی رہا ہے، جس کی طرف اس سے پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ جن اصحاب سے میرے طویل زمانے تک ذاتی تعلقات رہے، یا جن کے لواحقین اور متعلقین نے معلومات تمہیا کرنے میں مستعدی دکھائی، ان کے حالات بھی مفصل اور بڑی حد تک مکمل ہیں؛ دوسروں کے نسبتاً تشنہ ہیں، اگرچہ یہاں بھی بنیادی اور اہم کوائف بہر حال محفوظ ہو گئے ہیں۔ موجودہ حالات میں ان سے زیادہ معلومات حاصل کرنا دشوار تھا۔

یہاں ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا بوجہ نہیں ہوگا: بعض اوقات ایک صاحب کے ترجمے میں کسی دوسرے شخص کے حالات بھی جمع ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے کسی کے نزدیک یہ غیر ضروری ہو۔ یہ بات اہم خیال کرتا ہوں کہ حتی الامکان

ہر ایک ادیب یا شاعر کے خاندان کا حال معلوم ہونا چاہیے تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ اس کا پس منظر کیا تھا، وہ کس ماحول میں پیدا ہوا، بڑا ہوا۔ پھر اس کا اشنا رکھنا تھا جس سے ہم اس کی تعلیم و تربیت کا کچھ اندازہ کر سکیں۔ اس سے ہمارے لیے یہ فیصلہ رزا آسان ہو جائیگا کہ اس کی کونسی صلاحیت موردِ توجہ تھی اور کونسی اس کے اپنے زورِ بازو کا نتیجہ۔ اس کے علاوہ ایک ادب بات بھی ان تفصیلات میں جاننے کا باعث ہوتی ہے۔

اپنی جستجو اور پوچھ گچھ کے دوران میں میرے سامنے کئی ایسی باتیں آ جاتی ہیں جن سے متعلق کسی نے کچھ نہیں لکھا۔ چونکہ حسن اتفاق سے یہ معلومات حاصل ہو گئی ہیں، چاہتا ہوں کہ وہ محفوظ ہو جائیں، ورنہ بعد کو کوئی اتنا بتانے والا بھی نہیں ہوگا اور وہ کاملاً اردہ و خفا میں چلی جائیگی؛ میرے خیال میں یہ علم کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔ کون کہہ سکتا ہو کہ کب کسی کو ان کی ضرورت نہیں پیش آئیگی۔

جب بھی ان اموات کی فہرست اور ان کے حالات پر نظر ڈالتا ہوں، تو رہ رے کے ایک بڑا ذہن میں آتی ہے کہ سفینے بھر رہے ہیں اور سینے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر روز بیشمار نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں، لیکن علم کم ہو رہا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جانا، قوانینِ ظہرت کی صداقت سے انکار کا مرادف ہوگا لیکن اتنا تو سر کوئی محسوس کر سکتا ہے کہ ہماری نئی نسل کو بزرگوں کی جلائی ہوئی شمعِ علم و معرفت روشن رکھنے کے لیے بہت کوشش کرنا پڑے گی۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر ان احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے حالات کی فراہمی میں مدد کی، کلام کے مجموعے تیار کیے، یاد دسری مطبوعات مستعار دیں۔ میں ان سب کا شکریہ فرداً فرداً پہلے بھی ادا کر چکا ہوں، اب پھر مجموعی طور پر اس کا اعادہ کرتا ہوں۔

فجرِ اہم اللہ احسن الجزاء

نئی دہلی

۲۰ اپریل ۱۹۷۸ء

مالک رام

فہرست بہ ترتیب حروف تہجی

- ۱۔ اثر حیدر آبادی، صدیق احمد : ۹۴
- ۲۔ اظہر سیالکوٹی، احمد الدین (رے، ڈی) : ۵۳
- ۳۔ اعجاز حسین، سید (پروفیسر) : ۲۱۸
- ۴۔ انسر میرٹھی، حامد اللہ : ۸۴
- ۵۔ اکل جالندھری، رام پرتاپ : ۲۰
- ۶۔ امجد گنجی، محمد امجد : ۳۰
- ۷۔ انور، ڈاکٹر منوہر سہاے : ۴۵
- ۸۔ انور کاٹھوی، یار محمد انصاری : ۱۶۲

-
- ۹۔ بسمل آبادی، سکھ دیو پرشاد : ۳۰۹
 - ۱۰۔ بہزاد لکھنوی، سردار احمد خان : ۱۴۴
 - ۱۱۔ تاج ڈٹکی، محمد اسماعیل علی خان بہادر : ۱۵۱
 - ۱۲۔ تمکین سرمست، محمد قادر الدین، سید : ۲۳۷
 - ۱۳۔ ٹھاکر پونچھی، جگن ناتھ : ۱۳۱
 - ۱۴۔ شاقب عظیم آبادی، سید حسن رضا : ۱۵
 - ۱۵۔ شرچھری، عبدالحفیظ صدیقی : ۱۵۸
 - ۱۶۔ جمالی، طفیل احمد : ۱۳۶
 - ۱۷۔ جوان سندیلوی، منی لال : ۲۴
 - ۱۸۔ حامد اللہ آبادی، حامد حسین : ۲۶۹

۱۹. حمید احمد خان ۷۶ :
۲۰. حیرت بدایونی، سید حسن ۲۰۷ :
۲۱. خضر بیگی، مولا بخش ۹۹ :
۲۲. دیوان سنگھ مفتون ۱۸۷ :
۲۳. ذوالفقار علی بخاری ۲۲۸ :
۲۴. ن - م، راشد ۲۷۵ :
۲۵. ریاض الفاری، ریاض الدین، قاضی ۱۱۷ :
۲۶. ساغر صدیقی، محمد اختر ۱۲۸ :
۲۷. ساگر نودری، بلونت کار ۶۰ :
۲۸. سید مسعود حسن رضوی ادیب ۳۲۲ :
۲۹. شاہ معین الدین احمد ندوی ۱۶۶ :
۳۰. شفقت کاظمی، سید فضل الحسن ۲۲۵ :
۳۱. شمس منیری، شمس الدین احمد ۲۱۳ :
۳۲. شمیم کرہانی، شمس الدین حیدر ۲۲۳ :
۳۳. شورش کاشمیری، عبدالکریم، آغا ۲۸۷ :
۳۴. شیر محمد اختر گجراتی ۱۷۲ :
۳۵. طالب دہلوی، شیش چندر سکینہ ۲۹۷ :
۳۶. طالب رزاقی، محمد قطب الدین حسن قادری ۲۵۵ :
۳۷. عبدالرحمن چغتائی ۱۷۶ :
۳۸. عزیز جہالاداری، محمد عزیز الرحمن قریشی ۳۷ :
۳۹. قاصر، یریم ناہقودت ۳۱۲ :
۴۰. قیس کوٹوی، نور محمد ۲۷ :
۴۱. مانی ناگپوری، بشیر خان ۲۲۰ :

- ۴۲ : مجید امجد، عبدالمجید
 ۴۳ : محشر مرزا پوری، مرزا فرزند علی
 ۴۴ : محمد حسین حسان
 ۴۵ : محمود احمد عباسی امرودی
 ۴۶ : محی صدیقی لکھنوی، محمد حسین
 ۴۷ : مسیح الزمان، سید
 ۴۸ : مضطر حیدری، دلاور حسین
 ۴۹ : منظر لکھنوی، سید منظر حسن
 ۵۰ : ہندوستان
 ۵۱ : ہجو شمس، سید عبدالقیوم
 ۵۲ : میرزا محمود بیگ
 ۵۳ : نثار امدادی، نثار حسین
 ۵۴ : نجم آفندی، میرزا تجل حسین
 ۵۵ : نشتر جالندھری، محمد عبدالحکیم خان
 ۵۶ : ہزار لکھنوی، سید حسن

فہرست

بترتیب تاریخ وفات

نمبر	نام / تخلص	مقام وفات	تاریخ وفات	صفہ
۱۔	شائق عظیم آبادی، سید حسن ضا	پٹنہ	۱۹ جنوری ۱۹۷۴ء	۱۵
۲۔	اکمل جالندھری، ارام پرتاپ	دلی	۲۰ جنوری ۱۹۷۴ء	۲۰
۳۔	جوان سندیوی، مسی لال	لکھنؤ	۲۵ جنوری ۱۹۷۴ء	۲۴
۴۔	قیس کوٹوی، نور محمد	سیکت	۲۶ جنوری ۱۹۷۴ء	۲۷
۵۔	امجد نجفی، محمد امجد	کننگ	یکم فروری ۱۹۷۴ء	۳۰
۶۔	عزیز جھالادڑی، محمد عزیز الرحمن قزوینی، جھالادڑ	۶ فروری ۱۹۷۴ء		۳۷
۷۔	ہجو شمس، سید عبدالیقوم	پٹنہ	۸ فروری ۱۹۷۴ء	۴۱
۸۔	انور، ڈاکٹر منو ہر سہاے	نئی دہلی	۱۷ فروری ۱۹۷۴ء	۴۵
۹۔	اظہر سیالکوٹی، احمد الدین (اے، ڈی) کراچی		۲۴ فروری ۱۹۷۴ء	۵۳
۱۰۔	ساگر نیکو، بلونت کمار	نیکوور	۲۵ فروری ۱۹۷۴ء	۶۰
۱۱۔	محمد احمد عباسی امروہوی	کراچی	۲۷ مارچ ۱۹۷۴ء	۶۴
۱۲۔	ہند ناتھ	بھٹی	۲۰ مارچ ۱۹۷۴ء	۷۱
۱۳۔	حمید احمد خان	لاہور	۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء	۷۶
۱۴۔	افسر میرٹھی، حاد اللہ	لکھنؤ	۱۹ اپریل ۱۹۷۴ء	۸۴
۱۵۔	اثر حیدر آبادی، صدیق احمد	حیدر آباد	۲۷ اپریل ۱۹۷۴ء	۹۴
۱۶۔	خضر تیمی، مولا بخش	لاہور	اپریل ۱۹۷۴ء	۹۹
۱۷۔	نثار امادی، نثار حسین	اٹاوہ	۴ مئی ۱۹۷۴ء	۱۰۳
۱۸۔	مجید امجد، عبدالحمید	ساہیوال	۱۷ مئی ۱۹۷۴ء	۱۱۰

- ۱۹۔ ریاض انصاری، ریاض الدین، قاضی ... گوالیار۔۔۔۔۔ ۹ جولائی ۱۹۷۴ء ۱۱۷
- ۲۰۔ محمد حسین حسان ... نئی دہلی۔۔۔۔۔ ۱۳ جولائی ۱۹۷۴ء ۱۲۳
- ۲۱۔ ساغر صدیقی، محمد اختر۔۔۔۔۔ لاہور۔۔۔۔۔ ۱۸/۱۹ جولائی ۱۹۷۴ء ۱۲۸
- ۲۲۔ جمالی، طفیل احمد۔۔۔۔۔ کراچی۔۔۔۔۔ ۱۲ اگست ۱۹۷۴ء ۱۳۶
- ۲۳۔ شہاکر پوچھی، جگن ناتھ۔۔۔۔۔ جھٹوں۔۔۔۔۔ ۱۴ اگست ۱۹۷۴ء ۱۴۱
- ۲۴۔ بہزاد کھنوی، سردار احمد خان۔۔۔۔۔ کراچی۔۔۔۔۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء ۱۴۴
- ۲۵۔ محشر مرزا پوری، مرزا فرزند علی۔۔۔۔۔ الہ آباد۔۔۔۔۔ یکم نومبر ۱۹۷۴ء ۱۴۸
- ۲۶۔ تاج ٹونکی، نواب محمد اسماعیل علی شاہادران ٹونک۔۔۔۔۔ ۲۱ نومبر ۱۹۷۴ء ۱۵۱
- ۲۷۔ نثر چھتری، عبدالحفیظ صدیقی۔۔۔۔۔ بھیلواری شریف ۲۶ نومبر ۱۹۷۴ء ۱۵۸
- ۲۸۔ انور کامٹوی، حافظ یاحمد انصاری۔۔۔۔۔ کاسمی۔۔۔۔۔ ۲۷ نومبر ۱۹۷۴ء ۱۶۲
- ۲۹۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔۔۔۔۔ اعظم گڑھ۔۔۔۔۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۴ء ۱۶۶
- ۳۰۔ شیر محمد اختر گجراتی۔۔۔۔۔ لاہور۔۔۔۔۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۷۴ء ۱۷۲
- ۳۱۔ عبدالرحمن چغتائی۔۔۔۔۔ لاہور۔۔۔۔۔ ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء ۱۷۶
- ۳۲۔ دیوان سنگھ مفتون۔۔۔۔۔ نئی دہلی۔۔۔۔۔ ۲۶ جنوری ۱۹۷۵ء ۱۸۷
- ۳۳۔ مسیح الزمان، سید (پروفیسر)۔۔۔۔۔ الہ آباد۔۔۔۔۔ ۹ فروری ۱۹۷۵ء ۲۰۴
- ۳۴۔ حیرت بدایونی، سید حسن۔۔۔۔۔ حیدر آباد۔۔۔۔۔ ۱۵ فروری ۱۹۷۵ء ۲۰۷
- ۳۵۔ شمس الدین احمد منیری۔۔۔۔۔ پٹنہ۔۔۔۔۔ ۱۸ فروری ۱۹۷۵ء ۲۱۳
- ۳۶۔ اعجاز حسین، سید (پروفیسر)۔۔۔۔۔ مظفر پور۔۔۔۔۔ ۲۳ فروری ۱۹۷۵ء ۲۱۸
- ۳۷۔ شفقت کاظمی، سید فضل الحسن۔۔۔۔۔ ڈیرہ غازی خان ۱۲ مارچ ۱۹۷۵ء ۲۲۵
- ۳۸۔ شمیم کربانی، شمس الدین حیدر۔۔۔۔۔ دہلی۔۔۔۔۔ ۱۹ مارچ ۱۹۷۵ء ۲۳۳
- ۳۹۔ مانی ناگپوری، بشیر خان۔۔۔۔۔ ناگپور۔۔۔۔۔ ۳ مئی ۱۹۷۵ء ۲۴۰
- ۴۰۔ مضطر حیدری، دلادر حسین۔۔۔۔۔ کلکتہ۔۔۔۔۔ ۱۳ مئی ۱۹۷۵ء ۲۴۳
- ۴۱۔ ذوالفقار علی بخاری، سید۔۔۔۔۔ کراچی۔۔۔۔۔ ۱۲ جون ۱۹۷۵ء ۲۴۸

- ۲۶۱ - نشر جان رسی، محمد عبدالجکیم خان لاہور۔۔۔۔۔ ۲۲ جون ۱۹۷۵ء ۲۶۱
- ۲۶۳ - منظر لکھنوی، سید منظر حسن۔۔۔۔۔ لکھنؤ۔۔۔۔۔ ۲۳/۲۲ جون ۱۹۷۵ء ۲۶۵
- ۲۶۴ - حامد الاکبادی، حامد حسین۔۔۔۔۔ الہ آباد۔۔۔۔۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۵ء ۲۶۶
- ۲۶۵ - ن، م، راشد (نذر محمد)۔۔۔۔۔ لندن۔۔۔۔۔ ۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء ۲۷۵
- ۲۶۶ - شورش کاشمیری، عبدالکریم (آغا) لاہور۔۔۔۔۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء ۲۸۷
- ۲۶۷ - ہزار لکھنوی، سید حسن۔۔۔۔۔ کانپور۔۔۔۔۔ ۳ نومبر ۱۹۷۵ء ۲۹۴
- ۲۶۸ - طالب دلووی، شیش خیر سکینہ۔۔۔۔۔ دہلی۔۔۔۔۔ ۱۷ نومبر ۱۹۷۵ء ۲۹۷
- ۲۶۹ - محوی صدیقی لکھنوی، محمد حسین۔۔۔۔۔ بھوپال۔۔۔۔۔ ۱۹ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۰۳
- ۵۰ - بسمل الاکبادی، سکھدیو پرشاد۔۔۔۔۔ الہ آباد۔۔۔۔۔ ۲۲ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۰۹
- ۵۱ - قاصر، برہم ناتھ دت۔۔۔۔۔ کوردکیشتر۔۔۔۔۔ ۲۵ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۱۲
- ۵۲ - سید مسعود حسن رضوی ادیب۔۔۔۔۔ لکھنؤ۔۔۔۔۔ ۳۰ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۲۲
- ۵۳ - تکیں مرست، سید محمد قادر الدین۔۔۔۔۔ حیدر آباد۔۔۔۔۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۳۷
- ۵۴ - میرزا محمود بیگ۔۔۔۔۔ دہلی۔۔۔۔۔ ۱۴/۱۵ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۴۲
- ۵۵ - نجم آفندی، میرزا تنجیل حسین۔۔۔۔۔ کراچی۔۔۔۔۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۴۹
- ۵۶ - طالب رزاقی، محمد قطب الدین حسن۔۔۔۔۔ حیدر آباد۔۔۔۔۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۵۵

شائقِ عظیم آبادی، سید حسن رضا

پٹنہ کے علمی دادی اہل حق کی معروف شخصیت تھے۔ ان سے دالہنشی سید علی حسن عظیم آبادی وہاں کے مشہور اور باہر خوشنویس تھے اور شہر میں "بڑے منشی صاحب" کے لقب سے معروف تھے۔ وہ اس فن میں باقر عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔

شائق کی ولادت ۱۹۰۵ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم نجی طور پر گھر کے بزرگوں سے پائی۔ اس کے بعد شہر کے مسلم استاد عالم مولانا لاڈلے صاحب سے منطق، فلسفہ، طب، فقہ، حدیث وغیرہ حاصل کیے۔ ۱۹۲۶ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ سے "عالم" کی سند لی اور ۱۹۲۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے "فاضل ادب" کی۔ پھر ۱۹۳۰ء میں انگریزی کے دسویں درجہ کا امتحان بھی پاس کر لیا، حال آنکہ وہ خود اس زمانے میں سرکاری اسکول پٹنہ میں عربی اور فارسی کے معلم رہتے۔ مختلف اسکولوں میں کام کرنے کے بعد بالآخر ۱۹۶۵ء میں پٹنہ پر سبکدوش ہوئے۔

اس صدی کے اوائل میں پٹنہ سٹی، جہاں ان کی سکونت تھی، علم و ادب اور شعر و سخن کا مرکز تھا۔ شاد عظیم آبادی (ف: جنوری ۱۹۲۷ء) عبد الحمید پریشان (ف: اگست ۱۹۰۵ء) تنہا عادی (ف: نومبر ۱۹۰۷ء) اور کئی دوسرے حضرات اسی نواح کے رہتے دے تھے۔ غرض پوری فضا شعر و نغمہ سے جموڑھی۔ یہی وجہ ہے کہ شائق بھی بچپن سے شعر گوئی کی طرف اہل ہو گئے۔ آغاز میں انھوں نے میر باقر عظیم آبادی اور ان کے شاگرد رشید وحید الدین وحید الہ آبادی سے مشورہ کیا۔ فن خطاطی اور خوشنویسی میں بھی میر باقر ہی کے شاگرد تھے ان دونوں سے انے استفادے کا ذکر ایک مقطع میں کرتے ہیں: یہی ہے راہنمائی سخن کی، اے شائق! جو کھینچا ہو، تو نقشِ وحید باقر کھینچ

ایک اور قطع ہے :

ہے فیض حضرت یا قر سے اتباع وحید

کہ جن کے رنگ کا، شاقب چوہا ہونہ سکا

افسوس کہ ان کا شعری مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اسے ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے سید سعید رضا گہر عظیم آبادی نے "سرمایہ نشاط" کے عنوان سے مرتب کر کے شائع کیا (پٹنہ : ۱۹۷۷ء)۔ دد نثری کتابیں "عظیم آبادی کی گزشتہ ادبی محفلیں" در "یادگارِ عشق" (سوانح عمری شاہ رکن الدین عشق دہلوی ثم عظیم آبادی) ان کی حیات میں چھپ گئی تھیں۔ پہلی کتاب پر بہارِ انجوشین بورڈ نے ایک ہزار روپیہ انعام بھی دیا۔

ان کے گیارہ اولادیں ہوئیں لیکن بد قسمتی سے نو بچے ان کی زندگی ہی میں داغِ مفارقت دے گئے۔ ان پے در پے حادثات نے ان کا دماغی توازن مختل کر دیا۔ بہت دن کے علاج معالجے کے بعد یہ توازن بحال ہوا تھا کہ اپنے چل چلاؤ کا زمانہ آگیا۔ ۱۹ جنوری ۱۹۷۲ء کو دن کے دس بجے پٹنہ میں رحلت کی۔ آٹا لند و آٹا لیبہ راجعون۔ محلہ شاہ کی لٹی میں مغل مسجد کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

حضرت قتیل دانا پوری نے تاریخِ وفات کہی :

ایں غلط ثابت آبدہ، صد حیف قطب جہندہ اے قتیل، از جاے
بہر تاریخ اد، ندا آمد "آہ شاقب، صد آہ، حسرت ہائے"
(۱۳۹۳)

سید محمد یوسف کے طویل قطعہ تاریخ کا آخری شعر ہے :

رحلت کا سن ہے بے سراہ "شاقب سوئے جنت روانہ"
(۱۳۹۳-۱-۱۳۹۳)

ان کا کلام نچتہ اور بے غیب ہے۔ مضمون آفرینی کی کوشش نمایاں ہے۔ غزل کے

علاوہ نظم بھی کہتے تھے۔ چنانچہ مجموعے میں چند نظمیں بھی شامل ہیں۔ نمونہ کے طور پر
چندر شعر ملاحظہ ہوں:

کل کہتے ہیں وہ ہر دن کل آج نہیں ہوتا

ہے وعدہ فردا بھی فرداے قیامت کا
یہ رات مصیبت کی ڈالے بھی نہیں ملتی

کٹ جاتا ہے باتوں میں دن عیش و مسرت کا
نہ دیکھا مجھے آنکھ اٹھا کر تو کیا غم شرف تو ملا بزم کی حاضری کا
ٹھہری جو دیر دکیہ میں تھی پستی نگاہ منزل نہیں تھی وہ، جسے منزل بنا دیا
گرتے ہیں زرد پتے کہ شاخیں ہوں سبز پھر

پیغام دے رہی ہے خزاں بھی بہار کا
اپنا بھی آشیانہ کبھی شاخ گل پر تھا میں نے بھی لطف اٹھایا ہے فصل بہار کا
مرے گناہ ہیں پھر بھی شمار کے اندر ترے کرم کا تو کوئی حساب ہو نہ سکا
وقت یہ کیسا آگیا، نام خلوص مٹ گیا

غیر تو غیر ہی ہوں، دیتے ہیں آشا فریب
ہیں مسخوریوں اپنے جلوؤں سے خود چلے کیا ہیں آئینہ خانے سے آب
کہتے ہو، کیوں نظر آتا ہوں پریشان بہت

جان کر تم تو بنا کرتے ہو انجان بہت
فریب دینے لگی انتظار کی آہٹ سمجھ رہا ہوں جسے پائے یاد کی مصیبت
ہے کاروانِ حبس سب کیا سبک قرار کہ پیرلوں سے ملے ہے سوداگر آہٹ
چلی ہی آتی ہے پری جو اب بے یازوں ہے بے یسوں کو یہ روز شمار کی آہٹ
ساقی! ترے کرم کی جلالت بھی ہے عجیب

کل جو شراب تلخ تھی، وہ انگلیں ہے آج
تقدیر بگڑتی ہے تو ساحل پہ ہے طوفان اندنگہاں ہے، تو طوفان بھی ہے ساحل

عرش بریں سے روزِ پلشتی ہے نامراد ہے شکوہ سنج ہم سے فغاں اور فغاں سے ہم
زندگی ہو گئی کس طرح بسر، یاد نہیں روز و شب یاد نہیں، شام و سحر یاد نہیں
لٹ گیا کیسے محبت میں یہ گھر، یاد نہیں کیسے برباد ہوئے قلب و جگر، یاد نہیں
جب چاک گریاں ہو کلی آتی ہے خوشبو تخریب کے پردے میں ہے تعمیر کا پہلو

زمین و آسمان کا فرق ان دونوں میں ہے پھر بھی
غمِ جاناں سے ہوتا ہے، غمِ دوراں کا اندازہ
کسی کا ایک دروازہ خدا جب بند کرتا ہے
اسی کے فضل سے کھلتا ہے کوئی اور دروازہ
دنیا کے مال و زر کی حقیقت ہی کیا ہے رشتہ جو استوار ہو، شاقب! خدا کے ساتھ
خدا کا شکر ہے وحشت رکھ لی، اگر دل کی

دگر نہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے
فرمائیے کس کس سے کوئی دل کو بچائے انداز سے، شوخی سے، تبسم سے، حیا سے
جب کچھ نہ رہا جامہ درمی کو، تو یہ سوچھی دو چادر گرہ کم کو دوں زاہد کی عبا سے
ہے شمع بھی خاموش، تپنگوں کو جلا کر سچ ہے کہ بڑے کام کا انجام برا ہے
جس حال میں وہ رکھے، اسی حال میں خوش ہو بندہ وہی اچھا ہے، جو راضی بہ نصیب ہے
داغ عاشقی، چشمِ تنہا، قلب و ارقہ انھیں لفظوں سے ہم شرح کتابِ زندگی سمجھے
بہارِ گلشنِ ہستی خزاں کے ساتھ ہے ناہ جودیکھے گریہِ شبنم، وہ پھولوں کی متہی ہے
دبے پانو نسیم آ کے کہ جاتی ہے کچھ سب سے

چمن کی جو کلی ہے، راز داں معلوم ہوتی ہے
چھتا تلورے میں کاٹنا، اور خلش دل میں سوئی پیدا
کہاں تکلیف پہنچی ہے، کہاں معلوم ہوتی ہے

دیکھے اور کوئی ذکر، باتیں ہوں تو ان کی ہوں

یہی اک داستان سینے، یہی اک داستان کہیے
 رسوا ہوئے تھے کل تو بہت اے جناب دل! پھر اس گلی میں جانے کو تیار کیوں ہوئے؟
 دیکھتے ہیں جو تمھارے گیسو درخ کی بہار صبح ان کی صبح ہے اور شام ان کی شام ہے
 کیا بتاؤں آپ کو تار بکری رد ز فراق صبح سے معلوم ہوتا تھا کہ وقت شام ہے
 ماتھے کا بل سمجھتے ہیں جس پیچ و تاب کو زینت ہے گیسوؤں کی اسی پیچ و تاب سے

اکمل جالندھری، رام پرتاب

اگرچہ ان کا خاندان مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر کا رہنے والا تھا، مگر چونکہ ان کے والدینڈت کھگت رام (ف: اگست ۱۹۲۹ء) لکشمی جگدگنیشکری، کھنہ (ضلع رمال) میں ملازم تھے، اور اسی سلسلے میں یہاں مقیم تھے، اس لیے رام پرتاب کی ولادت یہیں کھنہ میں ۳ فروری ۱۹۰۷ء کو ہوئی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ڈی اے، دی کالج، لاسو میں داخلہ لے لیا، لیکن ان کے بعد سلسلہ منقطع ہو گیا اور انھوں نے اکتوبر ۱۹۲۷ء میں ریلوے کے محکمے میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہیں شعر گوئی کے شوق کو فروغ ہوا، جس کی طرف رحمان طالب علمی کے زمانے ہی سے نمایاں تھا۔ ان کے ابتدائی اسکول میں پنڈت یوگ راج نظر سواہروی بھی مدرس تھے۔ نظر اچھے شاعر تھے۔ وہ زیادہ تر مذہبی مضامین لکھتے تھے؛ ان کا گیتا کا منظوم ترجمہ چھپ چکا ہے۔ اسی باعث شہر سیاسی لیڈر پنڈت مدن موہن مالویہ ان کے بڑے بڑا تھے۔ نظر نے نوجوان رام پرتاب کا میلان طبع دیکھ کر ان کی حوصلہ افزائی کی؛ اکمل تخلص بھی انھیں کا عطیہ تھا۔

ملازمت کے بعد باقاعدہ شعر کہنے کا موقع ملا، تو انھوں نے رضا علی خان رضا داوی سے اصلاح لینا شروع کی، جو انھیں کی طرح ریلوے ہی میں ملازم تھے۔ حسن اتفاق سے اس زمانے میں ریلوے کے اس دفتر میں کئی شاعروں کا اجتماع ہو گیا تھا۔ مثلاً عبدالغنی، نبال سیوہاروی، کبھی یہیں تھے اور اکمل سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ نبال بہت اچھا کہتے تھے؛ اور ان کا سائل دلوئی کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ بادل ناخواسہ تقسیم ملک کے بعد پاکستان گئے تھے اور وہیں کراچی میں جنوری ۱۹۵۲ء میں ان کا انتقال

ہوا۔ منور لکھنوی بھی اس زمانے میں یہیں تھے۔
 پوری عمر پلوے کی ملازمت میں گزری۔ یہیں سے ۲ فروری ۱۹۶۷ء کو سکدوش ہوئے۔
 اس کے بعد بسا اوقات کے لیے دلی کی ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازم ہو گئے تھے۔
 اتوار ۲۰ جنوری ۱۹۷۷ء کو انتقال ہوا اور ۲۱ جنوری کو جسدِ خاکی نذر آتش کر دیا گیا۔
 اولاد میں صرف ایک بیٹا رگھو بیرنندن چھوڑا۔ یہ سیندری فیکٹری میں ملازم ہیں۔
 انتخابِ کلام: "لوے گل" ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا (دلی ۱۹۷۶ء) وہ غالب کے شعر
 کا ملازمہ پورا کرنے کو دو اور مجموعے "نالہ دل" اور "دودِ حراغ" بھی شائع کرنا چاہتے
 تھے، لیکن یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، حال آں کہ دونوں مرتب ہو چکے تھے۔
 ان کے کلام میں کلاسیکی رجحان اور صحتِ زبان کے ساتھ جدید رجحانات کا پتا بھی جلتا
 ہے۔ وہ فطری شاعر تھے اور اگر زمانہ سازگار ہوتا، تو یقیناً اس سے ہمیں زیادہ شہرت حاصل
 کرتے جو انھیں نصیب ہوئی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

جب آئیاں ہی اپنا چین زار میں نہیں کیا شاخ سے غرض ہمیں مطلبِ ثمر سے کیا
 میں ناشائسِ عظمتِ دید و حرم نہیں نسبت انھیں مگر ہے تمے رنگِ در سے کیا

ہمیں کیا، گر خزاں کا دور ہو یا موسمِ گل ہو
 خزاں کا غم تو ان کو ہو جو کھیلے مونہاؤں سے

اب اس پہ بھی کوئی کھٹکے، تو کچھ علانِ نہیں چراغِ راہِ تری رگِ زری ہوئی تو ہے
 کرم نہیں نہ ہنسی، میں کرم سے در گزرا یہ کیا، ہستم پہ بھی مائل شتم شعرا نہیں

طریقِ عشق میں جب سرِ فردوسی شرطِ اول ہے

تو پھر عشاق کا منزل بمنزل امتحان کیوں ہو!

یہ مانا نغمہ زنِ مہتم، مرے سازِ تصور میں

مگر سازِ تصور کا بھی پردہ درمیاں کیوں ہو!

ہزار داغ ہیں ادران میں دل ہے یوں جیسے

کئی جازوں میں اک سوگوار کا عالم

گزر جاتا ہے اب دامن بچا کر ہر بشر مجھ سے زمانہ پھر گیا، کیا پھیر لی تم نے نظر مجھ سے
مے دم سے جہان زندگی میں زندگی سی ہے خدا شاہد کہ ہے یہ رونی شام و سحر مجھ سے
زبان و دل میں یہ کیا تفرقہ والا محبت کے کہ دل کچھ اور کہتا ہے، زبان کچھ اور کہتی ہے
کچھ تم پہ نہیں موقوف، کوئی دنیا میں ہمارا ہونہ سکا
تم ہم سے کنارہ کر بیٹھے، ہم سے تو کنارہ ہونہ سکا
جمال انگڑاٹیاں لینے لگا ہے ہمارا دل ہمارا اور کب تک!
بجز اس کے کیا ہیں یہ اشک اور آہیں وہ آنکھوں کا قصہ، یہ غم کی کہانی
دوش پر بکھری ہوئی زلف پریشاں دیکھیے پھر ہوئے میری پریشانی کے سامان دیکھیے

سنت

لیں کروٹیں وہ اشہب لیل دنہار نے فطرت چلی ہے رنگِ جہاں کو نکھارنے
اٹا نقاب رخ سے عروس بہار نے جلوہ دکھا دیا کسی رنگیں عذار نے
ہر شاخ، ہر شجر کی ادائیں بدل گئیں پلٹا وہ رخ فضلے، سو اینٹ ل گئیں
ہر پھول، ہر کلی میں لطافت کا جوش ہے ہر نخل گلستانِ جہاں سبز پوش ہے
صحنِ چین میں بادِ صبا میفرودش ہے غرقِ غمے نشاط ہے، جس کو بھی ہوس ہے
ہر سمت فیضِ ساقی محبوب عام ہے ہر چشم مست بادہ گلگوں کا جام ہے
صہبائے تنگ و بلیں ہے دوباہوا جہاں موجِ سوا میں کیفِ بے ناب ہے رواں
ایسی بارِ خلد میں رنگینیاں کہاں جو گلستانِ ہند کے پھولوں میں ہیں نہاں
ہر ذرہ آفتاب ہے اس سرزمین کا کیا حسن لا جواب ہے اس نازنین کا
دنیا نہیں یہ گلشنِ جنت ہے ہو بہو ہر سمت ہے تلاطمِ امواجِ رنگ و بو

ہر لب پستیوں کے ترانے ہیں چار سو گانے لگے بسنت جو انان خوش گلو
 بزم جہاں میں عیش و طرب کا ہجوم ہے
 دیکھو جدھر بسنت کے آنے کی دھوم ہے
 یہ دور ہے عجیب، سماں لا جواب ہے احباب میگسار میں شغل شراب ہے
 ہر جام میں تجلی صہاے ناب ہے ہر دل بقدر ذوق طلب فیضیاب ہے
 اتنی ملی ہے، جسے جتنی امنگ ہے
 اس حسن امتیاز پر ہر شخص نگ ہے
 ہے دیدنی جو رخ پہ چینوں کے نور ہے جس مایوس کو دیکھیے، وہ رشکٹ ہے
 متانہ انکھریوں میں وہ کیف و سرور ہے گویا تشے میں حسن کے، خود حسن پور ہے
 ہر ایک ناز میں سے بسنتی لباس میں
 مے جیسے زعفران کی بھری ہو گلا میں

جوان سندیلوی، منشی لال

۱۸۸۹ء میں سندیلہ (ضلع ہردوئی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گلاب رام شاہ تجارت پیشہ تھے منشی لال نے بمشکل آٹھویں درجے تک تعلیم پائی تھی کہ اس کے بعد اپنے والد کے شہرہ کے کاروبار میں ہاتھ مٹانے لگے۔ جب والد نے نقل مکان کر کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی، تو یہ بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ اس کے بعد نجی طور پر اردو اور فارسی میں کچھ مہارت پیدا کر لی تھی۔

انھوں نے ۱۹۰۵ء میں شعر کہنا شروع کیا شروع میں میر منصب علی مہر ندیلوی سے مشورہ کرتے رہے اور ان کے انتقال کے بعد انور حسین آرزو لکھنؤی (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ یہ تعلق محض حسن اتفاق سے پیدا ہو گیا۔ سندیلہ میں منشی فضل رسول واسطی سندیلوی کا سالانہ عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا اس کے ساتھ ایک مجلس مشاعرہ بھی منعقد ہوتی، جس میں شرکت کے لیے دور دور سے شعرا حضرات بلائے جاتے۔ ایک مشاعرے میں سید انور حسین آرزو بھی آئے۔ مشاعرے کے اختتام پر سید التفات رسول ہاشمی تعلقہ دار نے ان کا تلمذ اختیار کیا اور انھیں اپنے پاس روک لیا۔ اس کے بعد آرزو متواتر گیارہ برس تک ہاشمی صاحب کے دامن سے وابستہ رہے۔ سندیلہ میں ان کے قیام کے زمانے میں یہاں کے بہت اصحاب نے ان سے اصلاح لینا شروع کی۔ ان میں جوان بھی تھے۔ ۱۹۲۰ء میں سید التفات رسول ہاشمی کے انتقال کے بعد آرزو سندیلہ سے نکلے اور بعض فلاذوں کی دعوت پر مستقلاً کلکتہ میں مقیم ہو گئے۔ اس پر جوان نے بھی وہیں کی سکونت اختیار کر لی،

تاکہ استاد سے پورے طور پر استفادہ کر سکیں۔ کلکتے میں بھی انھوں نے تجارت ہی کو اپنی بسر اوقات کا ذریعہ بنایا۔ ۱۹۶۱ء میں کلکتے سے لکھنؤ واپس آئے۔ آرزو کی زبان و بیان اور عروض سے ماہرانہ واقفیت زبانِ اردو خاص و عام پر ان علوم میں بھی جوان اپنے استاد کے شاگردِ رشید ثابت ہوئے۔ چنانچہ بعد کو بہت شاگردوں نے ان سے بھی فیضان حاصل کیا۔

بروز جمعہ ۲۵ جنوری ۱۹۷۴ء کو شام کے چھ بجے اپنے مکان محلہ حسن گنج، لکھنؤ میں انتقال کیا۔

جوان کی شادی شاہجہانپور میں شریستی برج رانی سے ہوئی تھی جن کا ۱۱۳ پرل ۱۹۷۰ء کو بعارضہ فاجعہ لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ ان کے پانچ اولادیں ہوئیں، لیکن چار بچے ان کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے۔ ایک بیٹا شری آند بہاری لال گپتا اپنی جسمانی یادگار چھوڑا ہے، یہ یوپی حکومت کے محکمہ مالیات میں ملازم ہیں۔

کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں؛ کلیاتِ جوان حصہ اول عرف حسین چراغاں (۱۹۶۲ء)؛ کلیاتِ جوان حصہ دوم عرف شوخ غنچہ (۱۹۶۴ء)؛ کلیاتِ جوان حصہ سوم عرف چراغ قاف (۱۹۶۶ء)؛ سوز دل (دس نظمیں)؛ رباعیاتِ جوان؛ خوش رنگ پھول (غالب اور آرزو کے اشعار کی تضمین)؛ فریاد و جواب فریاد (بطور شکوہ و جواب شکوہ اذ اقبال) مع غزلیات؛ رام بن باس وغیرہ۔

انھوں نے پارہ مرثیے بھی کہے تھے۔ شہادتِ امام حسین علیہ السلام؛ دردِ حضرت عون و محمد؛ دردِ حضرت عباس علیہ السلام؛ دردِ حضرت علی اصغر۔ یہ بھی شائع ہو چکے ہیں۔

تفصیلِ زخافات اور آئینہ بحور (کلکتہ ۱۹۵۸ء) اپنے شاگردوں کے لیے نثر میں لکھی تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک مختصر چیز "حضرت آرزو کی اصلاحیں" (شاگردوں کے کلام پر) ہے۔ بعض چیزیں بچوں کے لیے بھی ہندی اور اردو میں شائع کی تھیں۔ آخری عمر میں مالی حالت کچھ کمزور ہو گئی، تو حکومتِ یوپی نے ان کا ۶۰ روپے ماہانہ

ادبی وظیفہ مقرر کر دیا تھا، جو موت تک ملتا رہا۔
 کلام نچتہ اور بے عیب ہے۔ چند شعر درج ذیل ہیں۔ ان کی ذات سے ایک خوش خلق،
 منکسر مزاج اور وضع دار شخص اٹھ گیا۔
 پروانہ بن کے کام کسی کے نہ آسکا۔ ماندر شمع رونق محفل نہیں ہوں میں
کلیںم و طور کا افسانہ سن کر بھی وہی دھن ہے

جوان! ہشیاد ہونے پر بھی نادانی نہیں جاتی
 ابھی تو، موسیٰ! غشی کا شکوہ، پلک جھپکنے ہی کا کلمہ ہے
 جواب کئی پردہ کسی نے اُٹا، تو یہ سمجھ لو کہ فیصلہ ہے

جنونِ عشق کی کار فرمائی نہاں ہے خندہ گل میں
 گریباں سے عیاں ہوتے گریباں ہم نے دیکھا ہے
 دیوانہ الفت کی، جواں! شان یہی ہے ہاتھوں میں ہے تپھر، تو ہو بہتا ہے سر سے
ادھر یہ فکر کہ محو جمال ہو کوئی ادھر یہ فکر، نگاہوں کا اعتبار رہے
 ہم بھی کسی کے ساتھ بدلتے رہے مزاج چلنا پڑا زمانے کی رفتار دیکھ کر
 باز دین جب سے زور رہائی کا آگیا آتی ہے شرم خود کو گرفتار دیکھ کر
 مرنا قبول، بات سے پھرنا نہیں قبول آگے بڑھیں گے ہم رسن دار دیکھ کر
 گر جا اپنی حد سے اس طرح، اے جذبہ الفت

بنائے جو ہمیں مجبور، خود مجبور ہو جائے
 اس طرح جنوں کی جانچ کرے، نہ بایہ نہیں فرزانے کو
 سچ تو سہی، کیا کرتے ہو، دیتے ہو چھری دیوانے کو
 گھٹا ہے، چمن ہے، بہا دیں ہیں پھر بھی جو ہم چلتے ہیں، وہ سامان نہیں ہے
 محبت کر کے انجام محبت پر نظر کیسی! یہ اب کیوں پوچھتا ہے، اے دل! کام کیا ہوگا؟
 خطا دنیا میں کی تھی، روزِ محشر تذکرہ کیوں ہے؟

کہاں کی بات پوچھی جا رہی ہے اب کہاں مجھ سے

قیس کوٹوی، نور محمد

کوٹہ (راجستھان) کے ایک غریب گھرانے میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ گھر کے حالات بہت ناتسلخی تھے۔ ان کے والد نے جب دیکھا کہ کوٹہ میں ذرائع بسر اوقات کی بہتری کا امکان نہیں، تو ہجرت کر کے موضع "بوڑادیت" چلے گئے، جو کوٹہ سے ۳۴ میل دور نسبتاً خوشحال جگہ ہے۔ یہی اپنے چاروں بچوں کے ساتھ کوٹہ ہی میں مقیم رہیں لیکن بد قسمتی گھات میں تھی۔ کوٹہ میں بیفہ دہائی صورت میں پھوٹ پڑا۔ اس میں قیس کی والدہ اور دو بھائی رحلت کر گئے۔ اس وقت قیس، شکل دس برس کے ہو گئے۔

اس حادثہ کی خبر بوڑادیت پہنچی، تو ان کے والد کوٹہ آئے اور بقیہ السیف خاندان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ یہاں قیس کو ایک مقامی سرکاری ہندی اسکول میں داخل کیا گیا، جہاں انھوں نے ہندی میں کچھ شہد حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ ہندی میں دوپے، چوپائیاں وغیرہ لکھنے لگے۔ اس زمانے میں وہ نور خالص کرتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے طور پر اردو پڑھنے کا کچھ انتظام کر لیا۔ اسی دوران میں شادی بھی ہو گئی۔

وہ ۳۰ برس کے تھے کہ بوڑادیت سے اپنے مسقط الراس کوٹہ واپس چلے آئے۔ لیکن اصلی مسئلہ روزگار کا تھا، یہ نہ بوڑادیت میں ملا، نہ کوٹہ میں۔

۱۹۳۲ء میں فضل حسین ثابت لکھنوی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ ثابت اہل زبان اور صاحب فن استاد تھے۔ انھوں نے ان کا تخلص نور بدل کر قیس کر دیا۔ قیس کو ان سے مشورہ کرنے سے بہت فائدہ ہوا۔ ان کی تعلیم ناقص تھی؛ اور شاعری علم فن

کے بغیر ناممکن ہے ثابت نے قیس کی یہ کمی پوری کرنے میں جو محنت کی، اس سے انکار ممکن نہیں۔ ۱۹۴۱ء میں ثابت کا انتقال ہو گیا، تو ۱۹۴۳ء میں قیس نے سیاب اکبر آبادی کا دامن تھاما اور ان کی وفات (جنوری ۱۹۵۱ء) تک انھیں سے وابستہ رہے۔ ان اساتذہ کی تربیت پھل لائی۔ ۲۸-۲۹ اپریل ۱۹۶۵ء کو مقامی ارباب اُردو نے کوٹہ میں شاندار پیمانے پر جشنِ قیس منایا، اُردو کے مشہور و معروف شاعرینِ سندھ آنند رائے ملتانے اس تقریب کی صدارت کی۔ اس موقع پر گیارہ سو روپے کی پھیلی بھی قیس کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔

بیرودگاری بدستور قائم رہی۔ اس پر راجستھان، اسیٹیہ اکادمی نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ بھی صرف دس برس ملا۔

آخری ایام میں کوٹہ سے ۲۰-۲۵ میل دور ایک مقام سیکت میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں بروزِ سبت ۲۶ جنوری ۱۹۷۲ء (دیکم ۱۳۹۲ھ) کو پیامِ مرگ آپہنچا۔ ان کے استاد بھائی مفتون کوڑی نے قطعہ تاریخِ وفات کہا:-

ہوا ہے دل کو بہت ہجرِ قیس کا صدمہ
مجھے جو یہ خبرِ مرگ پہرے ملاں ملی
”سہیدِ عشقِ خدا“، مخزنِ تواضع بھی
صفاتِ قیس سے تاریخِ انتقال ملی
(۱۳۹۲ھ) (۱۹۷۲ء)

خانگی زندگی بھی کچھ اطمینان بخش نہ تھی، بلکہ ایک مرتبہ انھوں نے اسے ”نہایت تلخ“ کہا تھا۔ اولاد میں تین بیٹے (محمد اسحاق، فہیم احمد فہمی، ریاض احمد ریاض) اور ایک بیٹی اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔

قیس خالصاً غزل کے شاعر تھے۔ اگرچہ انھوں نے کچھ نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ ان میں وہ کیفیت نہیں جو ان کی غزل کا حصہ ہے۔ افسوس کہ ان کا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ بعض رسائل میں جو کچھ ملا اس کا انتخاب پیش کر رہا ہوں :-
قیس! میری زندگی و موت سبھی، ہے اک سراب

جیتے جیتے، مرتے مرتے، ہی پریشاں ہو گیا

سجود و شوق میں دیر و حرم کے ہیں فسانے دو

زہے قسمت کہ میرا ایک سر ہے، آستانہ دو
فسانہ ختم ہوگا وعدہ فردا پہ کل ایسا
نیشمن میں کیا تھا کہ برقی عجبلی گوی، اور پھر آسماں تک نہ پہنچی
ختم ہے قیس اجنوں، وحشت و سودا چھوڑ کون پوچھگا مرے بعد بیاباؤں کو
دیکھنا، قیس بھی مجنوں نہ کہیں سو جائیں اس کے کوچے میں پھر کرتے ہیں دیوانے سے
جدھر جاتے ہو تم، اے قیس بس مجنوں سمجھتے ہیں

نذر اہل نظر کی قدر دانی دیکھتے جاؤ

سوز غم حیات سے انسا ملا
دل کیا ملا کہ محرم را ز بقا ملا
آغاز عشق بھی یہی، انجام عشق بھی یہی پہلے بھی انتظار تھا، اب بھی ہوں انتظار میں
آہیں سکتی کبھی پھر اس گلستاں میں بہار جو خزاں آنے سے پہلے ہی بیاباں ہو گیا
شمس دقیر میں ہو، تو کمرے سجده کاٹنا
خشدنگ جو ذرہ خاک بشر میں ہے
یہ بھی اظہار محبت کا ہے انداز عجیب
میں ادھر خاموش ہوں اور وہ ادھر خاموش
نقش قدم، نہ نقش جبین کا ہے اتنا باز
اب کیا بتاؤں، کون تری رگدڑ میں ہے
طور کے انوار اب بھی ہیں نگاہ حسن میں جس طرف دیکھا نظر بھر کر، چراغاں ہو گیا
نہ جانے کیا تھا مرے سجده جبین میں نہاں

ہو زدیچہ رہے ہیں وہ آستانے کو
لحد تک بعد مرنے کے پہنچا اپنے قدموں سے
یہاں بھی کاش میرے ساتھ محبت نارسا ہو
بکھرے جاتے ہیں جب آئینہ تصویر کے ٹکڑے
تو چن لیتا ہے گردوں، حُسن کی تنویر کے ٹکڑے
میں حیراں ہوں کہ کیجا کس طرح کروں سیرِ مقل

ادھر ہیں دل کے ٹکڑے، اور ادھر شمشیر کے ٹکڑے
یہ جن سے گردش ایام بنتی ہے، بگڑتی ہے
درخشاں ہیں فلک پر وہ مری تقدیر کے ٹکڑے

امجد نجمی، محمد امجد، شیخ

کنک کے ایک آسودہ حال خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد محمد یوسف صاحب کا اپنے زمانے کے عمائد میں شمار ہوتا تھا۔ پہلے وہ یکے بعد دیگرے اڑسیہ کی تین ریاستوں نیلگری، ڈھنکا مال، تالچر میں نائب دیوان کے عہدے پر فائز رہے۔ تالچر کے بعد ریاست پال کھر میں مقرر ہوئے تھے کہ ڈیڑھ ایک سال بعد فوج کا حملہ ہوا جس سے جسم کا بایاں حصہ بیکار ہو گیا، اور وہ کام کاج سے محروم ہو گئے۔ بارہ برس بسترِ علالت پر رہنے کے بعد ان کا ۱۹۲۴ء میں انتقال ہوا۔

محمد یوسف صاحب اڑیا کے علاوہ اردو فارسی اور انگریزی میں بھی اچھی استعداد کے مالک تھے۔ اردو میں شعر بھی کہتے اور یوسف تخلص کرتے تھے۔ وہ داغ اور اس کے طرزِ کلام کے عاشق تھے۔ مڑٹوں ان کا کلام "دامن گلچیں" اور "پیام یار" میں چھپتا رہا۔ مجموعہ بھی "نکبت یوسف" کے نام سے مرتب کر لیا تھا لیکن آخری ایام کی طویل علالت اور بیماری کے دوران میں یہ ضائع ہو گیا۔

جمنی انھیں محمد یوسف کے دوسرے بیٹے تھے۔ ان کے بڑے بھائی کا نام محمد احمد تھا۔ جمنی ۲۹ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو کنک میں اپنے آبائی مکان (محلہ بخش بازار) میں پیدا ہوئے، جو بعد کو ان کے والد کی علالت کے زمانے میں خالصے لگ گیا۔ جب سن شعور کو پہنچے، تو حسبِ معمول بڑے لاڈ چاؤ سے بسم اللہ ہوئی۔ پھر مدرسہ اسلامیہ میں گئے اور اس کے بعد مقامی مدرسہ کیتھولک مڈل اسکول میں داخلہ لے لیا۔

دسویں کے امتحان کے لیے پیاری موہن اکیڈمی، کنک میں داخل ہو گئے۔ اسی زمانے میں

طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی، اور لا زیادہ تر توجہ غزل پر مرکوز رہی اور اس میں اپنے محلے کی پلٹن مسجد کے پیش امام محمد حبیب اللہ تسنیم چپوڑی سے مشورہ کرنے لگے تیسرے میں تخلص امجد تھا، اب تسنیم کے کہنے پر اسے ترک کر کے نجی لکھ لیا۔ کوئی سال بھر بعد تسنیم نے پیش امامت چھوڑ دی اور تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا اور اسی سلسلے میں رنگون چلے گئے۔ نجی کو اقبال سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ بدریغ خط و کتابت ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیں۔ لیکن اقبال نے حسب معمول مال دیا اور لکھا کہ سب بہتر استاد اساتذہ کے کلام کا مطالعہ ہے، آپ بھی یہی کریں۔ اب نجی نے اپنا نام صیغہء راز میں لکھ کر اپنے والد سے اصلاح لینا شروع کی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں انھوں نے مولوی رحمت علی رحمت (والد کرامت علی کرامت، ف: ۱۹۶۳ء) سے بھی کچھ استفادہ کیا۔ بعد کو جب فارسی میں کہنے کا شوق ہوا، تو اس میں حافظ شمس الدین احمد منیری شمس (ف: ۱۹۷۵ء) سے مشورہ رہا، جو اس زمانے میں راونشا کاٹے، کٹک میں قانون کے مدرس تھے۔

ان کی تعلیم منورہ مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ترک موالات اور سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے بائیکاٹ اور ہڑتالوں کا دور شروع ہوا۔ یہ بھی اسی ریلے میں بہ گئے اور جلسوں میں اپنی اور دوسروں کی سیاسی نظمیں سناتے لگے۔ بکرے کی ماں کتب تک خیر مناتی، آخر گرفتار ہوئے اور جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ جب رہا ہوئے، تو ان کے والد نے انھیں اپنے چھوٹے بھائی شیخ محمد محمود شریف کے پاس رانچی بھیج دیا، جو وہاں کسی دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ اس کے علاوہ ان کی ایٹرنی کی دکان بھی تھی۔

۱۹۲۲ء میں رانچی سے واپس آئے، تو انھیں سنگم میں ریلوے کے محکمے میں ملازمت مل گئی۔ یہاں انھوں نے "نرم ادب" کی تشکیل کی اور اس کے اہتمام میں مشاعرے کرتے رہے۔ پھر لوکو موٹو دفتر، خروہ روڈ، جسنی تبادلہ ہو گیا، یہاں "ینگ مسلم کلب" قائم کی، اور ڈرامے پیش کرنے کی طرح ڈالی۔ اس زمانے میں آغا حشر کاکڑ طوطی بولتا تھا۔ چنانچہ پہلے انھوں نے حشر کے متعدد ڈرامے ایج کیے، ان میں اداکاری بھی کرتے اور کھیل میں

ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دیتے۔ پھر خود دراپے لکھنے لگے۔ انھوں نے چار ڈرامے لکھے، اور انھیں ایچ بی کیا تھا؛ "بد نصیب بادشاہ"، "کامیاب تلوار"، "کشور کانتا"، "انصاف کا کوڑا"۔ یہ سب سنوڈ غیر مطبوعہ ہیں۔

ریلوے کی ملازمت کے سلسلے میں ان کا قیام ۱۹۲۲ء میں گوجیٹا میں بھی رہا (اسے آج کل گوردی جھایا کہتے ہیں) اور ۱۹۲۶ء میں راج آٹھ گرٹھ میں ۱۹۳۸ء میں ان کا دفتر (لوکو موٹو) آندھرا نقل ہو گیا، ادویوں وہ والٹیر پہنچ گئے۔ یہاں بھی انھوں نے بعض احباب کے تعاون سے "نرم ادب" قائم کی، جس کا نام بعد کو بدل کر "اردو مجلس" ہو گیا (یہ آج تک قائم ہے) وہ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۴ء تک اس کے صدر رہے۔ اس مجلس کے زیر اہتمام باقاعدہ مشاعرے ہوا کیے، بلکہ انھوں نے کل ہند اردو کانفرنس بھی کی۔ والٹیر کے قیام کے دوران ہی میں انھیں فاسی میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا، افسانے بھی لکھے اور نثری مضمون بھی۔ ان کا والٹیر کے قیام کا زمانہ ان کی ادبی تربیت اور کیفیت دیکھتے، غرض ہر پہلو سے بہت اہم ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے نپشن پرسکدش ہوئے، نپشن قلیل تھی؛ اس لیے حکومت اڈیسہ نے انھیں ۵۰ روپے ماہانہ کا ادبی وظیفہ عطا کیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے ٹائپ اور اسٹینو گرافی سکھانے کا ایک اسکول جاری کیا، جس کا نام سٹی کمرشیل کالج رکھا تھا۔ اس سے بھی کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ تنگی نثری سے گزند بسر ہوتی تھی۔ لیکن اس صورت میں بھی قناعت اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی عزیز سے مدد لینا گوارا نہ کیا۔

جیسا کہ بیان ہوا ان کی تعلیم ناقص رہ گئی تھی۔ لیکن انھوں نے محنت اور مطالعے سے اس کمی کے پورا کرنے کی کوشش کی۔ بعض بزرگوں کی صحبت سے بھی مدد ملی۔ مشق و مزا دولت سے انھوں نے اتنی ترقی کر لی کہ بالآخر ان کا اردو کے قادر الکلام شاعروں میں شمار ہونے لگا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ اس دور میں اڈیسہ کے مسلم البشوت استاد تھے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں؛ طلوعِ سخن (کنک ۱۹۶۱ء) جو کہکشاں، کنک (۱۹۶۹ء) نظم و نثر کا بہت سرمایہ غیر مطبوعہ رہ گیا۔ وہ دونوں کنک کے دوہائی شاخدا

کے مدیر بھی رہے جسے انھوں نے ۱۹۶۵ء میں جاری کیا تھا۔ انھیں ۱۹۷۱ء سے ضیق النفس کی شکایت تھی؛ یہ بڑی گھلا دینے والی بیماری ہے۔ اس سے بہت نحیف و نزار ہو گئے تھے۔ ۲۱ جنوری ۱۹۷۱ء کی شب میں ایک مشاعرے سے واپس آتے ہوئے سردی لگ گئی۔ جاڑوں کا زمانہ، دمہ کے مریض اور اس پر انفلوئنزا اور دردمر۔ اسی میں بروز جمعہ یکم فروری ۱۹۷۲ء دن کے ٹھیک ایک بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔ جمعہ کی نماز شروع ہونے سے پہلے خطیب حاضرین سے ان کی صحت کے لیے درخواست کی تھی۔ اتنے میں یہ اپنے اللہ کے حضور حاضر ہو گئے، تو نماز کے بعد ان کی مغفرت کی دعا کے لیے کہا گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ جمعہ کی فیضیت سے فیضیاب ہونے کے لیے فوری تجہیز و تکفین کا انتظام کیا گیا، ان کے سب احباب کو اطلاع بھی نہیں دی جاسکی۔ اس کے باوجود خانہ کے ساتھ بہت بڑا مجمع تھا۔ قدم رسول (درگاہ بازار) کنگ میں قبل مغرب دفن ہوئے۔

ان کے کئی احباب نے تاریخ وفات کہی۔ انیس امام کے قطعے کا آخری شعر ہے۔

نہیں کیا کہوں تاریخ پردہ داری دوست
"بڑا ستم ہے حجابِ دل و نطسہ ہونا"
(۱۹۷۳)

فیاض گو ایادی کہتے ہیں:

ہے دعاے مغفرت فیاض! تاریخ وفات
"امجد بھی ہو جہز و شاخارِ خلد کہ"

علامہ جمیل منطہری کا قطعہ ہے:

نحیٰ صنوفِ شاہ! اختر مطلع کدک
جن سے افق تھا تاناک کل ز شمال تا جنوب
کہتی ہے اس کی موت پر تیرگی دیا ر فن
کہیے کہ "آہ آہ آج بچم وطن ہو اغوہ"
(۱۳۹۴)

ان کی شادی اپنے منجھے حاکم شیخ محمد یعقوب کی صاحبزادی (ذریب النساء) سے ہوئی تھی اور ان میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ دو چھوٹے بیٹے (محمد رفیع اور محمد وسیع) ان کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ سب سے بڑے محمد رفیع اور چاروں لڑکیاں (نخبہ، ذہبت، سعیدہ، شامہ) ماشاء اللہ حیات میں۔

نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

پلے، اس ہوش کی جلوہ گسری کل رات کو
اس کے سن صنو فلک پر اتنی نازاں تھی زیں
پلے، وہ لہو سے تر شاہو اس کا بدن
اس کی آنکھوں میں وہ جادو، اس کے لب پر وہ
تاکتے تھے گلستاں سے لالہ و سرو دامن
تھالہ زامہ پر نشو و ورد اسٹم الصمد
محفل انجم میں ڈھلتی تھی شراب رنگ و نوا
اس کے نیلے بسم پر وہ چودھویں کا چاند
کلیہ احزاں مرا، تھا غیرت بزم طرب
ہو رہی تھی نور کی بادش درود دیوار پر
پلے نازک پرچہ میں سجده ریزیاں کچھ طرح
جذب یوں، پس میں مل کر ہو گئے تھے سن عشق
رات گئی تھی اس کی گردش، ختم گئی تھی اس کی
صاف میں نے کر دیا انکار لینے سے اسے

عمر بھر وہ کے یاد آئیگی، اے نجمی! مجھے

میری قسمت نے جو کی تھی یاد دہی کل رات کو

آؤ کیوں بیکار بیٹھیں کام کی باتیں کریں
یہ اگر سچ ہو کہ ذکر العیش نصف العیش ہے
کچھ گزشتہ راحت و آرام کی باتیں کریں
آؤ، پھر گزشتہ ایام کی باتیں کریں

ابتداءے عشق کی وہ سلسلہ جنبانیاں
 اک ذرا افسانہ زلفِ مسلسل چھڑ کر
 وہ کسی کے وعدہ جاں بخش پر بیچتیاں
 وہ دفور اشتیاق دید، وہ ذوقِ نظر
 یاد تو کر لیں ذرا آئینہِ قفس کی راحیں
 دمے رنگیں، وہ بزمِ کیف، وہ سرشاریاں
 جذبہ شوقِ شہادت کی سنائیں سرگزشت
 اجرا کچھ کہے اپنے عشق کے آغاز کا
 کس طرح ہم نے جلای تھی یہاں شمعِ امید
 آؤ، پھر اس نامہ و پیغام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر قیدِ دلِ ناکام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر اس انتظارِ شام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر ان جلوہ ہائے بام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر رنگِ فریبِ دام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر اس ساقیِ گلخام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر اس تیغِ خونِ آشام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر اس عشق کے انجام کی باتیں کریں
 آؤ، پھر اس آرزوئے خام کی باتیں کریں

یہ جہاں فانی ہے، سخی باہے یہاں کس کو ثبات

آؤ، کچھ اپنے نمودِ دام کی باتیں کریں

جب دل ہی نہیں ہے پہلو میں، پھر عشق کا سودا کون کرے

اب ان سے محبت کون کرے، اب ان کی تمنا کون کرے

اب ہجر کے صدمے سہنے کو، پتھر کا کلیجا کون کرے

ان لمبی لمبی راتوں کو مر مر کے سویرا کون کرے

ہم رسمِ وفا کو مانتے ہیں، آدابِ محبت جانتے ہیں

ہم بات کی تہ پہچانتے ہیں، پھر آپ کو رسوا کون کرے

اے جذبہ الفت! تو ہی بتا، کچھ حد بھی ہے اس ناکامی کی

ایوش نگاہوں سے ان کا محفل میں نظارا کون کرے

ہم دیکھ چکے، ہاں دیکھ چکے، دستورِ تھاری محفل کا

جب شکر پہ یہ پابندی ہے، پھر جراتِ سکھ کون

سمجھ رہا ہے تو بندوں کو بربہاں مبعوث
 تو کیوں نہ لطفِ خالی ہو بیرِ لطفِ معبود

ہیں تیرے واسطے یہ شش جہاتِ جلوہ کف
 ہے تیرے واسطے فطرت بھی گرمِ رقصِ سرود

تو کہ رہا ہے یہاں کہ جس کو حبتِ لاصل
دہی دکھا گئی انساں کو راہِ حریفِ کبود
بلند ہوتی گئی جس قدر نگاہِ بشر
تتاوے اور کبھی ہوتے گئے غرقِ آلود
ہے تیرے سینے میں پوشیدہ مونیخِ طوفانِ خیز
مگر تو سمجھا ہے اپنے کو قطرہ ہے بود
یہ زندگی کی کشاکش، یہ سوز و سازِ جاتا
جو یہ نہیں، تو سرا سرِ عدم ہے تیرا وجود
تو اس کو پھونک دے، بن کر عمل کی چکاکی
کہ تیرے آگے یہ دنیا ہے تودہ بارود
کمی نہیں ہے جہاں میں آتشا سوں کی
سمجھ نہ اپنے کو ہرگز ایازِ بے محمود
یہاں تو، تو ہی سلیم و خلیل بن نہ سکا
وگر نہ ہے کوئی فرعون، تو کوئی نمرود
”ہم از دست“ سمجھ اس کو، ”نہی ایائیم دست“

سو خدا کے یہاں، جو ہے وہ ہے لاموجود

بھکتا ہی نہ تھا پھر ایسا جھکا، نام اٹھنے کا لیتا ہی نہیں
معلوم نہیں اس سرنے کیا اس سنگِ در میں دیکھ لیا
انتفاتِ اولیں کی بات ہی کچھ اور ہے
بھگتِ نکران کی بزم میں اب درِ جام آیا تو کیا

کیوں یہ کہتے ہو، کوئی چاہنے والا ہی نہیں

چاہنے والوں کو تم نے ابھی دیکھا ہی نہیں
بجائے فرطِ جنوں نے ہمیں کیا رسوا
جمالِ یار میں آخر یہ لکھی کیا ہے
گریز کیا میں کروں، ناصحوں کی صحبت سے
جہاں نہ کچھ ہو، صحبتِ ہاں بری کیا ہے

عزیز جھالا واڈی، محمد عزیز الرحمن قریشی

ان کا خاندان ریاست جھالا داڑ کے باعزت ملازموں میں شمار ہوتا رہا ہے۔ ان کے دادا نشی علی بہادر منصرم کو کھٹی دکان خانہ جات تھے۔ ان کے بعد عزیز کے والد نشی عبداللطیف بھی کادخانہ جات کے منصرم رہے۔ عزیز یہیں جھالا داڑ میں بسنت پنچھی کے دن حجرات ۱۹ فروری ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے۔

خاندان میں تمام سہولتیں میسر تھیں، لہذا تعلیم مناسب طریقے پر گھر ہی پر ہوئی، اور اس کی تکمیل کے بعد یہ بھی ریاست کی ملازمت میں لے لیے گئے۔ ترقی کرتے کرتے بالآخر وہ بھی منصرم کے درجے تک پہنچے، جو انگریزی علاقے کے مکشز کے مساوی رہا ہوگا۔ عزیز نے جھالا داڑ کے چار حکمرانوں کا عہد حکومت دیکھا: (۱) راج رانا ظالم سنگھ، ان کے زمانے میں ان کا شباب تھا۔ (۲) ہمارا نا بھوانی سنگھ؛ (۳) ہمارا راجندر سنگھ۔ ان دونوں حکمرانوں کے زمانے میں عزیز مقرب خاص رہے۔ (۴) راج رانا ہریش سنگھ یہاں کے آخری رئیس تھے۔ جب راجستھان کی ریاستیں جمہوریہ ہند میں ضم ہو گئیں، تو ابتدائی زمانے میں رانا ہریش چندر راجستھان میں وزیر بھی رہے تھے۔ ہمارا نا بھوانی سنگھ خود صاحب علم اور قدردان علم و ادب تھے۔ ان کا انتقال ۱۳ اپریل ۱۹۲۹ء کو جہاز پر ہوا جب وہ علاج کے لیے لندن جا رہے تھے۔ لاش عدن میں سپرد خاک ہوئی، اور پھول جھالا داڑ آئے، جہاں بقیہ رسوم ادا ہوئیں۔ ان کے زمانے میں ادبی اور ثقافتی قسم کی تمام سرگرمیوں کا اہتمام عزیز کے ذمے ہوتا تھا۔ عزیز

کے کلام میں جو متعدد نظمیں ساگرہ کی مبارکباد، ہولی، جشنِ غسلِ صحت وغیرہ کے عنوان سے ملتی ہیں، وہ انھوں نے اسی عہد میں کہی تھیں۔

ہمارا نا بھوانی سنگھ نے بھوانی ناٹھ شالہ، ایک ادارہ قائم کیا تھا، جہاں ڈرامے اور ناولک اور اسی طرح کی دوسری تفریحی اور کچھ ل تقاریب منعقد ہوتی تھیں۔ اس ادارے کے ہتتم بھی عزیز ہی تھے۔ ان تقریبوں میں داخلہ بہت محدود ہوتا تھا۔ ان کے جانشین ہمارا نا راجندر سنگھ کے تودہ مصاحب خاص اور ہر وقت کے ندیم حاضر باش تھے۔ ہمارا نا راجندر سنگھ شعر بھی کہتے؛ اور مخمور تخلص کرتے تھے۔ عزیز جب چھلکے پر آتے تھے، تو ان دونوں حکمرانوں کے عہد کے قصے بیان کرتے اور ان کی علم پروری اور ادب نوازی کے واقعات سنایا کرتے تھے؛ وہ ان دونوں کے ہمیشہ مداح رہے۔

عزیز کے مکتبی زمانے کے ایک استاد قاضی قطب الدین تھے۔ وہ کبھی کبھی نعت کہتے تھے۔ انھیں کی دیکھا دیکھی عزیز کو بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ وہ شعر کہنے لگے۔ لیکن قاضی صاحب موصوف سے کبھی اس کا ذکر نہیں آیا۔ سب سے پہلے انھوں نے حکیم عبدالصمد شوق سے اصلاح لی اور انھیں کے کہنے پر مشاعرے میں اپنا کلام سنایا۔ یہ سلسلہ کافی دن تک رہا۔ بعد کو عزیز درباری شاعر جناب فتخار الشیرامولوی عبدالوحید نیرنگ کا کوری کے شاگرد ہو گئے۔ یہ تلمذ انھوں نے ہمارا نا بھوانی سنگھ کے ایما پر اختیار کیا تھا۔ نیرنگ خود شعی عبدالمجید سحر (ابن غلام ساحر علوی) کے بیٹے اور مشہور لغت گو مولوی محمد حسن کا کوری (ف: اپریل ۱۹۰۵ء) کے شاگرد تھے۔ نیرنگ ۲۷ ستمبر ۱۸۵۷ء کو کوری میں پیدا ہوئے تھے۔ راجستھان میں اردو کے فروغ میں ان کی خدمات بہت قابلِ قدر ہیں۔ بہت ذہین اور طبائع آدمی تھے۔ تلامذہ کی کثیر تعداد نے ان سے کسبِ فن کیا۔

عزیز قدیم وضع کے بہت پختہ سخن گو تھے۔ ان کا کوئی مجموعہ حینِ حیات شائع نہیں ہوا۔ دودیاں غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ ایک میں غزلیات ہیں؛ دوسرے میں رباعیات قطعاً

نظیں وغیرہ۔

عزیز بہت وضع دار اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ مثلاً گھر سے کبھی شروانی کے بغیر باہر نہیں نکلے۔ پان کی ڈبیہ اور بوہ ہمیشہ ساتھ رہتا۔ آخر تک پرانی وضع کا قلمدان استعمال کیا اور نیرے کے قلم سے لکھتے رہے۔ وہاں نواز اور سیر چشم آدمی تھے۔ لیکن بہت محتاط زندگی بسر کی، ہمیشہ اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب رکھتے۔ باغبانی کا شوق تھا۔ جھالا دار سے باہر سات آٹھ میل دور سکیٹ کے مقام پر ان کا باغیچہ آج بھی موجود ہے۔ اپنے شہر کے مکان میں بھی ایک پھل واری لگا رکھی تھی۔

ان کا بدھ ۶ فروری ۱۹۷۴ء (۱۲ محرم ۱۳۹۴ھ) کو انتقال ہوا۔ ۸۹ برس کی عمر پائی۔ بیوی سے والہانہ محبت تھی۔ ان کا پانچ چھ سال قبل انتقال ہو گیا، تو وہ بچہ سے لگے، اس کے بعد عزیز نے متعدد نظموں میں ان سے اپنی شیفتگی اور جدائی پر رنج و غم کا اظہار کیا۔ دولہ کے (ڈاکٹر محفوظ الرحمن اور محبوب الرحمان) اور دولہ کیایاں یادگار چھوڑ دیں۔ سب ماشاء اللہ اپنے اپنے گھر بار والے، بلکہ بیٹوں، پوتوں والے اور خوش و خرم ہیں۔

مفتون کوئی نے تاریخ وفات کہی:

کرمگی زیر و زبر بزم خیال	اطلاع ادنیٰ الہی پیر ملال
وہ عزیز خوشنوا رخصت ہوا	تھے جو بزم دوستاں میں خوش مقام
جنت الفردوس ان کو ہونصیب	معرفت فرمائے رب ذوالجلال
ہے یہ مفتوں! ان کی تاریخ وفات	”قرب صحباں“ پاکیا زنگیں خیال

(۴۲۳ + ۹۷۱ : ۱۳۹۴)

افسوس کہ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ رسائل میں بھی زیادہ نہیں ملتا۔ چونکہ انھیں اپنی دوباری مصروفیتوں سے اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ اسے چھپنے کے لیے بھیجتے۔ چند شعر بعض رسائل سے لیے گئے ہیں جو ہدیہ ناظرین ہیں:

تری نظر سے نظر مل گئی ہے کیا میری بلا ہی ہے اشارے سے اب قضا میری

عزیز! عمر و روزہ کئے نہ راحت سے تو پھر بقا میں ہے یہ بھی کوئی بقا میرا!

ہاں کا جس طرح سے کرے میزبان لحاظ ہے لطف اسی طرح سے کرے میہاں لحاظ

بگو لوں سے تھی دشتِ بخت میں امید مجنوں کی کہ اب لیلیٰ کا چہرہ پردہ محفل سے نکلیگا
ہیں وہ لطفِ بزمِ یادِ حاصل ہو کہ جیتے جی نہ محفلِ دل سے نکلیگی نہ دل محفل سے نکلیگا

ساتھ لایا نہ کہ وغیرہ کو تم محفل میں در نہ اک روز یہ جھگڑا سرِ محفل ہوگا

تری تصویر مری آنکھوں میں ہر دم پھرتی کچھ عجب لطف تر ادر و جدائی دیتا

دل میں رہ رہ کے یادِ مرثا گاہ ہے بتلا ہم ہیں دردِ پیہم میں

جب قلزمِ الفت اُٹھ آیا شبِ معراج
محبوب کو خالق نے بلا یا شبِ معراج
قدسی یہی کہتے تھے، عجب شانِ خدا ہے
یہ کس کا قدمِ عرش پہ آیا شبِ معراج

مسدس کا ایک بند:

حضرت یوسف و یعقوب و مسیح . مریم
خضر و الیاس تھے خوش ، خواہ ، آدم
ہود و ایوب تھے ، موسیٰ بھی تھے شاد و خرم
لوط و ابراہیم خوشی سے تھے بغلیں ہم
انبا سب ہی کہتے تھے خوشی سے پیہم
عرش پر آئینے محبوبِ خدا آنج کی دشا

ہجور شمس، سید عبدالقیوم

ضلع ردتاس (دہراد) کے تاریخی شہر سہرام کے رہنے والے تھے جسے شیر شاہ سوری کا مسقط الرأس ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ملازمت کی انصاف کے مطابق وہیں ۱۸ اپریل ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد "مولوی" محمد ادریس (ف: ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء) ریلوے پولیس میں داد و غتہ تھے۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ خانقاہ کبیرہ، سہرام میں ہوئی؛ ثانوی مدرسہ حنفیہ، آگرہ میں اور اعلیٰ کی تکمیل مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں کی۔ یہ مدرسہ شمس الہدیٰ کا تعلق ہی تھا جس کے باعث بعد کو شعر گوئی کے زمانے میں انھوں نے اپنے تخلص "ہجور" کے ساتھ شمس کا اضافہ کیا؛ بلکہ بعض غزلوں میں تو انھوں نے "شمس" بطور تخلص بھی استعمال کیا ہے۔

آخر میں پٹنہ یونیورسٹی سے صرف ادرہ کے مضمون میں امتحان دے کر بی اے کی سند حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد مدرسہ شمس کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۸ء تک ضلع اسکول، گیا میں فارسی اور اردو پڑھاتے رہے۔ اوائل ۱۹۴۸ء میں پلاٹو ضلع اسکول، ڈالٹن گنج میں تبادلہ ہو گیا؛ بقیہ ملازمت کا سارا زمانہ یہیں گزرا، اور یہیں سے اوائل ۱۹۴۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد مشکل سے ہمدینہ بھر گزرا ہو گا کہ جمعہ ۸ فروری ۱۹۴۴ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ فشار دم کا عارضہ پرانا تھا، لیکن موت حرکت قلب بند ہوجانے سے ہوئی قیمت

کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اسی دن پلامون نٹ رائج کینڈران کے اعزاز میں "شبِ غزل" منانے والا تھا کہ بعد نماز جمعہ تین بجے سہ پہر کو اچانک قلب کا دورہ پڑا اور آناً فاناً جان بحق ہو گئے۔ "اجتنِ غزل" مجلسِ عزائم میں تبدیل ہو گیا۔ وہ ہزاروں باغِ اسکول کے نگران مقرر ہوئے تھے۔ سامانِ بندھ چکا تھا، اور دو تین دن بعد روانگی طے تھی کہ سفرِ آخرت پیش آگیا۔ فاعبتروایا اولیٰ البصار۔ ڈالٹن گینج کے قبرستان میں آخری آدا مگاہ نصیب ہوئی۔ ان کے شاگرد مجیب نشتر نے تمارتخ کہی:

حضرت ہجور رخصت ہو گئے مردِ کامل، صاحبِ فن، نغز گو
لوحِ دل پر کیوں نہ پھر برتھیں گے "شاعرِ شیریں سخن کا نام ہو"

(۱۹۷۴ء)

بہت کم عمری میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ کلام پر مختلف اوقات میں سیما ب اکبر آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) ساغر نظامی (ولادت: دسمبر ۱۹۰۵ء) اور آرزو کھنوی (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) سے مشورہ کرتے رہے۔ اگرچہ دوسری اصناف میں بھی کلام موجود ہے، لیکن دراصل غزل کے شاعر تھے، اور وہ بھی ردائی رنگ کے خوش گلو ہونے کے باعث مشاعروں میں بہت مقبول تھے۔ ان کی زندگی سی میں ان کے شاگردوں نے "بزمِ ہجور" کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی۔ یہ آج بھی حتی المقدور اردو کی خدمت کو رہی ہے۔ اس کی طرف سے ان کے شاگردوں کا تذکرہ "نقوشِ ہجور" (پٹنہ ۱۹۷۵ء) بھی چھپ چکا ہے۔

دو مجموعے: پردہ ساز (ڈالٹن گینج ۱۹۶۶ء) اور نوائے راز (گیا ۱۹۷۳ء) ان کی زندگی میں شائع ہوئے تھے۔ دو اور مجموعے (گلِ انجم و کلامِ ہجور) بھی مرتب تھے لیکن شائع نہیں ہوئے۔

اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی شادی سہسرم میں ہوئی۔ ان سے دو بیٹے ہوئے: ایک رفد کا محمد مخدوم اور بیٹی نہت جہاں۔ دونوں بچے فوت ہو گئے اور بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ دوسری بیوی سے دو بیٹیاں زندہ ہیں۔

چختہ کلام ہے بضمون آفرینی کی کوشش ہر ایک شعر سے ظاہر ہے۔ اگرچہ وہ کلاسیکی انداز کے سخنور ہیں، لیکن انھوں نے جدید رنگ سے اجتناب کیا؛ قدیم ہیئت کو قائم رکھتے ہوئے عصر حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی سعی کرتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

ہر جہد دیکھتا ہوں، یہاں بام و در نہیں آگے چلے جنوں ہر اصغر ابھی گھر نہیں
خون دل، خون جگر، خون نظر، سب رہ گئے ہر سبک روا، آگے، میر کا رواں بنتا گیا
ہر آتاں سے پہنچنے لگے جہیں کو پیام چل گیا مرے سجدوں میں کس کا نام ابھی
یہ کیا جشن رہائی ہے، کیسی آزادی جہان فکر و نظر ہیں کہ ہیں غلام ابھی
یہ کیا خبر تھی کہ دست و حشمت لباسِ مستی پہ جا پڑیکا

کچھ ایسے عالم میں ہوں کہ اکثر خیال آتا ہے پر سن کا
کچھ غم نہیں نہجور! کہ اپنا نہیں کوئی معلوم ہے سیکس کا بہر حال خدا سے
دہو جو عشق، تو ذرے میں آدمی ات چلے جو ہو، تو وسعت کو نہیں میں سامنے کے

پھیلا ہی تری جفا کا قعدہ بات آہی گئی مری و فدا کی

کہنے کو ہے ابتداء الفت اس میں بھی تڑپ ہے انتہا کی

ہجور! ددا کا نام نکلا اللہ نے زندگی عطا کی

صبح نہ آیا، شام نہ آیا آج بھی کچھ پیغام نہ آیا

محبت آغازِ محبت پیشِ نظر انجام نہ آیا

سکوت، آغازِ جستجو کا؛ سکوت انجامِ گفتگو کا

حدودِ آدابِ بندگی میں سکوت اک ہے کہ حکمران ہے

نہ وہ رشکِ طلعت جو رہے، نہ جوابِ بلوہ طور ہے

مگر ایک بات ضرور ہے، کوئی بات اُس میں ضرور ہے

یہ خار بھی ہیں متاعِ بہارِ گل ہی نہیں نگاہِ چاہیے اسرارِ گلستاں کے لیے

جھکا جھکا کے اسے اور پایاں نہ کر جہیں کو وقف بھی کر ایک آتاں کے لیے

رہبرِ دانِ رہِ تسلیم کی منزل ہے وہی — آپ کے گھر سے چلے، آپ کے گھر تک پہنچے
اب شکایتیں بیجا، گردشِ مسئل کی — اس زمین پر جو دہم نے آسمان بنائے ہیں
ترے رخ پہ رنگ چھڑ کا مرنے خونِ آرزو سے

مرے شانہ جنوں نے تیری زلف کو سنوارا
مہرِ آستانہ ہو، تو بندگی بھی ہو نہیں سکتی — خدائی کرنے والے کر گئے، اہل بہرہ ہو کر
عہد کے سیسوں نے، وقت کے طلیسوں سے — زندگی کے ماروں کو موت کی دوا دی ہے
سوچ سمجھ کر، سیرِ چین کر — بھول لگا دیتے ہیں نشیتر
پھر لیتا ہے ہاتھ میں ساغر! — بھول گیا، مارِ رخ کا پتھر؟
آپ کی ہر دم میں مستی و نغمہ ہی نہیں — وہ بھی ہیں، جو دہسنِ ددار سے ہو گزرتے ہیں
خوش نصیبانِ کرم تھے کہ ملی جاے پناہ — ہم بھی اک سایہ دیا ارے ہو گزرتے ہیں
ترے سکوت سے زندہ ہے حسنِ رمزِ کلام — وہ سادہ دل ہیں کہ مرتے ہیں گفتگو کے لیے
اہلِ دل سے زندہ ہے، رہمِ ناصیہ سالی — درد کیا تعلق ہے ہمارے کو آستانے سے!
شرابِ دانشِ حاضر کی مسرتی، ارے تو یہ! — نظر تک روشنی پہنچی، دلوں تک ترگی آئی
کچھ تو اہلِ وحشت کا حوصلہ بڑھانا تھا — تم کو اک تبسم سے تیہوں حجابِ آستانے

انور، منوہر سہائے، ڈاکٹر

داغ کے مشہور شاگردوں میں "پروفیسر" نراین پرشاد ہر گوبیادی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ وہ قوم کے سکینہ کا لستہ تھے، قومی لقب "دروما" تھا۔ کسی زمانے میں یہاں دلی کے مضافات (اور شاہد راف کے نواح) میں ایک مختصر گاؤں سٹھولی نام تھا، ان کا خاندان وہیں کا رہنے والا تھا، اسی لیے یہ لوگ "سٹھولے" کہلاتے تھے۔

خاندان مغلیہ کے عروج کے زمانے میں ان کے بزرگ شاہی ملازم تھے۔ چنانچہ ان کے مورثی رائے پرانگ داس اکبر کے عہد میں دیوان بیوتات کے عہدے پر فائز تھے۔ محمد شاہ کے عہد تک ملازمت کا یہ سلسلہ قائم رہا۔ جب سلطنت مغلیہ پر زوال آیا، تو اس خاندان کا شیرازہ بھی بکھرا اور یہ لوگ تلاشِ معاش میں یوپی کے مختلف شہروں میں منتشر ہو گئے۔ کچھ جا کے سہوان (ضلع بدایون) اور اکبر آباد میں بس گئے، کچھ سرکاراودھ اور حکومت انگریزی کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ ہر کے والد نشی کنھیا لال بھی فکر روزگار میں سرگرداں تھے۔ ان کے خرنشی چھپ لال بدایونی، اس وقت بدایوں کی کلکری میں ملازم تھے۔ غدر کی افراق فری شروع ہوئی، تو وہ اپنے فرزند پندت ہر ناتھ، نائب دیوان ریاست گوایار کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بعد کو ان کی وساطت سے وہاں قسنت مالوہ میں نائب صوبہ کے عہدے پر متمکن ہو گئے۔ نشی چھپ لال کے پائونجیم گئے، تو انھوں نے اپنے داماد رنشی کنھیا لال کو بھی اپنے پاس بلایا، اور اپنے اثر سے انھیں ریاست گوایار کے ضلع سبل گڑھ (موجودہ مدھیہ پردیش) کی تحصیلداری دلوادی۔ اس کے بعد خاندان نے

یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ چنانچہ نرائن پرشاد ۱۸۶۸ء میں سبل گڑھ میں پیدا ہوئے۔

اپنے خاندان کی روایت کے مطابق ہر کی تعلیم بھی فارسی اور عربی سے شروع ہوئی۔ پھر الہ آباد یونیورسٹی کے تحت بریلی کالج سے دسویں درجہ کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ بدقسمتی سے درو شقیقہ کے مستقل عارضے کے باعث آگے تعلیم جاری رکھنے سے معذور رہے۔ لہذا انگریزی ہڈل اسکول، گوالیار (پرائی آبادی) میں مدرسہ اختیار کر لی مختلف جگہوں پر ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۱۱ء۔ ۱۹۱۲ء میں عارضی طور پر کمشنر دفتر مردم شماری، گوالیار کے نجی تعادون (پرنسپل اسٹنٹ) مقرر ہو گئے یہاں کی خدمات کے جلد میں کچھ انعام بھی ملا تھا۔ اس دفتر سے فارغ ہوئے، تو ریاست کے سب سے مقدر اسکول، دکنڈریہ کالج ہائی اسکول میں ادنیٰ درجوں کے پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ اس اسکول میں ۱۹۳۵ء تک رہے۔ اس اثنا میں عارضی طور پر غالباً ۱۹۳۴ء میں پروفیسر احسن خان ثاقب کے انتقال پر انھیں دکنڈریہ کالج، گوالیار میں انسٹرادر بی، اے کے درجوں کو فارسی پڑھانے کا موقع ملا تھا۔ اسی باعث ان کے نام کے ساتھ "پروفیسر" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ وہ بالآخر ۱۹۳۵ء میں محکمہ تعلیم کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد زیادہ وقت مذہبی مطالعے میں گزارا۔

مہر کو شاعری کا شوق ۱۶-۱۷ برس کی عمر میں ہوا۔ ضیا امروہوی کی وساطت سے داغ کی شاگردی اختیار کی، جوان دنوں راجپور میں مقیم تھے۔ مہر کا دیوان (شعاع مہر) ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا۔ (مطبع محمدی، بمبئی: ۱۹۳۷ء) اس کے علاوہ بعض اور کتب بھی موجود ہیں! (ارنہایان ہند۔ یہ انگریزی کتاب (Prophets of India) کا ترجمہ ہے۔ اسے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا؛ (۲) سفید جوگن: معاشرتی ناول ہے؛ (۳) انثر شریا! یہ چھ مضامین کا مجموعہ ہے؛ (۴) دہر مضمون نگاری: درسی کتاب ہے انھوں نے ایک کتاب "محاورات مہر" بھی مرتب کی تھی۔ اس میں اردو کے محاورات و ردیف دار جمع کر کے ان پر بحث کی تھی۔ یہ ان کی زندگی میں نہیں چھپ سکی تھی۔ نہ جانے، اس کا سکہ

کیا ہوا!۔

ہرے ۲۶ جولائی ۱۹۴۳ء کو بوقت صبح اچانک عارضہ قلب سے انتقال کیا۔ ان کے استاد بھائی نوح نادوی نے تاریخ لکھی:

نوح کے دل سے یہ نکلا سال فوت
لکھ: "غروب ہر زریں بارگاہ"

(۱۹۴۹ء - ۶ = ۱۹۴۳ء)

داغ ہی کے ایک دوسرے شاگرد حب لال رعد کی تاریخ تھی:

شاعر خوش فکر دنیا سے گیا (۱۹۴۳ء)

منوہر سہاے انور انھیں نرائن پرشاد ہر کے خلف رشید تھے۔ یہ قبل گوردھری میں یکم جنوری ۱۹۰۱ء بوقت صبح پیدا ہوئے۔ ان سے دو بڑے بھائی پہلے سے موجود تھے۔ اول رام مرز عرف رام دریا (۱۸۹۵ء - ۱۹۷۰ء)؛ یہ نوح میں کپتان کے عہدے تک پہنچے شرمکاد کے دلدادہ اور ماہر نشانہ باز تھے۔ ان کی عمر زیادہ حصہ اگرے میں بسر ہوا۔ دوسرے بھائی ان سرورپ، (۱۸۹۸ء - ۱۹۷۱ء) کھنڈ میں رہتے تھے۔ موسیقی سے بدرجہ غایت شغف تھا۔ ۱۹۲۶ء میں کھنڈ میں بڑے پیمانے پر ایک موسیقی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے ایک بصیرت افروز مقالہ پڑھا تھا۔

منوہر سہاے کا اصلی نام بھی گووند سرورپ تھا، جسے بعد کونا خیاں والوں نے تبدیل کر کے منوہر سہاے کر دیا۔ یہ شکل سات ماہ کے ہونگے کہ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی پرورش اور تربیت ناخیاں میں ہوئی۔ یہ خاندان بھی علم و فضل اور جاہ و مرتبہ میں ممتاز تھا۔ یہ لوگ ریاست ٹونک کے جاگیردار تھے۔ ان کے پڑنا دادوں نرنجن سہاے شائق (ف: ۷-۱۹۰۷ء) اور نانار یونی سہاے جیفی (ف: ۱۹۱۶ء) دونوں فارسی کے شاعر تھے۔ ان کے فارسی سے شغف کا یہ عالم تھا کہ اردو کو حقیر زبان سمجھتے اور اس میں معمولی مراسلت تک کو اپنے دون مرتبہ خیال کرتے تھے۔ ایسے ماحول میں انور کی تعلیم کس پنج پر ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں خود بتایا کرتے تھے کہ حروف پنجی

سے بھی قبل مجھے یوسف زینماے جامی کے ابتدائی تین صفحات زبانی حفظ کرا دیے گئے تھے جب حرف شناس ہو گئے، تو گلستان سعدی سے بسم اللہ سوئی پھر بوستان اور دوسری ابتدائی اور درمیانی کتابیں اسی طرح گھر پر پڑھیں۔ مانا اور پرانا مانا کے استاد تھے پر مانا کی وفات کے بعد مانا نے اکیلے پوری توجہ اور دلسوزی سے نواسے کی تعلیم کی نگرانی جاری رکھی۔

۱۹۱۱ء میں انور باقاعدہ اسکول بھیجے گئے۔ ان کی استعداد کے پیش نظر براہ راست ساتویں درجے میں داخلہ ملا۔ اسکول میں اردو اور انگریزی پڑھتے، اور گھر پر فارسی بہر حال فارسی کا درس ۱۳-۱۴ برس کی عمر تک ملا۔ اس وقت تک انھوں نے فارسی کا بشیر کلاسیکی ادب ختم کر لیا تھا، اور اس سے مزید کی توقعاً ضرورت بھی نہیں تھی، خصوصاً جب کہ اس سے اسکول کی تعلیم میں بھی حرج ہونے لگا تھا۔ لیکن یہ فارسی کی وسیع تفہیم بعد کے زمانے میں ان کے بہت کام آئی۔

۱۹۱۴ء میں اسکول سے فارغ ہوئے، تو مانا نے اپنے اثر و رسوخ سے انھیں ریاست ٹونک کے محکمہ پوتیس میں ملازمت دلوا دی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں انھوں نے جوانی کی ترنگ میں کسی موقع پر ریاست کے نظم و نسق کے بارے میں کچھ اعتراض کر دیے۔ اس زمانے میں اسی باتیں اور وہ بھی دیسی ریاستوں میں بغاوت سے کم تصور نہیں کی جاتی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں بیک می ددگوںش ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ اس اثنا میں (۱۹۱۶ء) میں مانا کا بھی انتقال ہو چکا تھا، جو ان کے حامی اور سرپرست تھے۔ چونکہ اندیشہ تھا کہ مبادا ریاست ٹونک ان کے خلاف کوئی مقدمہ قائم کر دے، یہ اپنے والد کے پاس گواہ لیا رہے آئے۔ انور کی والدہ کے انتقال کے بعد مہرنے دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ خاتون بھی سہوکارانہ تھیں۔ ان سے مہر کے چار بچے پیدا ہوئے۔ ایک بیٹی (برندارانی) اور تین بیٹے: بدری پرشاد سٹھوے (ولادت ۱۹۰۳ء) جگنا تھ پرشاد سٹھوے (ولادت ۱۹۰۵ء) اور سونج پرشاد سٹھوے پلیٹی افسر ضلع دیبا (ولادت: ۱۹۱۹ء) تینوں بھائی بفضلہ زندہ موجود ہیں (۱۹۷۷ء)

انور کو یہاں گواہ کیا کہ اس نے آیا، اس لیے انھوں نے چنبرے بعد پھر رخصت سفر باندھا۔ ایک لاہور پہنچے اور منشی محبوب عالم (دف: مئی ۱۹۳۳ء) کے مشہور ریڈیو اخبار میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔

اس زمانے کا لاہور صحیح معنوں میں اردو علم و ادب اور صحافت کا گہوارہ تھا۔ انور نے محسوس کیا کہ یہاں کے علمی حلقوں میں برابری کی سطح پر باوقار مقام حاصل کرنے کے لیے اشد ضرورت ہے کہ نہ صرف اپنی تعلیم کی تکمیل کریں بلکہ یونیورسٹی کی سند حاصل کریں۔ فارسی کی بنیاد، او وہ بھی خاصی مضبوط پہلے سے موجود تھی، انھوں نے رفتہ رفتہ ایم اے اور ایم اڈال کی اسناد حاصل کر لیں۔ وہ غالباً واحد ہندوستانی تھے، جنھیں تقسیم ملک کے بعد یعنی ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اپنے مقالے (انگریزی) : "سراج الدین علی خان آرزو: حیات و تصانیف" پر پی ایچ ڈی کی سند ملی۔

دہلاہور کے مشاعروں میں شریک ہوتے، شہر کی گونا گون ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے، اور مختلف اذقات میں بعض رسائل و جرائد کے دفین میں بھی کام کرتے رہے۔ چند، ڈی اے، وی کانٹے، لاہور میں فارسی اور اردو کے مدرس (لیکچرر) بھی رہے تھے۔ اس طرح جہاں ان کا حلقہ احباب وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ وہیں وہ کئی ایسے اصحاب اثر و رسوخ سے بھی متعارف ہو گئے جو ان کے اردو اور فارسی کے فاضل کی حیثیت سے معترف تھے۔ اس کا ادنی ثبوت یہ ہے کہ لاہور میں جہاں اس وقت ان دونوں زبانوں کے عالموں اور استادوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میاں سرفضل حسین (دف: جولائی ۱۹۳۶ء) نے انھیں اپنے بیٹے میاں عظیم حسین (آئی، سی، ایس) کو اردو اور چودھری مر شہاب الدین نے اپنے مہتمی میاں ممتاز محمد خان دلدانہ کو فارسی پڑھانے کے لیے مقرر کیا، یہ دونوں اس وقت بی اے کے طالب علم تھے۔

۱۹۲۵ء میں سر سکندر حیات خان کے مشورے سے انھوں نے پنجاب کے محکمہ تعلیم میں ملازمت قبول کر لی۔ اس زمانے میں مر شہاب الدین پنجاب کی مجلس دانش تو انین کے صدر تھے۔ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے انور صاحب کو مجلس میں مترجم مقرر کر دیا۔ تقریباً ایک دہائی تک وہی محکمہ

کام کرتے رہے، اور ۲۱ سالہ ملازمت کے بعد ۱۹۵۵ء میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے نشی
پر سبکدوش ہوئے۔ اسی تعلیمی صلاحیتوں کے پیش نظر اس کے بعد وہ پنجاب یونیورسٹی
کیمپ کالج، نئی دہلی میں شعبہ اُردو، فارسی، عربی کے صدر بن گئے۔

صحت ملت سے خراب چلی آ رہی تھی، فشارِ دم (ہائی بلیڈ پریشر) کی شکایت تھی۔ مارچ
۱۹۷۲ء میں پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا۔ بارے، دوا دوش سے حالت کچھ سہل ہو گئی، جنوری
۱۹۷۴ء میں دوسری مرتبہ بیمار ہوئے۔ اب کچھ چند دن اسپتال میں رہنے کے بعد کچھ فائدہ
ہو گیا اور وہ مکان پر آ گئے۔ یہیں ۱۵ فروری کو طبیعت یکایک پھنسا ہو گئی اور دو دن
بعد ۱۷ فروری ۱۹۷۴ء کو دوسرے وقت روحِ قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، اسی شام
پونے نو بجے جدِ نحاکی نذرِ آتش کر دیا گیا۔

ان کی پہلی شادی ڈوبک کے شری زندگی لال کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ یہ خاتون ایک لڑکی
اپنی یادگار چھوڑ کر ۳ مئی ۱۹۲۲ء کو رحلت کر گئیں۔ اس کے بعد دوسری شادی مارچ
۱۹۳۶ء میں غنشی برج موہن لال کی صاحبزادی شریتمتی چاند رانی سے ہوئی۔ غنشی صاحب
موصوف میں پوری کے رہنے والے اور ریاست جنید میں تحصیلدار تھے، اور ان دنوں شکر پور
میں تعینات تھے۔ ان کے بطن سے ماشاء اللہ پانچ بچے ہوئے، چار بیٹے اور ایک بیٹی۔
بفضلِ وہ خود بھی موجود ہیں اور سب اولاد بھی خوش و خرم ہے (۱۹۷۷ء)
انہوں نے شرگوئی بہت کم عمری میں شروع کی۔ اپنے گھر و پیش کے تقاضے سے ان کا سب
سے پہلا شعر فارسی میں تھا:

چیزِ نہ حدیثِ تو بقرآنِ نفوذِ تم
کفرے کہراہست، بائیاں نفوذِ تم
پھر اسی زمانے میں اُردو میں بھی کہنے لگے، تو کہا،
جواب نامہ نکھا دہشتے، لیکن خفا ہو کر
نوید زندگی آئی ہے پیغامِ قضا ہو کر
ان کے نام کو معلوم ہوا۔ تو فرمایا کہ فارسی کلام میں خود دیکھو گا، لیکن اُردو کلام اصلاً

کے لیے مولانا حالی کے پاس بھیج دو۔ مرحوم کہتے تھے کہ حالی نے مشکل دو تین غزلیں دیکھی ہونگی۔ پھر لکھا کہ "مقدمہ شاعر" کو بغیر بار بار پڑھیے، اس سے مذاق سخن بھی درست ہوگا اور زبان و بیان کے حسن و قبح کی تمیز بھی پیدا ہوگی۔ افسوس کہ مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا۔ یوں بھی تقسیم ہکت تک کا سارا کلام ضائع ہو گیا۔ یہ دہیں لاہور میں رہ گیا تھا۔ بعد کے کلام میں سے بھی چار ہزار شعر کا انتخاب کیا تھا اور اس کی اشاعت کی فکر میں تھے کہ موت کا بلاوا آگیا۔

انھوں نے متعدد انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی لیے تھے، یہ البتہ چھپ چکے ہیں بعض رسائل میں شائع شدہ کچھ غزلوں سے چند شعروں کا کلام کے طور پر درج کر رہا ہوں۔ ان کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ شعر دل سے نہیں دماغ سے کہہ رہے ہیں؛ وہ کہتے ہیں کسی پیر مر کے جتیا کیوں رہے کوئی

سمجھنے کے لیے اتنا اشارہ کم نہیں ہوتا
نہ کر مجھ کو ملامت، کوئی اپنے آپ، اے ناچ

گرفتار کند زلفِ خم در خم نہیں ہوتا
بہارِ جادو آرا سے عبتِ منسوب ہے شورش
جنونِ شورشِ سماں کا کوئی موسم نہیں ہوتا

وہ آئینے نہیں آئے، با خط آئینکا، نہیں کیا
بہشت کی سکون نا آشنائی کم نہیں ہوتی
یادش بخیر، زاہدِ مترماض کے لیے
گو کفر ہے پرستشِ خود بان خود پرست
دورانِ عیش و گردشِ ساغر، خوشالغیب
روایا نادوا، ہوتا ہی کیا ہے!
جھگڑنے میں بھی ہے اک لطفِ ادرنہ

غلط نکل مری تعبیرِ خوابِ اول سے آخر تک
دی رہتا ہے جوشِ اضطرابِ دل سے آخر تک
پندار کی شکست کا سماں ہے آجکل
لیکن یہاں تو کفر ہی ایماں ہے آجکل
سب راز گردشِ دوراں ہے آجکل
وہ جو چاہیں، کریں، بجا ہی کیا ہے!
ہمارا آپ کا جھگڑا ہی کیا ہے!

غصہ امردز ہی میں عمر گزری
وہ سنیں دیتے ہیں، میری بات سن کر
"ہنیت" ہے سرسری سی اک نظر بھی
دو عالم کے مرنے، ہیں میلہ سے میں
مرے امردز کا فردا ہی کیا ہے
نہ ہو یہ بات، تو رونا ہی کیا ہے
یہ تھوڑا سا گرم "تھوڑا" ہی کیا ہے
یہاں حبت بھی ہے، دنیا ہی کیا ہے

کم ان کا امید افزا نہیں ہے
ہمارے پاس جب جوتے نہیں وہ
ادھر بھی کچھ نہ کچھ، ہے بیقراری
کبھی ہوتا، کبھی ہوتا نہیں ہے
کوئی ان کے سوا ہوتا نہیں ہے
مگر کچھ اس طرح، گویا نہیں ہے

لگتا نہیں نگاہ ملانے سے درجھے
در تک ہزار بار اک امیدے گئی
لے دستو! تمھاری عنایت کا شکر یہ
دم بھر کو میری گمزدش تقدیر اک گئی
اس رشاک ہر دماہ کی رخصت گئی
میں نہ دکوراز ڈہرے کیوں بنی نہوں!
افو! اگرچہ عشق بہشت کی نیاہ کی
لگ جائے، اے خدا! نہ توں کی نظر مجھے
گھر ہی میں پیش آگئے کتنے سفر مجھے
کب تھے نصیب رخ و الم، اس قدر مجھے
جب اک گئے وہ خاک بسر دیکھ کر مجھے
لگتا ہے اس کے نور سے معمور گھر مجھے
کیا کم ہے یہ خبر کہ نہیں کچھ خبر مجھے
پھر بھی بنا ہنسنے کا نہ آیا ہنر مجھے

کس موڑ سے گرا اور ہاتھ اٹھیں خیال
نوش فہم کر دیا تری الفت اس قدر
مڑ مڑ کے دیکھتے تھے سر نہ گزر مجھے
آرام کا گمان ہے آزار پر مجھے

انظر احمد الدین (اے، ڈی انظر)

سیالکوٹ (پاکستان) کے تاریخی شہر سے دس بارہ کلومیٹر دور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے ڈگر احمد نام۔ یہاں زمانہ قدیم سے لہاروں کے بہت خاندان آباد ہیں (یا کم از کم۔) برس اُدھر تک تھے، اسی لیے بعض اوقات اسے کوٹلی لہاراں بھی کہتے ہیں! احمد الدین ۱۹۰۰ میں اسی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد رسمی تعلیم سے بہرہ ور نہیں تھے۔ لیکن آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات بالکل اُن پڑھ آدمی بھی علما، و فضلاء کی صحبت میں رہتے رہتے نہ صرف خود علمی اور دینی مسائل سے واقف ہو جاتا ہے، بلکہ اس میں زیادہ علم حاصل کرنے کی اور اپنی اولاد کو بھی تعلیم دلانے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی صورت حال یہاں بھی پیش آئی۔

احمد الدین کی تعلیم کا آغاز لڑائی کی مسجد سے ہوا کیونکہ یہاں کوئی مکتب نہ تھا، نہ اسکول۔ مسجد میں بھلا تعلیم کیا ہوتی! پیش امام صاحب کے نماز یاد کرادی۔ وضو اور طہارت کی کچھ ابتدائی باتیں بتادیں۔ اور پھر ناظرہ قرآن پڑھانے لگے۔ البتہ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ اُردو کے اتنے حرف شناس ہو گئے کہ جلد سی اور دور سم الخط میں لکھی ہوئی پنجابی زبان کے منظوم قصے اور سی حرفیاں ردائی سے پڑھنے لگے۔ ان کے والد نے دیکھا کہ لڑکا ہونہار ہے۔ ڈگر احمد سے چند کوس دور ایک دوسرے گاؤں میں ڈسٹرکٹ بورڈ کا پرائمری مدرسہ تھا، انھوں نے احمد الدین کو وہاں بھیج دیا۔ یہ اسی بستی کے پہلے طالب علم تھے، جو کسی مدرسے میں داخل ہوئے! احمد الدین بہتر اصحاب نے ان کا نام "احمد الدین" لکھا ہے، ٹھیک اور پورا نام "احمد الدین" تھا۔

نے پرائمری کے چاروں درجے تو مکمل کر لیے، لیکن اس کے بعد خیر معلوم کیا افتاد
پڑی کہ بھاگ نکلے۔ ڈیرہ دو سال تک گاؤں گاؤں چوہاڑوں میں قصے سناتے اور ہر پڑھتے
پھرے یا پھر اپنے معصوم دل کے ساتھ کھیل کود میں مصروف رہے۔ ان کے والد دل
موسس کر رہ جاتے کہ بیٹا کس راہ پر چل نکلا ہے۔ لیکن آدمی تھے بردبار اور سمجھدار
انہوں نے ڈانٹ ڈپٹ کی جگہ نفسیاتی علاج کا راستہ اختیار کیا۔ ایک مرتبہ ان کا
کسی کام سے سیالکوٹ جانا ہوا۔ واپسی پر بیٹے کے لیے گلستان سعدی اور عربی کی
کتاب البصرف اور کتاب النجوم کا ایک ایک نسخہ لیتے آئے۔ احمد الدین بھانپ گئے
کہ والد کی کیا تمنا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ پڑھنے لکھنے میں مجت گئے؛ اور دم اس
وقت لیا، جب مڑے کانچ، سیالکوٹ سے بی اے کی سند لے لی۔

اسکول اور کانچ میں ریاضی اور عربی ان کے خاص مضمون تھے۔ تعلیمی مشاغل کے علاوہ
رہنا بھر دنا اور اپنے احباب کے جھگڑوں میں ان کے لیے ہر موقع پر سینہ سپر ہو جانا
ان کا طرہ اختیار تھا۔ اسی لیے اپنے بے تکلف دوستوں کے حلقے میں وہ "جرینل" کے لقب
سے مشہور تھے (اور اس عرف سے وہ آخر تک پکارے گئے)

مڑے کانچ، سیالکوٹ کی تعلیم کے زمانے میں انہوں نے شمس العلماء مولانا سید میر حسن (جو
(ف: ستمبر ۱۹۲۹ء) سے بھی استفادہ کیا تھا، جن کا نام علامہ اقبال (ف: اپریل ۱۹۳۸ء)
کی "سوانح عمری" میں بہت نمایاں ہے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد اڈلا چنڈے تدریس کا مشغلہ رہا۔ چونکہ ریاضی اور حساب کتاب سے
شغف تھا، اس لیے انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ سرورس کے امتحان مقابلہ میں بیٹھے اور
کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد سب سے پہلا تقریر راولپنڈی کے ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر
میں ہوئی۔ راولپنڈی کے زمانہ اقامت کا ایک لطیفہ قابل ذکر ہے:

شہر میں مسلمانوں کا خاصا بڑا جلسہ منعقد ہوا، جس میں تعلیمی، معاشی اور سماجی مسائل پر
مختلف اصحاب نے تقریریں کیں۔ جلسے کی صدارت اپنی جوان عمری کے باوجود، اطر صاحب
کے حصے میں آئی۔ ایک پرانی وضع کے مقرر کی جو شامت آئی، انہوں نے اپنی تقریر

میں مختلف جماعتوں کی تعلیمی اذیتیں پر اعتراض کرنا شروع کر دیے اور چونکہ خود عربی کے عالم تھے، جہاں تہاں اپنی علمیت کا سگہ جانے کے لیے عرب کے حلقے اور اقتباس بھی تھیں کرتے گئے۔ اظہر مقررہ کے لیے اور خاص کر علماء کی تنگ سے سخت منعوض ہوئے۔ جب جلسے کے اختتام پر وہ صدارتی تقریر کرنے کو آئے، تو انھوں نے موصوفہ کو آڈت ہاتھوں لیا اور ان کی عربی دانی کی دھجیاں بکھیر دیں۔ انھوں نے جو عربی فقرے کہے تھے یا اقتباس سنائے تھے، ان میں صرف دھوکے غلطیوں کی نشاندہی کی اور کہا کہ اگر دوسروں نے ملی تعلیم کی طرف سے غفلت برتی ہے، تو آپ نے جو تعلیم پائی ہے، اسی میں کوئی ناسرخاب کا پیر حاصل کر لیا۔

اس کے بعد تو شہر میں اظہر کی دھاک بیٹھ گئی۔ جدھر ٹکڑے انگلیاں اٹھیں کہ دیکھو یہ انگریز لباس میں، سوٹ بوٹ پہنے افسر، عربی کا اتنا بڑا عالم ہے کہ اس نے فلاں مولوی کی تقریر کی ہر سربلہ غلطیاں نکالیں۔

لارڈ لینڈی سے تبدیلی ہوئی اور یہ حکومت ہند کے پہلائی اور ریلوے کے محکموں میں ڈپٹی فنانسئل میشر کے عہدے پر مقرر ہو کر رہ گئے۔ یہاں ان کی علمی اور ادبی سرگرمیاں المضاعف ہو گئیں۔ جب ملک تقسیم ہوا ہے، تو یہ آسٹریلیا میں ہندوستان کے ٹریڈ کمشنر (مندوب تجارتی) کی حیثیت سے سڈنی میں مقیم تھے۔ انھوں نے اپنی خدمات حکومت پاکستان کو پیش کر دیں، اور وہیں اس ملک سے پہلے عرب تجارتی بنادے گئے۔ وہاں سے ۱۹۴۹ء میں وطن واپس آئے جو پہلے مشرقی پاکستان میں تعینات ہوئے، قیام چاٹگام میں رہا۔ تین سال بعد وسط ۱۹۵۲ء میں حکومت پنجاب میں سکریٹری اور پھر سرری حکومت پاکستان میں جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ سب سے آخر میں ۱۹۵۵ء میں پاکستان کے سفارتخانہ لندن میں میشر مالیات و وزیر اقتصادیات مقرر ہو کر لندن گئے۔ وہاں سے ۱۹۵۸ء میں کراچی آئے اور جلد بعد ہی یہاں ملازمت سے پیشین پر سکد وشن ہو گئے۔ اس کے بعد کراچی کی ایک تجارتی فرم ڈین اینڈ دیبر کے مینیجنگ ڈائریکٹر مقرر ہو گئے تھے۔

بچپن کا ابتدائی زمانہ چھوڑ کر صحت ہمیشہ قابل رشک حرکت تک اچھی رہی۔ لیکن زندگی کی بے اعتدالیوں نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ عارفیہ قلب کا پہلا حملہ مئی ۱۹۵۹ء میں ہوا۔ بارے علاج معالجے سے بچ نہ سکے۔ لیکن دل کی بیماری ایسی ہے کہ اگر اس میں پوری احتیاط نہ کی جائے، تو یہ بد بخت کام تمام ہی کر کے پھینکا چھوڑتی ہے۔ اپنی فطری لذت آوارگی اور لاابالیانہ پن کے طفیل، اظہر سے یہ اختیار ہونہ سکی اور بالآخر اسی میں ۲۴ فروری ۱۹۷۴ء کو کراچی میں جان بحق ہو گئے۔ کراچی کے فوجیوں کے قبرستان میں آخری آرام گاہ نصیب ہوئی۔

اپنی عربی فارسی کی تعلیم کی بدولت مکتوں ان کا رجحان تحقیق کی طرف رہا۔ اس زمانے میں انھوں نے بعض بلند پایہ علمی مضامین قلمبند کیے، جو مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ انھیں جمع کر دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن بنیادی طور پر ان کا مزاج دمان پرور و شاعرانہ تھا۔ رہی سہی کسر ان کی عیش کو شوق اور تن پروری نے پوری کر دی۔ ان کے کلام میں ان کے تعلقات حسن و عشق کی بعض تلمیحات موجود ہیں، جن سے واقفان حال بخیر نہیں۔ کلام کا مختصر مجموعہ "لذت آوارگی" ان کی زندگی میں چھپا تھا (لاہور ۱۹۶۱ء) اس میں سب اصناف سخن کا کلام موجود ہے۔ اس کے بعد کا کلام بھی چھپ جانا چاہیے، تاکہ ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائے۔

عربی فارسی کے بعد ان کا دوسرا موضوع مطالعہ مذہبیات تھا؛ اور اس میں بھی اسلام اور عیسائیت کا تقابلی مطالعہ عیسائیت پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ اس کے عقائد سے ان کے مشنریوں کی تبشیری سرگرمیوں اور دسیسہ کاریوں تک اس کی تاریخ کا کوئی گوشہ ان سے مخفی نہیں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اہل اسلام کو ان کے سمرنگ زمین و آسمان کی موجودگی اور اس کے دُور رس نتائج سے خبردار کر دیں۔ اسی مقصد سے انھوں نے

انگریزی میں ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی: Christianity in History

خدا معلوم، وہ اسے مکمل کر سکے یا نہیں؟ اور اس کا مسودہ کہاں ہے؟ بڑے کام کی

چیز تھی!

نمونہ کے چند شعر دیکھیے :

اک تری بے رخی سے ، دوست ! کتنے چرخ بچھ گئے
 پھول میں رنگ بڑ کہاں ! چاند میں چاندنی کہاں !
 حسن کی ساکھ عارض و زلف ہی سے یہاں نہیں
 لاکھ حسیں جہاں میں ہوں ، تیری سی دہری کہاں !
 تم نے تو جیسے عمر ہی ہجر کی شب میں ڈھال دی
 میری کبھی سنی کہاں ! اپنی کبھی کہی کہاں !
 چھوڑے جاتے ہو جسے دیرانہ پھر اسی دل میں بسائے تھیں
 کاش ! وہ بھی تو کہیں مجھ سے کبھی دوسٹھا جاؤ ، تو مٹائیں گے تھیں
 مری عاشقی سہی بے اثر ، تری دہری نے بھی کیا کیا
 دہی میں رہا ، دہی بیدلی ، دہی رنگ یلہ ہمارے
 نہیں خوب کچھ ، نہیں زشت کچھ ، نہ نگاہ و دل کے ظلم
 کبھی ہے چمن کا چمن خزاں ، کبھی ایک گل ہی ہمارے
 ہے محبت بھی عجب کھیل کہ اس بازی میں
 لطف سے ہے کبھی لذت ، کبھی دشنام سے ہے
 راہ الفت میں اک ایسا بھی مقام آتا ہے
 کہ جہاں کام نہ آغاز ، نہ انجام سے ہے
 میں رہ عشق میں پہنچا ہوں وہاں اب کہ جہاں
 حاجت راز خود اپنے دل کا کام سے ہے
 تھا جس پہنا کبھی اب وہ آواز نہ رہی نیاز عشق کی پہلی سی آواز نہ رہی
 تو ایک بار تو آدن پھر میں تمنا کے اگرچہ اب وہ تمنا کی آواز نہ رہی
 نشیمن اپنا ہے پھر برق و باد سے سرشار نئی بہاؤ بھی کیا سا نہ گار گزری ہے
 میں اپنے دعویٰ الفت سے آج باز آیا گز گئی ہے ، مگر شرمسار گزری ہے

وہ کہتے ہیں: اگر تجھ کو جفا راحت نہیں ہوتی
 تو الفت چھوڑ دے، اس رنگ سے الفت نہیں ہوتی
 اک ایسا بھی مقام آتا ہے راہ عشق میں نظر
 جہاں انجام بہتی کے لیے فرصت نہیں ہوتی
 اس سے تو ہمیں انکار نہیں، دنیا کی ساکھ کرم سے ہے
 لیکن اس لہی دنیا میں خود ساکھ کرم کی تسم سے ہے
 تم حسن میں لاشانی ہو، تو کیا؛ سب ہی ہے خنک عشق نہیں
 جس حسن کی شان دکھاتے ہو، اس حسن کی آن تو ہم سے ہو
 جب آس ہی ٹوٹ گئی اپنی پھر کون کریگا شکوے گلے!
 اس کھیل کا سارا لطف ترے اک لطف و کرم کے بھرم سے
 ہم دل کی بات سماتے ہیں، تم دنیا ہمیں جھٹاتے ہو
 تم دنیا دالے کیا جانو، یہ دنیا دل کے دم سے ہے
 اک عالم جب ہم دیکھ آئے، تب جا کے ہمیں معلوم ہوا
 سب رونق اپنے دم سے ہے، عالم کا عالم ہم سے ہے
 ہم جن پر ہر دم مرتے ہیں وہ ہم کو دیکھ کے درتے ہیں
 ہے یہ بھی پیادہ کی صورت اس حسن کی شان ہی ہم سے
 تقدیر محبت غم ہی سہی تسلیم ہمیں، لیکن، اظہر
 اس غم پہ سزا خوشی قربان، یہ غم ہے، تو سب کچھ غم سے ہے

اظہر کو سنجیدہ مزاح پر بھی غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کی
 طبعی شگفتگی اور جدت پسندی اور بندہ سخن کے پورے جوہر ان کے فکاہی کلام ہی میں
 کہلاتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام میں کئی منظومات اس دوسری قبیل کی بھی ملتی ہیں جنہوں نے
 کے طور پر ایک نظم دیکھی، جس کا عنوان ہے: ایک دہیر کی دوسری شادی پر۔ اس
 میں انشا کی مشہور غزل کا نتیجہ کیا گیا ہے:

کراچی میں کمر باندھے ہوئے سب یاد بیٹھے ہیں
 جو بیٹھے جا چکے اک بار، پھر تیار بیٹھے ہیں
 جسے دیکھو، وہی ہے دوسری بیوی کے چکر میں
 غنیمت ہے، موصد جو یہاں دو چار بیٹھے ہیں
 نہ چھڑائے شیخ! ہم یہی بھلے چلے لگا لگائی
 تھے تو بیویاں سو بھی ہیں، ہم بزار بیٹھے ہیں
 نہ کریں چار جب تک شیخ جی کیوں مگے لینے
 وہ دکر کے بھی کہتے ہیں کہ ہم بیکار بیٹھے ہیں
 کہاں اب چین گھر کا، جب سے بیوی دوسری آئی
 "نظر آیا جہاں پر سایہ دیدار، بیٹھے ہیں"
 بلائے ناگہانی ہے، ہوائے زوجہ شامانی
 جو بیوی جیت کر اٹھے، وزارت ہار بیٹھے ہیں
 بھلا آپو کی لاٹھی چین دیتی ہے کسے؟ اظہر
 سبھی شوہر یہاں بھینسیں بنے، لاچار بیٹھے ہیں

(All Pakistan Women's Association)
 APWA ملک میں عورتوں کی سب سے بڑی انجمن کسی زمانے میں اس کا بڑا زور
 تھا

ساگر نگو دری، بلونت کمار

پنجاب کے ضلع جالندھر میں ایک مختصر قصبہ نکودر ہے، وہیں کے رہنے والے تھے۔
۱۱- تاریخ ولادت ۲۴ دسمبر ۱۹۱۲ء ہے۔ ان کے والد سادو زان بچہ ورنڈی میں چھٹا نمونہ
کام کرتے تھے۔ چونکہ گھر کے حالات تسلی بخش نہیں تھے، اس لیے بلونت کمار کی تعلیم
خاطر خواہ نہ ہو سکی؛ بمشکل پرائمری کے درجے پورے کر سکے۔

ہوش سنبھالنا کسی نہ کسی طرح گھر ہی سازی کا کام سیکھ لیا اور اسی کو بسر وقات کا
ذریعہ بنایا۔ اس سلسلے میں مختلف شہروں میں قیام رہا۔ جب ۱۹۳۰ء میں جہانگیر گاندھی
نے نمک ستیہ کرہ شروع کیا، تو یہ بھی میدان میں کود پڑے، پکڑے گئے اور جیل پہنچے۔
یہ تجربہ بعد کو بھی دو ایک مرتبہ ہوا۔

جیل خانے کے زمانے میں انھیں دہاں کے کتابخانے سے استفادے کا موقع ملا، جس
سے استعداد میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ اب انھیں شعر گوئی کا شوق چرایا رہا ہوئے،
تو اپنے پڑوس میں روشن لال روشن نگو دری کی خدمت میں جانے لگے۔ ان سے شوق
کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں شعر کے حسن و قبح کی تمیز ہونے لگی۔ اس پر روشن نے انھیں
اپنے استاد حضرت جوش ملیح آبادی (دف: جنوری ۱۹۴۶ء) کے حوالے کر دیا؛ یہ ۱۹۳۷ء
کی بات ہے۔ جوش صاحب کے حلقہ اقلید میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے پھر
کوئی اور دم نہیں دیکھا اور آخر تک انھیں کے دامن سے وابستہ رہے۔ انھیں
جوش صاحب سے طویل استفادے کا موقع ملا۔ شاعری کے علاوہ جوش صاحب کے
دو شوق اور تھے: حق اور شطرنج۔ ساگر جب ان کی خدمت میں ہوتے، تو حق تازہ

کرنے کی خدمت اکثر ان کے حصے میں آتی۔ خود ایک شعر میں کہا ہے:-

مری آتش بیانی کیوں نہ پائے داد اے ساگر!
بھری میں نے چلیس جوش سے کالِ سخنِ دل کی

۲۵ فروری ۱۹۷۳ء کو خلق کے کینسر سے جان بحق ہوئے۔ اولاد جسمانی سے کوئی نام نہ
اپنی یادگار نہیں چھوڑا۔

اُردو ادبِ ہندی دونوں زبانوں میں معتد بہ کلام موجود ہے۔ حورائے ادبِ افسانے بھی
لکھے، ہندی میں رامین ڈراما کی شکل میں "نرلیلا" کے نام سے لکھی تھی؛ شکنتلا نامک
بھی ہندی میں ہے۔ ایک سوشل ڈراما "سودا" نام کا بھی موجود ہے۔ افسوس کہ حالات
کی ناسازگاری کے باعث ان کی زندگی میں کوئی چیز شائع نہ ہو سکی۔ اُردو کلام کا
انتخاب "مرد و جزر" کے عنوان سے ان کی وفات کے بعد شائع ہوا (نکودر ۱۹۷۴ء)
کلام بے عیب ہے جس کی حضرت جوش ملیح آبادی کے کسی شاگرد سے توقع ہو سکتی ہے؛ لیکن
اس میں کوئی نمایاں خصوصیت نہیں پائی جاتی۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:-

دنیا میں خوشی سے وہ بشر رہ نہیں سکتا	دنیا کے جو آزاد دستم بہ نہیں سکتا
جس کو نہیں کوئی بھی غم، اس کے ہے غم مرگ	آرام سے دنیا میں کوئی وہ نہیں سکتا
مجھ کو سمجھانے سے باز آتا نہیں	کیوں کوئی ناصح کو سمجھاتا نہیں
زند سے کیا نسبت اے ناصح کچھ	وہ بہک جاتا ہے، بہکاتا نہیں
کس سے پوچھیں حالِ یارِ انِ غم	خود ہاں جاتا ہے، وہ آتا نہیں

اب مصیبت ہے، نہ غم ہے، نہ ہے مشکل کوئی — موت نے آ کے دیا خوب سہارا مجھ کو
چاہے سا ذل مضطر ہے ہی، اے ناصح! — کس طرح ترکِ محبت ہو گا اور انجھ کو
غم نہ بھٹکی تو بھٹکی ہی رہی راہِ محبت میں — مگر دیوانگی بھٹکی، تو وہ منزل پہ جا
محبت باعثِ آرام جاں معلوم ہوتی تھی — مگر اب باعثِ آزار کیوں ہے، ہم نہیں سمجھ
ذوقِ نظر میں ہے، تو سب کچھ جلیں ہے — جب یہ نہیں، تو کوئی بھی صورتِ حین نہیں

جینا ترے بغیر، تو مزارِ ترے حضور
آسان بھی نہیں، مجھے دشوار بھی نہیں
اگر مجھ میں اگر جذبہ کامل
مہرِ دود کو غمِ دودی منزل نہیں ہوتا
یہ آرزو تھی کہ ہم شرع آرزو کرتے
زبان نہ چلتی، تو آنکھوں سے گفتگو کرتے
بیمیں توں نہ سکی موت بھی محبت میں
حیات کے لیے کیا خاک آرزو کرتے
اس سے بھی آگے ہے کچھ منزلِ جینِ شوق کی

کعبہ ہی کافی نہیں ہے سر جھکانے کے لیے
داغِ لالہ، خونِ بلبل، رنگِ گلِ نو، و شفق

مُطر ہے، مے ہے، صحنِ چمن ہے، بہار ہے
سر خیال آتی ہیں اک دل کے فلانے کے لیے
یہ کم ہے کیا کہ ان سے ملاقات ہو گئی
ایسے میں آئیگا زوہ جان بہار کیا
ہے تمنای پہ موقوف مدارِ ہستی
لے دلِ ادہ بات کرتے بر سرِ بگڑا کیا
کچھ مستی شباب ہے، کچھ نشہِ شراب
یہ جو مرجائے، تو انسان بھی مرجاتا ہو
میری آنکھوں میں کھٹکتا ہے چمن، تیرے بغیر
نعرش ہے ان کے پاؤں، سمکت زبان میں

ہر گلِ تر مجھے کاٹنا سا نظر آتا ہے
کیا لکھا ہے مری قیمت میں، خدا خیر کرے

چہرہ اُترا ہوا قاصد کا نظر آتا ہے
آپ کرتے ہیں جو منہ پھیر کے اقرارِ وفا
اس میں بھی صورتِ انکا نظر آتی ہے
موت کے ایک ہی جھونکے سے یہ گرجا بیگی

زندگی ریت کی دیوار نظر آتی ہے
چوٹیں بھی سو طرح کی کھاتا ہے دل
صدے بھی شبِ غم کے اٹھاتا ہڈول
لیکن شیشے سے بھی وہ ناز کرتا ہے
اک ٹھیس لگے، تو ٹوٹ جاتا ہے دل
حالِ دماغی کی، اور مستقبل کی
رہتی ہے خبر اسے ہر اک منزل کی

دنیا کے خیالات کا مرکز دل ہے دنیا سے مگر جدا ہے دنیا دل کی
 آجائگی جس وقت اجل کیا ہو گا! اس خدشہ بیمحل کا حل کیا ہو گا!
 تو آج کی رات کو تو غم میں نہ بدل ناداں! کسے معلوم ہے کل کیا ہو گا!
 جب غنچہ سرشاخ چٹک جاتا ہے کاشا ساجت کا کھٹک جاتا ہے
 جو دل پہ گزرتی ہے نہ پوچھ لے ساگر! منصور سردار لٹک جاتا ہے
 بدنام کی صحبت کا ہے انجام برا چوری سے بھی چوری کا ہے انجام برا
 یہ قول بھی کیا خوب ہے، داناؤں کا فرماتے ہیں: بد اچھا ہے بدنام بُرا

محمود احمد عباسی، امروہوی

ان کے خاندان کا سلسلہ بواسطہ خلیفہ عباسی (بغداد) امین الرشید (خلف ہارون رشید) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ ابن عبدالمطلب تک پہنچتا ہے۔ خلیفہ امین الرشید (۸۰۹-۶۸۱۲) حضرت عباسؓ سے نوے پشت میں تھے جب ۶۱۲۵ھ میں ہلاکو خان نے بغداد کو تاراج کیا اور آخری خلیفہ انبی عباس مستعصم باللہ کو تہ تیغ کر دیا، تو اس خاندان کے اکثر اشخاص جان اور ناموس بچانے کی خاطر ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ انھیں خلیفہ امین سے دسویں پشت میں مخدوم زادہ محمد یوسف بھی تھے، وہ ہندستان چلے آئے۔ یہ سلطان غیاث الدین بلبن کا عہد حکومت تھا۔ سلطان نے ان کی خاندانی عظمت اور علمی حیثیت کے پیش نظر انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا، اور شاہان شان منصب اور عہدہ عطا کیا۔ یہ خاندان ایک صدی تک آرام و آسائش سے دہلی میں مقیم رہا تھا کہ آٹھویں قہر خاوندی امیر تیمور کی شکل میں نازل ہوا۔ اب مخدوم زادہ محمد یوسف سے چوتھی پشت میں مولانا شمس الدین یہاں سے نکل کر پنجاب چلے گئے اور زندگی کے بقیہ ایام انھوں نے دیوبند بسر کیے۔ ان کے پوتے مولانا رکن الدین عباسی (ابن مولانا نظام الدین) سلطان سکندر لودی کے عہد میں پنجاب سے نقل مکان کر کے امر دہ آئے۔ عباسیان امر دہ انھیں مولانا رکن الدین کے اخلاف ہیں۔

مولانا رکن الدین کی نوے پشت میں مولانا رشید احمد علی شاہ عباسی پچھلی صدی کے صاحبِ صورت و سیرت بزرگ تھے۔ شروع سے خاندانی جاہ و شہرت سے کٹاؤ کش

اور یاد اللہ میں مشغول رہے۔ اگرچہ باقاعدہ حضرت حافظ موسیٰ چشتی قادری مانچوہری سے بیعت تھے، لیکن دوسرے سلاسل طریقت مثلاً صابریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ میں بھی خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے۔ تمام وقت مطالعہ کتب دینیہ میں صرف ہوتا یا عبادت الہی میں۔ پیر کے دن ۲۹ شوال ۱۲۹۷ھ (۲ اکتوبر ۱۸۸۰ء) کو اکیاسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ امردہ میں شاہ علاؤل کی درگاہ میں، بلکہ انھیں کے پہلو میں دفن ہوئے۔

سید احمد علی شاہ کے اکلوتے فرزند سید علی محمد عباسی ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱-۱۸۳۲ء) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے دینی تعلیم اور درس نظامیہ کی تکمیل مختلف اساتذہ سے کی پھر حکومت انگریزی میں ملازم ہو گئے۔ اسی اثناء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے اسے بطور پیشہ اختیار کر لیا۔ پہلے مختلف مقامات پر کام کیا، لیکن بالآخر امردہ میں مقیم ہو گئے۔ ان کا کاشہر کے اکابر میں شمار ہوتا تھا۔ یہیں ۱۸۹۷ء میں رحلت کی اور اپنے والد کے پہلو میں جو اب حضرت شاہ علاؤل میں دفن ہوئے۔

سید علی محمد عباسی نے اپنے زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہوئے۔ سب کے نام لکھنا طوطا اللہ سے خالی نہیں۔ البتہ دو قابل ذکر ہیں: سب سے بڑے محمد داؤد عباسی جو کسی زمانے میں سلی گڑھ میں طالب علم تھے اور جن کا حالی کے بعض اشعار کی تضمین کے سلسلے میں بہت لوگوں نے ذکر کیا ہے، انھیں سید علی محمد عباسی کی پہلی بیوی کے بطن سے تھے۔ ۲۰۵۵ رمضان ۱۳۸۰ھ (۲۹ فروری ۱۸۶۳ء) کو امردہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا بعارضۃ تپ دق ۲۷ جون کو فتح آباد ضلع اگرہ میں انتقال ہوا، اور وہیں احاطہ عید گاہ میں دفن ہوئے (خمانہ جادید (۳) میں دونوں تاریخیں غلط ہیں)۔ ان کی شہزادی "الحسن داؤدی" محمد احمد عباسی نے شائع کی تھی۔ محمد داؤد کے چھوٹے بھائی حکیم فرید احمد عباسی کا اپنے عہد کے مشہور طبیبوں میں شمار تھا۔ وہ تینوں طبیبہ کالج، دہلی کے پرنسپل بھی رہے۔

سید علی محمد عباسی کی دوسری بیوی شیخ غلام محمد صدیقی کی صاحبزادی (صغیر النساء)

تھیں۔ ان بگم سے ایک بیٹی اور چار بیٹے ہوئے۔ محمود احمد عباسی بیٹوں میں سب سے بڑے تھے، یہ گویا محمد داد و عباسی نذکرہ الصدر کے علاقائی بھائی تھے۔ وہ منگل کے دن ۱۴ جمادی الثانی ۱۳۰۲ھ (۲۱ مارچ ۱۸۸۵ء) بوقت صبح امر وہیں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے وہ اپنے نانا شیخ غلام محمد صدیقی کے زیر اثر آ گئے، جو ان کے والد ہی کے ساتھ مقیم تھے۔ وہ انھیں اولیاء اللہ کے واقعات سناتے، اگر کسی درویش کی ملاقات یا بزرگ کی زیارت کو جاتے، تو انھیں ساتھ لے جاتے۔ اس سے ان کے دل میں تاریخ اور سیرت اولیاء و تصوف کا شوق پیدا ہوا، جس سے گویا بعد کے زمانے کے مطالعے کا رخ متعین ہو گیا۔

تعلیم کا زمانہ آیا تو امر وہ ہائی اسکول میں داخلہ ملا۔ یہیں زیر تعلیم تھے کہ ۱۸۹۷ء میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اب یہ اپنے دوسرے علاقائی بھائی ڈاکٹر محمد حسن عباسی کے پاس آنا و ادراٹے بریلی میں رہنے لگے، وہاں میڈیکل افسر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ دسویں درجے تک تعلیم بھی وہیں پائی۔ اس کے بعد لکھنؤ کالج میں بھیج دیے گئے۔ وہاں یہ کالج اقامت گاہ سے باہر ایک ذاتی مکان میں رہتے تھے۔ اور وہی ان کی تعلیم سے بے توجہی کا باعث ثابت ہوا۔ نواب قناد الملک، مولوی مشتاق حسین امر وہی ان کے والد کے دوست تھے۔ اگرچہ انھوں نے لکھنؤ میں اپنے ایک ممتاز دوست کو ان کے حالات کی نگرانی اور تعلیمی رہنمائی پر مقرر کر دیا تھا، لیکن یہ صاحب اپنا فرض بوجہ احسن بجا نہ لائے۔ غرض محمود احمد عباسی کی تعلیم نامکمل رہ گئی، لیکن ان نگران صاحب کی بدولت ان کا شہر کے متعدد ادیبوں اور اکابر سے تعارف ہو گیا۔ انھیں میں شبلی اور شرر بھی تھے، تعلیمی زمانے میں اگر کسی کو مجلس آدابی اور سنگت ماہ پروری کا چسکا پڑ جائے، تو تعلیم کے لیے اس سے زیادہ ہلک اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ یہاں بھی یہی ہوا۔

مولانا شبلی اور شرر کے زیر اثر ان کا زیادہ وقت تاریخ و سیر کی کتابوں اور سیاسی اور قومی لٹریچر، رسائل و جرائد کے مطالعے میں صرف ہونے لگا، اور وہ نصاب کی طرف

بے پردا ہو گئے۔ چنانچہ امتحان میں بار بار ناکام رہے، اور سیاسیات میں روز بروز زیادہ محو رہنے لگے۔

لکھنؤ میں مزید قیام بیکار بھی تھا اور ذریعہ معاش کے فقدان کے باعث تکلیف دہ بھی۔ چنانچہ مسلم اسکول، بریلی میں مدرس ہو کر چلے گئے۔ اتفاق سے یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا حالی اپنے مرگی کے مریض نواسے عبدالولی کے علاج کے لیے یہاں مقیم تھے۔ جس طرح قیام لکھنؤ کے زمانے میں، شبلی اور شرر نے محمود احمد عباسی کی حوصلہ افزائی کی تھی، اسی طرح حالی بھی ان کے علمی ذوق اور ادبی رجحان کو دیکھتے ہوئے، ان سے لطف و عنایت پیش آئے، عباسی صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، ان کا مضبوط نگاری کا شوق دراصل ان کی اسی حالی سے ملاقات کا مرہون منت تھا۔ یوں رسمی تعلیم کا جو سلسلہ منقطع ہو گیا تھا، اس نقصان کی بھی کچھ ملانی ہو گئی۔

حالی ان سے بہت شفقت سے پیش آئے رہے۔ دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی تھا (جیسا کہ مکتوبات حالی میں شائع شدہ خطوط سے ظاہر ہے) آخر کار انھیں کی سفارش پر عباسی صاحب کو ۱۹۰۸ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علیگر کے دفتر میں بطور نخبی معاون (پرنسپل اسٹنٹ) ملازمت مل گئی۔ عباسی صاحب یہاں ۱۴ برس رہے۔ ان میں سے تقریباً دس برس انھوں نے صاحبزادہ آفتاب احمد خان جائنٹ سکول (ف: جنوری ۱۹۳۰ء) کے ماتحت کام کیا۔ وہ ان سے بہت نوش اور مطمئن تھے۔ چنانچہ انھوں نے عباسی صاحب کو درجہ بدرجہ ترقی دے کر ادبی معاون اور سکھر صدر دفتر کا قائم مقام سپرنٹنڈنٹ بنادیا جب تک وہ ستمبر ۱۹۱۹ء میں وزیر منہد کی کونسل کے رکن بن کر انگلستان تشریف نہیں لے گئے، یہ بے غل و غش یہاں کام کرتے رہے۔ اور اس زمانے کے تمام اصحاب مجاز نے بھی ان کے کام کی تحسین کی (صدر یار جنگ) مولانا محمد حبیب الرحمان خان شروانی (ف: گت ۱۹۵۰ء) بھی اسی زمانے میں حضور نظام دکن کی خواہش پر صدر القدر امور ندہی ہو کر حیدر آباد چلے گئے۔ ان کے بعد جن اصحاب کے ہاتھ میں کانفرنس کی

باگ ڈور آئی، ان سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ کانفرنس نے صاحبزادہ صاحب موصوف کی سفارش پر انھیں انگلستان جا کر تعلیمی امور کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے چھ ہزار روپے وظیفہ دینا منظور کیا تھا۔ عباسی صاحب نے سفر کے تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ لیکن مخالفین کی ریشہ دوانیوں کے باعث نہ صرف یہ بل منڈھے نہ چڑھ سکی، بلکہ انھیں ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے بعد لمبی غیر حاضری کے بعد یہ اپنے وطن امر وہ واپس آ گئے۔

یہ طویل قیام علیگر ٹھہران کے دل و دماغ کی صلاحیتوں کی نچنگی کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ کاد منصفی سے جو وقت بچتا، وہ اسے مطالعے میں صرف کرتے۔ کالج اور کانفرنس کے کتابخانوں میں کتابوں کی کمی نہیں تھی۔ اس پر افسر ایسے ملے، جو کام اور علم کے قدردان تھے۔ عباسی صاحب کے دل میں بھی انگ انگ اور کام کرنے کا دلولہ موجود تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے مختلف موضوعات کے بارے میں وسیع مطالعے سے اپنی معلومات اور لیاقت میں معتد بہ اضافہ کر لیا۔

اب امر وہے میں مقیم ہوئے، تو درفاہ عام کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے، لیکن انہیں وطن کے عدم تعاون، بلکہ عملی مخالفت کے باعث اس میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم (ف: جنوری ۱۹۳۱ء) نے دلی سے اپنا مشہور روزنامہ "سمیرا" جاری کیا۔ انھوں نے عباسی صاحب کو بھی اس کے صیغہ، ادارت میں کام کرنے کی دعوت دی، جو انھوں نے قبول کر لی۔ اس سلسلے میں کوئی سال بھر دلی میں قیام رہا تھا۔

امروہے کے قیام کے زمانے میں انھوں نے "تاریخ امروہہ" (جلد اول) اور پھر "تذکرۃ الکرام" (دوسری جلد) اور تحقیق "النساب" تین کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا، تحقیق و تدقیق اور روایت و درایت کی تمام شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے، سخت پڑوسی اور حق گوئی میں کسی کی رورعایت ان کے سدا راہ نہیں ہوئی۔ "تاریخ امروہہ" میں اور پھر "تحقیق النساب" میں کئی خاندانوں کا گچا چمٹا تھا۔ اس

سے قدرتا بہت لوگوں کو رنج ہوا اور انھوں نے سخت مخالفت کی عباسی صاحب نے یکطرفہ برداشت کی، نقصان اٹھایا، لیکن جو بات صحیح سمجھی، اس کے اعلان سے باز نہ آئے۔ اس پر مقدمہ بازی ہوئی اور بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ دونوں میدانوں میں وہ ہر طرح کامیاب رہے۔

انھوں نے ملکی سیاست میں بھی عملی حصہ لیا۔ ممکن ہے کوئی اور اثر بھی رہا ہو، لیکن وہ غالباً مولانا محمد علی کی صحبت میں کانگریس میں شامل ہوئے۔ بعد کو امر و بہ کانگریس کمیٹی کے صدر چنے گئے تھے۔ اور کچھ مدت وہاں کی میونسپل کمیٹی کے صدر اور آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ ۱۹۳۶ء کے انتخاب کے سلسلے میں جب جواہر لال نہرو دورِ پیمار ہوئے گئے ہیں، تو وہاں جلسے کا انتظام، اور نظم و ضبط کا اہتمام عباسی صاحب ہی نے کیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک کی فضا مکدر ہو گئی اور امر دہے کا قیام غیر محفوظ ہونے لگا، تو وہ عارضی طور پر پاکستان چلے گئے۔ لیکن ان کا ارادہ وہاں مستقل قیام کا نہیں تھا۔ چنانچہ بعد کو جب دونوں حکومتوں کی طرف سے اعلان ہوا کہ اب مہاجرین کو اپنی مستقل حیثیت کا تعین کرنا پڑیگا، فلاں تاریخ کے بعد پاسپورٹ اور رہائشی کے قواعد نافذ ہو جائینگے، تو وہ سندھان واپس چلے آئے۔ یہاں ان کی خاصی بڑی جاداد وغیرہ تھی، کچھ کتابیں بھی چھپ چکی تھیں۔ اس لیے معقول آمدنی تھی اور بسر اوقات کے لیے کوئی تشویش نہیں تھی۔

ان کا نکاح ملا امان اللہ کے خاندان میں، ابراہیم علی صدیقی کی صاحبزادی (شکیلہ بیگم) سے ہوا تھا۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادی (رجیس فاطمہ) ہوئی، جو جناب سبط رسول فاروقی کے حوالہ عقد میں آئیں۔ پاکستان بننے پر بیٹی اور داماد وہاں چلے گئے تھے۔ جب عباسی صاحب تقاضاۓ عمر سے زیادہ بیمار رہنے لگے، تو ان لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ پاکستان چلے آئیے، تاکہ ہم آپ کی دیکھ بھال کر سکیں۔ یوں بھی اب امر ہے میں ان کا کون تھا! لہذا بیٹی کے بلانے پر وہ ۱۹۵۱ء میں ہجرت

کر کے مستقلاً کراچی چلے گئے۔ جانے سے پہلے انھوں نے یہاں کی بیشتر جاداد فروخت کر دی تھی، بقیہ کے عوض میں شاید وہاں کچھ باغات وغیرہ مل گئے تھے غرض انھیں وہاں بھی مالی پہلو سے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

کراچی کے زمانہ قیام میں ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے "حقیقت قوم کب ہو" چھپی جو اردو ہے ہی میں مکمل ہو چکی تھی، اور جس کا مسودہ وہ اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ لیکن جس کتاب نے سب سے زیادہ شگفا مہیا کیا، وہ "خلافتِ معاویہ و زید" ہے؛ یہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے امیر معاویہ اور ان کے جانشین زید کو حق بجانب ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ قدرتی بات تھی، شیعی حضرات نے سخت احتجاج کیا۔ حکومت نے عافیت اسی میں دیکھی کہ کتاب کی اشاعت ممنوع قرار دے دی۔ لیکن وہ عباسی صاحب کو خاموش نہ کر سکی، انھوں نے دو سال بعد اپنے نظریے کی تائید میں دوسری کتاب "تحقیق مزید" شائع کی (۱۹۶۰ء) مخالفانہ جلسے وغیرہ اب کے بھی ہوئے، لیکن چونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا تھا، اس کی تردید محال تھی، اس لیے مخالفین نے خموشی اختیار کی اور یہ کتاب ضبط نہیں ہوئی۔

انھوں نے شرعاً امر و نہی کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔ دراصل یہ ان کی تالیف امر و نہی کا ایک حصہ تھا۔ وہ یہ کام مکمل کر چکے تھے اور اس کا مسودہ بھی اپنے ساتھ لیتے گئے تھے لیکن یہ کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اگر ان کے پیاسندگ ان کے مسودات کی جھان بین کر کے اسے الگ کریں، اور شائع کر دیں، تو یہ اب گلِ منتقلِ خدمت ہوگی۔

۱۴ مارچ ۱۹۷۴ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔ طارق روڈ کراچی پرسوسائٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

ہندرناتھ

مشہور افسانہ نگار، قوم کے کھتری (چوڑہ) تھے۔ ان کا خاندان دراصل پنجاب میں زیر آباد ضلع گوجرانوالہ (پاکستان) کا رہنے والا تھا۔ ان کے والد گوری شنکر صاحب پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ ان کی اولاد میں پانچ بیٹے پیدا ہوئے: چار بیٹے اور ایک بیٹی۔ ایک بیٹا صغریٰ میں فوت ہو گیا تھا۔ ہماری زبان کے مشہور افسانہ نویس اور ناول نگار کرشن چندر (ف: مارچ ۱۹۷۷ء) ان کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ہندرناتھ ان سے نو سال چھوٹے تھے۔ ان سے چھوٹے راجندر ناتھ تھے، جن کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ پھر بن سرلادوی (ف: ۸ مئی ۱۹۷۵ء) جو خود بہت اچھی افسانہ نگار تھیں۔ سب سے چھوٹے اپندر ناتھ، ماشاء اللہ سلامت ہیں۔

ڈاکٹر گوری شنکر اسی حیثیت سے ریاست بھرتور میں ملازم تھے۔ ۱۹۲۳ء میں وہ وہاں کی ملازمت ترک کر کے کشمیر چلے گئے۔ یہاں وہ کشمیر کی ذیلی ریاست پونچھ میں سرکاری اسپتال کے انچارج مقرر ہوئے تھے۔ ان کی عمر کا خاصا بڑا حصہ پونچھ میں گزرا۔ انھیں اس ریاست کی ہر ایک تحصیل میں تین تین چار چار سال قیام کرنا پڑا تھا۔ ہندرناتھ یہیں پونچھ میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ اس لیے ان کا بچپن بھی کشمیر کی دلفریب وادیوں اور فلک بوس پہاڑیوں، روح پرور نظاروں اور خوبصورت جھیلوں میں گزرا۔ یہی حال بڑے بھائی کرشن چندر کا تھا۔ ان دونوں کی کہانیوں اور ناولوں میں جو فطرت کی نقاشی اور قدرتی حسن کی دیکھت تصویریں ملتی ہیں، ان کا پس منظر ان کے بچپن کا یہی ماحول ہے۔

جب تعلیم کا زمانہ آیا، تو کرشن چندر کی طرح انھیں بھی مقامی و کٹوریہ جوبلی ہائی اسکول میں بھیج دیا گیا۔ ہندو زمانہ نے انھوں نے درجے تک نہیں تعلیم پائی۔ کرشن چندر ان سے پہلے دسویں درجے کی سند لے کر فورین کرسچین کالج لاہور میں داخلہ لے چکے تھے۔ ڈاکٹر گوردی سنگھ نے خیال کیا کہ اگر ہندو زمانہ بھی لاہور چلے جائیں، تو یہ نہ صرف ان کی تعلیم کے لیے بہتر ہوگا، بلکہ دونوں بھائی ایک ساتھ رہ سکیں گے۔ چنانچہ ہندو زمانہ بھی لاہور آگئے، اور ڈی، اے، دی ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ دسویں کا امتحان انھوں نے اسی اسکول سے پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم انھوں نے بھی فورین کرسچین کالج ہی میں پائی، جہاں سے انھوں نے بی، اے کی سند حاصل کی۔

کرشن چندر نے ایم اے کے بعد ایل ایل بی کی سند بھی لی تھی۔ لیکن انھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ عملی سیاست در وہ بھی پساری قسم کی (اور تصنیف و تالیف میں لگ گئے۔ سیاست کا خاذا ان کے بس کی بات نہیں تھا، اس لیے انھوں نے یہ بھاری پتھر جوڑ کر چھوڑ دیا، اور تصنیف و تالیف کو بقیہ زندگی کے لیے اپنا ادھنا بھونا بنالیا۔

اس زمانے میں سید احمد شاہ بخاری (پطرس) آل انڈیا ریڈیو کے مدیر اعلیٰ (ڈائریکٹر جنرل) تھے اور وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مستند اور موہنا راویوں اور شاعروں کو ریڈیو میں جمع کر رہے تھے۔ جہاں کوئی جوہر قابل نظر آیا، انھوں نے اسے ریڈیو کی ملازمت کی پیشکش کر دی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو واقعی کان ادب بن گیا، متعدد ادیب اس کے مختلف مراکز میں ملازم ہو گئے۔ کرشن چندر بھی اسی سیلاب میں بہ گئے۔ ان کا افسانہ (برقان) ۱۹۳۶ء میں چھپا تھا، جس نے انھیں شہرت کی شاہراہ پر گھرا کر دیا۔ اس کے بعد اردو و چار چیریں بھی چھپیں۔ پطرس بڑے ذہین اور مردم شناس آدمی تھے۔ انھوں نے اس نوجوان مصنف کو ریڈیو میں آنے کی دعوت دی۔ یہ اپنے سیاسی بلکہ انقلابی خیالات کے باعث کچھ دن ٹال مٹول کرتے رہے، لیکن تاکے (احتیاج) نے تو بڑے بڑے شہر دوں کو روپاہ مزاج بنادیا، بھلا کرشن چندر کب تک اپنے انکار پر قائم

رہ سکتے تھے!۔ القصہ نومبر ۱۹۳۸ء میں وہ لاہور ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہو گئے۔ سال بھر بعد تبادلہ ہوا تو دہائی پہنچ گئے۔ اور پھر کوئی سال بھر بعد لکھنؤ۔۔۔

اسن چندر جہاں بھی گئے، ہندو ناتھ ان کے ساتھ تھے۔ مئی کے قیام کے زمانے میں ہندو ناتھ بھی شاہد احمد دہلوی سے ملے اور ان کے افسانے بھی ساتھی میں شائع ہونے لگے۔ اگر کبھی اردو افسانے کی تاریخ لکھی گئی، تو اس وقت کھلیکا کہ ساتھی نے اردو افسانے کے فروغ میں اور خود افسانہ نگاروں کی امداد اور ان کی شہرت میں اضافہ کرنے میں کیا اہم نمایاں کیے۔ خیر، یہ دوسرا موضوع ہے۔ بہر حال ہندو ناتھ نے اس زمانے میں افسانے لکھے، اور یہ ساتھی کے علاوہ اب دوسرے سالوں میں بھی چھپنے لگے۔

ہندو ناتھ نے یہاں کئی ڈرامے بھی لکھے تھے، جو دہائی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئے ایک مرتبہ یہاں کے قیام کے دوران میں دوستوں کے کہنے سننے سے انھوں نے حکومت ہند کے محکمہ سلائی میں ملازمت کا امتحان دے دیا، اور اس میں پاس ہو گئے۔ لیکن جب واقعی حاضری کا سوال آیا تو انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔

جب کرشن چندر ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ گئے تو ہندو ناتھ بھی ان کے ساتھ گئے، کرشن چندر پر دیگر ام اسٹنٹ مقرر ہوئے تھے، اور خاص طور پر ڈراما کا شعبہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس زمانے میں شوکت تھاڑی وہاں مضمون (سکرپٹ) لکھے پر مقرر تھے۔ تھوڑے دن بعد انھوں نے پنجولی آرٹ پروڈکشن، لاہور کی نوکری قبول کر لی، تو ان کی جگہ پر ہندو ناتھ کا تقرر ہو گیا۔

اب دیکھیے، تقدیر کا کرشمہ! ایک دن رچانک کرشن چندر کو مشہور فلم ساز ڈی۔ بی۔ اے۔ احمد کا پونا سے رملاکہ اگر آپ ہماری فلموں کے لیے مکالمے لکھنے کی خدمت قبول کرنا چاہیں، تو طے آئے۔ بدستوں نے انھیں سمجھایا کہ جی جانی سرکاری نوکری چھوڑ کر شخصی ملازمت قبول کرنا دشمنی نہیں، لیکن وہ واقعی اس سرکاری نوکری ہی سے برا رہ رہ چکے تھے۔ انھوں نے مستغنی دال کر دیا، اور پونا کی راہ لی۔ تصور کیا جاسکتا ہے کہ

اس سے اردو ادب کو کتنا فائدہ پہنچا۔ بہر حال دونوں بھائی ۱۹۴۲ء میں پونا گئے اور دو سال احمد کے ساتھ رہے۔ ۱۹۴۴ء میں کرشن چندر نے بمبئی مائیکز سے معاہدہ کر لیا۔ اور ایک سال بعد (۱۹۴۵ء-۱۹۴۶ء) خود پیشہ نخل تھیر کے تعاون سے اپنی ایک پرانی کہانی پر مبنی فلم ”سراے کے باہر“ بنائی۔ اس میں ہندو زنا تھ نے ہیرو کا پارٹ کیا۔ پھر دوسری فلم ”دل کی آواز“ تیار کی؛ اس میں بھی ہندو زنا تھ ہیرو تھے۔ (مئینہ خاتون نے حمیر دین کا دل ادا کیا تھا)۔

اس کے بعد زمر نے جب فلم کمپنی قائم کی، تو ہندو زنا تھ کوئی چار برس تک اس میں مکالمہ نویس رہے۔ اس کمپنی کی ایک فلم ”زلزلہ“ میں انھوں نے بطور اداکار بھی حصہ لیا تھا۔ خواجہ احمد عباس کی ایک فلم ”دھرتی کے لال“ میں انھوں نے ”سماج سیوک“ کا پارٹ ادا کیا تھا۔ اب ہندو زنا تھ کی بطور مکالمہ نویس اور افسانہ نگار کے مسئلہ حیثیت تھی۔ لیکن وہ جو عام مشاہدہ ہے کہ برگد کے درخت کے نیچے اور کوئی چیز اُگ یا پھل نہیں سکتی، وہی حشر ہندو زنا تھ کا کرشن چندر کی وجہ سے ہوا۔ کرشن چندر کی شہرت اور عظمت کے باعث ہندو زنا تھ کو احساس ہو گیا تھا کہ لوگ مجھے میرا جائز حق دینے کو تیار نہیں، اس لیے وہ کچھ بے پروا سے ہو گئے۔ ان کے بعض افسانوں میں زبان و بیان کی بوجھیاں نظر آتی ہیں، ان کا اصل سبب یہی ہے۔

ان کا ایک بڑا کام نامہ یہ ہے کہ انھوں نے ”فلم رائٹریسی لیشن“ قائم کی اور فلم سازوں سے فلم لکھنے والوں کے حقوق منوائے اور ان کا حق دلوا یا۔ وہ زندگی بھر بلا مقابلہ اس انجمن کے سکریٹری چنے گئے۔ وہ مدتوں ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے بھی وابستہ رہے۔ ہندو زنا تھ کے افسانوں کے دس مجموعے چھپ چکے ہیں: (۱) چاندی کے تار؛ (۲) مائی ڈارلنگ ہوٹل؛ (۳) گالی؛ (۴) یہاں سے دہان تک؛ (۵) پاکستان سے ہندوستان تک؛ (۶) جہاں میں رہتا ہوں؛ (۷) برات؛ (۸) نئی بیادی؛ (۹) تہتا، تہتا؛ (۱۰) داتا میری، ذکر تیرا۔

ان افسانوں کے مجموعوں کے علاوہ چند وہ نادل ہیں: (۱) آدمی اور گئے؛ (۲) رات اندھیری

ہے؛ (۳) سوز، عذبت اور گناہ؛ (۴) وعدہ؛ (۵) پیاد کا موسم؛ (۶) ایک شمع، ہزار
بروانے؛ (۷) منزل ایک، مسافر دو (۸) تیری صورت، میری آنکھیں؛ (۹) لیڈر؛ (۱۰)
روپا، (۱۱) بچن؛ (۱۲) نذیر سے ہیرو؛ (۱۳) درد کا رشتہ؛ (۱۴) ٹھوکر؛ (۱۵)
ارمانوں کی سیج۔

ان کی متعدد کہانیوں کے تراجم ہندستان کی مختلف زبانوں کے علاوہ روسی اور رومانی
زبانوں میں ہوئے ہیں۔ ان کی کہانیوں پر گوڑکی (روسی)، اور موپاساں (فرانسیسی)
افسانہ نویسوں کا بہت اثر ہے۔ اور ان ہی کی طرح بھوک اور جنس ان کے خاص
موضوع ہیں۔

۲۰ مارچ ۱۹۷۴ء کو بمبئی میں بعارضہ قلب انتقال کیا۔ لا دارفوت ہوئے۔

حمید احمد خان، پروفیسر

اردو صحافت کی اور ہمارے ملک کی تحریک آزادی کی کوئی تاریخ، لاہور کے روزنامے زمیندار اور اس کے مدیر شہیر مولانا ظفر علی خان (ف: نومبر ۱۹۵۶ء) کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ زمیندار دراصل مولانا ظفر علی خان کے والد مولوی سراج الدین احمد خان (ف: دسمبر ۱۹۰۹ء) نے ہفت روزہ کی شکل میں جاری کیا تھا۔ ان کے زمانے میں یہ واقعی زمینداروں اور کسانوں کے کام کا ذراعتی پرچہ تھا۔ اسے سیاسی اور علمی روزنامہ تو ان کی وفات کے بعد مولانا ظفر علی خان نے بنایا۔ لیکن اس وقت مجھے "زمیندار" کی تاریخ لکھنا منظور نہیں۔

مولوی سراج الدین احمد خان کی ساری اولاد ماشاء اللہ ایک سے ایک بڑھ کر ہوئی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دذکا حکیے۔ بڑی بیگم کے بطن سے تین بیٹے پیدا ہوئے: ظفر علی خان، غلام حیدر خان اور محمد اکبر خان؛ چھوٹی سے کبھی تین ہوئے: محمود احمد خان، حامد علی خان اور حمید احمد خان۔ ہر ایک نے اپنے اپنے میدان میں نمایاں خدمات سر انجام دی ہیں اور ہمارے خزانہ علم و ادب کو مالا مال کیا ہے۔

یہ خاندان دراصل کرم آباد (تحصیل وزیر آباد، ضلع گوجرانوالہ، پنجاب، پاکستان) کا رہنے والا تھا، لیکن حمید احمد خان یکم نومبر ۱۹۰۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک ان کی تعلیم چرچ آف اسکول لینڈ مشن ہائی اسکول، وزیر آباد میں ہوئی۔ ایک بات قابل ذکر ہے کہ ان کی طالب علمی کے زمانے میں تاریخ ادب اردو (انگریزی) کے مشہور مصنف اور ماہر سانیات ریورنڈ ڈاکٹر ٹامس گماہم ہیلی (ف: ۱۹۴۲ء)

اس اسکول کے مینجر تھے اور طلبہ کو انگریزی بھی پڑھاتے تھے۔ چنانچہ حمید احمد خان بھی ان کے شاگردوں میں سے ہے، بلکہ اپنی انگریزی کی قابلیت کے باعث یہ ان کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔

۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۴ء تک میں بھی وزیر آباد کے وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول کا طالب علم رہا ہوں۔ میں نے اسی زمانے میں ڈاکٹر دیلی کو دیکھا تھا۔ چونکہ ذکر آگیا ہے، اس لیے غالباً سچل نہیں ہوگا، اگر یہاں بطور حبلہ و معترضہ ڈاکٹر دیلی کا ایک لطیفہ محفوظ کر دوں:

ڈاکٹر دیلی اپنے طویل تیام پنجاب کے باعث بہت اچھی پنجابی سمجھتے اور بولتے تھے۔ اور انھیں اپنے ملنے والوں اور طلبہ اور طلبہ کے والدین کے ساتھ پنجابی میں گفتگو کرنے میں خاص لطف آتا تھا، بلکہ وہ اس زبان میں ہمارے کا نظام سرہ کر کے بجا فخر محسوس کرتے تھے۔ بعد کو انھوں نے ولایت دہلی پر پنجابی زبان سے متعلق متعدد کتابیں شائع کی تھیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلسل مشق اور مزاحمت سے ان کی پنجابی سے واقفیت حیرتناک حد تک وسیع ہو گئی تھی، اور وہ اس کے خاص محاورات اور لہجے پر بخوبی قادر تھے۔

ایک مرتبہ کیا ہوا کہ وزیر آباد کے مضامینات سے ایک دیہاتی اپنے بیٹے کو مشن اسکول میں داخلہ دلانے کو لایا۔ داخلے کی آخری تاریخ نکل چکی تھی اور درجے میں جتنی جگہیں تھیں، وہ پُر ہو گئی تھیں۔ طالب علم کے والد نے بہت مدت سماجت کی، لیکن ڈاکٹر دیلی ٹس سے ٹس نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ درجے میں جگہ ہی نہیں رہی، ہم داخلہ کیسے منظور کریں! لیکن دیہاتی اس کے باوجود اصرار کیے جا رہا تھا۔ اس پر ڈاکٹر دیلی کو مذاق کی سوچھی۔ فرمایا: اچھا، اگر آپ مجھ سے پنجابی میں کوئی بات ایسی کہیں، جو میری سمجھ میں نہ آئے تو میں لڑکے کو داخلے کی اجازت دے دوں گا یہ گویا ان کا اپنے پنجابی کے علم پر اعتماد کا اظہار تھا! اس پر لڑکے کے والد کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے بیاختہ کہا: ادے اتوں کون ہوناں ایس ایس چھو رے نوں داخل نا کرن آلا، میں گھسٹن مار تیرا بھٹن بھٹن دیو گنا رارے تم کون ہوتے ہو اس لڑکے کو داخل نہ کرنے والے! میں گھو نا مار کر تمھارے منہ کا جیرا توڑ دوں گا! اس فقرے کا پہلا حصہ ایسا مشکل نہیں

لیکن آخری حصہ واقعی مشکل ہے اور جس شخص کو دیہاتیوں کے ساتھ رہنے اور ان سے مقامی روزمرے میں بات چیت کرنے کا موقع نہ ملا ہو، اس کے لیے یہ عیسائی الفہم ہے۔ بیلی نے جو یہ فقرہ سنا، تو ان کا منہ کھلے کا کھلاہ گیا۔ لیکن زبان دے چکے تھے، اب وعدہ خلافی کیسے کرتے! کہنے لگے، اچھا صاحب، لڑکا تو داخل ہو گیا، لیکن جو کچھ آپ نے کہا، اب اس کا مطلب بتا دیجیے۔ جب دیہاتی نے معنی بتائے، تو بہت دیر تک سنتے رہے (یاد رہے کہ یہ سادی گفتگو پنجابی میں ہوئی تھی)۔

تو خیر، دسویں کی سند لینے کے بعد حمید احمد خان، حیدر آباد (دکن) چلے گئے، جہاں ان کے بھائی جناب محمود احمد خان عثمانیہ یونیورسٹی میں کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کے صدر تھے (بعد کو وہ چندے اسی یونیورسٹی میں رجسٹرار بھی رہے) حمید احمد خان نے عثمانیہ میں داخلہ لے لیا اور تین سال بعد بی اے آنرز کی یہیں سے سند لی۔ وہ اس سال اپنے درجے میں پوری یونیورسٹی میں اول آئے اور انھوں نے اول ڈویژن حاصل کی تھی۔ ایم اے (انگریزی) کا امتحان انھوں نے بعد کو گورنمنٹ کالج، لاہور کے طالب علم کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی سے دیا۔

حمید احمد خان بعد کے زمانے میں عام طور پر کہا کرتے تھے کہ میں حضرت مولانا عبدالباری (رع۔ باری) کا بنایا ہوا ہوں۔ مولانا عبدالباری ندوی (ف: فروری ۱۹۷۹ء) اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ میں فلسفے کے پروفیسر تھے اور حمید احمد خان کے استاد۔ ان کے دل و دماغ کی فتوحات اس وقت بھی نمایاں تھیں، اور بعد کو وہ جس مقام پر پہنچے، وہ تو ہم عامیوں کی پروا نہ خیال سے بھی کہیں بلند تھا۔

حیدر احمد خان نے ملازمت کا آغاز اسلامیہ کالج لاہور سے کیا؛ وہ جنوری ۱۹۳۲ء میں یہاں انگریزی کے مدرس (لیکچرر) مقرر ہو گئے۔ وہ بہت کامیاب معلم ثابت ہوئے۔ اپنے ہمکار مدرسین اور اساتذہ اور طلبہ میں وہ یکساں ہر دو عزیز تھے۔ اگرچہ وہ انگریزی پڑھاتے تھے، لیکن اُردو سے محبت اور اس کی ترقی اور ترویج کا جذبہ انھیں درونے میں ملا تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہاں کالج میں بزمِ فردغِ اُردو "قائم کی؛ اور کالج کے رسالے کریسٹ

کے مدیر اعلیٰ بھی رہے۔

اکتوبر ۱۹۴۴ء میں ادارتِ تعلیم، حکومتِ سندھ (ڈائریکٹریٹ آف ایجوکیشن) کے ادارے دہلی پالی ٹکنک میں انگریزی کے مدرس مقرر ہو گئے۔ اگلے تین سال ان کا قیام دہلی میں رہا جب آزادی کے ساتھ پاکستان وجود میں آیا، تو اگست ۱۹۴۷ء میں وہ وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن یہاں وہ زیادہ دن نہیں رہے؛ فروری ۱۹۴۸ء میں اسلامیہ کالج، لاہور میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ جلد ہی انھوں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹریٹ کی سند نہ ہونے کے باعث ان کی آئندہ ترقی مشتبہ ہے۔ اس پر وہ ۱۹۵۲ء میں کیمبرج (انگلستان) گئے اور وہاں سے ایم، لٹ (ماسٹر آف لٹریچر) کی سند حاصل کر کے وطن آئے۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا: دروہ سورتھ کی شاعری میں شہوانی اور روحانی تصورات۔ پروفیسر آبروی مرحوم (ف: اکتوبر ۱۹۶۹ء) جو ان کے یوٹر بھی تھے اور ایک ممتحن بھی، چلتے تھے کہ وہ سال بھر ادراک جائیں اور اپنے مقالے کا دائرہ وسیع تر کر کے اسے از سر نو قلمبند کریں، تاکہ انھیں پی ایچ ڈی کی سند دی جاسکے۔ لیکن حمید احمد خان کے خانگی حالات ان کے مزید قیام انگلستان کے لیے سازگار نہیں تھے؛ انھیں بادلِ خواستہ واپس آنا پڑا۔ واپسی پر وہ اپنے اصلی کالج میں شعبہ انگریزی کے صدر مقرر ہوئے اور چار سال بعد ۱۹۵۸ء میں کالج کے پرنسپل بنادیلے گئے۔ ان کا پانچ سالہ عہدِ ادارت اس کالج کی تاریخ کا زریں دور ہے۔

ستمبر ۱۹۶۳ء میں انھیں پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر (شیخ الجامعہ) بنایا گیا۔ انھوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں پنجاب یونیورسٹی کی کاپی لٹ دی جس جگہ انگریزی کے سوا کوئی اور آواز نہیں سنائی دیتی تھی، وہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرکام اُردو میں ہونے لگا۔ وہ خود اپنا دفتر ہی کام اُردو میں کرتے، مسلوں پر اپنی یادداشتیں اور حکم احکام اُردو میں لکھتے، اور دوسروں کو بھی اسی کی ترغیب دیتے۔ اساتذہ کو عام اجازت تھی کہ وہ تمام مضامین اُردو میں پڑھائیں۔ طلبہ کو کھلی چھٹی تھی کہ بی اے،

بی ایس سی، ایم اے تک تمام امتحانات کے پرچوں کے جواب اُردو میں لکھیں۔ اور تو اور تمام امتحانات کی اسناد بھی اُردو میں چھپنے لگیں۔ وہ ساری زندگی انگریزی پڑھاتے رہے اور یہاں سے دلالت تک سب معترف میں کہ وہ بہت اچھی انگریزی بولتے اور لکھتے تھے۔ لیکن اپنی گفتگو یا اُردو تحریر میں، اصطلاحات کے ماسوا، وہ کبھی انگریزی کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کے دماغ میں دونوں زبانوں کے خانے الگ الگ تھے جب ایک بند ہو جاتا، تو دوسرا کھلتا؛ وہ دونوں کو آپس میں گڈ مڈ نہیں کرتے تھے۔

یہ پاکستان کی سیاست کا دُرِ ایوبی تھا، اور وہاں ایک نئی قسم کی نوکر شاہی عالم وجود میں آگئی تھی۔ ہر سرکاری دفتر اور ایریا غیر افسر ہر اڈے میں دخل در معقولات دنیا اپنا پیدائشی حق سمجھتا؛ ادھر حمید احمد خان ضابطے قانون کے صدر رہے یا بند۔ ان کا اصول یہ تھا کہ تعلیم کا درجہ سب سے بلند ہے؛ اور کسی "بیر دنی" کا پونیو سٹی کے معاملات میں ان کی اجازت کے بغیر، دخل دینا کفر کے مرادف۔ وہ خود کسی وزیر یا تدبیر تک کی ملاقات کو تو جلتے نہیں تھے، سکرٹری، نائب سکرٹری کا کیا ذکر ہے! کبھی ضرورت پیش آگئی، تو ضابطے کا خط پرچہ لکھ کر متعلقہ دفتر میں بھیج دیا۔ جہاں بنیادی اصولوں میں اور طریقہ کار میں یہ بعد المشرقیں ہو وہاں، پھلاکتے دن عافیت سے گزر سکتی تھی! کمال تو یہ ہے کہ اس پر بھی انہوں نے چھ برس گزاریے۔ بہر حال ارباب حکومت کو ان کی آزادہ ادوی اور بقول شخصہ "اکرہ" کھلنے لگی۔ چنانچہ ان کے خلاف طرح طرح کی ایشہ دوانیاں ہونے لگیں۔ ادلاً طلبہ کو ان کے خلاف بھڑکانے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ پھر ان سے کہا گیا کہ وہ طویل رخصت پر چلے جائیں۔ حمید احمد خان نے دیکھا کہ اس ماحول میں عزت نفس اور خود ادوی کی قربانی دیے بغیر گزارا ممکن نہیں۔ اس پر انہوں نے "عطائے توہ" بلقائے توہ" کہتے ہوئے، ۶۱۹۶۹ء میں استعفا دے دیا۔

ابھی وہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے کہ حکومت نے مارچ ۱۹۶۲ء میں ان کی علمی اور

تعلیمی خدمات کے اعتراف میں انھیں ستارہ امتیاز کا اعزاز دیا۔ پھر یونیورسٹی کی خدمت کے دوران میں اگست ۱۹۶۸ء میں اس سے بھی اعلیٰ "سادہ پاکستان" کا نشان عطا کیا۔ جون ۱۹۶۴ء میں جا کارتا (دار الخلافہ انڈونیشیا) میں ایک ایشیائی/افریقی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اور اس کے اگلے برس مارچ ۱۹۶۵ء میں باندنگ میں بدوؤں میں وہ پاکستانی وفد کے سربراہ تھے۔ ۱۹۶۵ء میں اس کے مستقل ادارے کے نائب صدر بھی چنے گئے تھے۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء کی باندنگ کانفرنس میں بھی شریک ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ یونیورسٹی کی داس چانسلری کے دوران میں انھوں نے جس فرض شناسی کا ثبوت دیا اور جس محنت اور دلسوزی سے دن رات کام کیا، اس نے ان کی تندرستی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ ۱۹۶۹ء میں یہاں سے سکندرشہ تو ہو گئے، لیکن اس کے بعد صحت کے پہلو سے کبھی اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اس کے باوجود جب حکومت نے اپریل جولائی ۱۹۶۹ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کا اضافی مدیر (ایڈیشنل ڈائریکٹر) بنانے کی پیشکش کی، تو انھوں نے اسے اس خیال سے قبول کر لیا کہ اس سے ملک و ملت اور زبان کی خدمت کا ایک موقع پیدا ہو گیا تھا۔ سال بھر بعد یہ امتیاز علی تاج کی وفات (اپریل ۱۹۷۰ء) پر وہ جولائی ۱۹۷۰ء میں مجلس ترقی ادب کے ناظم مقرر ہو گئے۔ اپنی وفات پر وہ اسی عہدے پر مشغول تھے۔

انھیں فشار دم کا عارضہ تھا۔ اس کا سب سے پہلا حملہ جون ۱۹۷۳ء میں ہوا۔ اس کے بعد طبی ہدایت کے تحت وہ کچھ محتاط طور پر رہنے لگے، لیکن کام کی وہ بھر مار تھی کہ سکون مفقود تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء صبح دفتر جانے کے لیے تیار ہوئے تھے کہ تھے ہوئی۔ چند منٹ آرام کرنے کے بعد پھر جانے کو اٹھے۔ گھر کے لوگوں نے بہت منع کیا کہ آج دفتر نہ جائیے اور ڈاکر کو بلا کر اس سے مشورہ کیجیے۔ لیکن ان کا اصرار تھا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اتنے میں دوسری مرتبہ تھے ہوئی اور ساتھی بیہوش ہو گئے۔ ڈاکٹر آیا، معلوم ہوا کہ دماغ کی رگ پھٹ گئی ہے۔ اسی حالت میں اسپتال پہنچائے گئے۔ جہاں اسی دن شام کے چھ ساڑھے چھ بجے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ جاڑہ اگلے دن سہفۃ ۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء کی صبح میں اٹھا اور انھیں گلبرگ کے قبرستان میں (غالب اردو اور سرسید اردو کے مابین) سپرد خاک کیا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے عفو و کرم کا سلوک کرے، آمین! طاہر شادانی نے آہ کے تجزجہ سے تاسخ کہی ہے:

طاہر! اس کے سن رعلت پر گہو کھینچ کے آپہ
”اے رحمتِ فردوس، حمید احمد خان“

(۱۹۸۰-۶ : ۱۹۷۴)

ان کی شادی ۱۹۴۲ء میں ہوئی تھی۔ اولاد میں چھ بیٹے اپنی یادگار چھوڑے۔ سب سے بڑے سید احمد خان ایم، ایس سی، ایم ایس (امریکہ) کیمیکل انجینیر ہیں۔ ان سے چھوٹے بیٹے خلیل احمد خان بھی انجینیر ہیں؛ جمیل میاں نیاک میں ملازم ہیں۔ دقار، منصور اور ممتاز ابھی طالب علم ہیں۔ سلم اللہ تعالیٰ۔

جس طرح وہ بات چیت میں بہت کم گو تھے، اسی طرح لکھنے میں بھی بہت محتاط اور سست رہتے تھے۔ انھوں نے بہت کم لکھا ہے اور اس میں سے بھی بہت کم کتابی صورت میں جمع ہوا۔ لیکن یہاں سوال مقدار کا نہیں، بلکہ معیار کا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں انھوں نے ایک انتخاب ”سہفۃ ادب“ (نظم و نثر) شائع کیا تھا، جو نصاب کے لیے بہت مؤثر ہے۔ لیکن اصل ان کی اپنی سب سے پہلی کتاب حضرت رسول کریم صلعم کی مختصر سوانح عمری ہے، جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ دیوان غالب کا نسخہ بھوپال، جو بعد کو نسخہ حمیدریہ کی بنیاد بنا، ایک مدت سے غائب اور علمی دنیا اس سے استفادہ کرنے سے محروم ہو گئی ہے۔ خوش قسمتی سے حمید احمد خان نے اسے اگست ۱۹۳۸ء میں بالاستیعاب دیکھا تھا، اور اس سے یادداشتیں لے لی تھیں۔ انھیں کو مرتب کر کے غالب صدی کے موقع پر جولائی ۱۹۶۹ء میں نسخہ ”حمیدریہ“ شائع کر دیا اور اس طرح یہ دیوان دوبارہ بلکہ زیادہ محکم طور پر حمید کے نام سے منسوب ہو گیا۔

ان کی تیسری کتاب "ارمغانِ حالی" ہے (لاہور، ۱۹۷۰ء) اس میں حالی کی نظم و نثر کا انتخاب ہے۔ اس کے دیباچے کا مطالعہ حالی کے سمجھنے اور اردو ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کی ذہانت کے وقت و دکتا ہیں زیرِ طبع تھیں تعلیم تہذیب اور اقبال کی شخصیت اور شاعری؛ یہ بعد کو شائع ہوئیں۔

ان کی کئی کتابیں کم دہش ترتیب و تدوین کے آخری مرحلوں پر تھیں۔ ان میں غالب اور اقبال کے بارے میں بہت کام ہو چکا تھا۔ غالب سے متعلق مضامین مختلف رسائل و جرائد میں منشر ہیں، ان کا ایک مجلد شائع ہونا چاہیے۔ انھوں نے اپنے معصروں اور بزرگوں کے حالات میں متعدد مضامین قلمبند کیے تھے، جو اسی زمانے میں چھپے تھے، انھیں بھی جمع کرنا چاہیے۔ غرض کہ شش کر کے ان کی تمام اردو اور انگریزی تحریروں کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

افسر میرٹھی، حامد اللہ

میرٹھی میں مفتیوں کا خاندان بہت مشہور ہے، بلکہ وہ محلہ جہاں ان اصحاب کی پختہ ہے، "محلہ مفتی صاحبان" کے نام سے موسوم ہو گیا ہے۔

اس خاندان کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ شاہان مغلیہ کے عہد میں ان کے بزرگوں کو ضلع میرٹھی میں معافی کے چند گانے عطا ہوئے تھے جس سے انھوں نے میرٹھی میں سکونت اختیار کر لی۔ اس آخر زمانے میں ان کے ایک فرد مفتی محمد عصمت اللہ ہوئے ہیں۔ وہ بھی اسی خاندانی روایات کے حامل اور زیورِ علم و فضل سے آراستہ تھے۔ اور طویل مدت مقامی گورنمنٹ اسکول میں اردو فارسی کے مدرس رہے۔ ان کے چھ اولاد

ہوئیں: (۱) بلقیس۔ شعر بھی کہتی تھیں اور مقامی طور پر کافی مشہور ہوئیں؛ (۲) شفقت اللہ، (۳) حامد اللہ، (۴) مطیع اللہ۔ انھوں نے گورنمنٹ اسکول میرٹھی سے دسویں درجے کی سند حاصل کی اور اس کے بعد جیو ر میں سکونت اختیار کر لی؛ وہاں اسکول میں معلم ہو گئے تھے۔ نجی مطالعہ سے بالآخر ایم اے پاس کر لیا اور اسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے گئے تھے؛ غالباً راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں؛ قمر تخلص ہے (۵) مبشرہ؛ (۶) مومنہ۔

حامد اللہ ۲۹ نومبر ۱۸۹۵ء کو بنے خاندانی مکان (محلہ مفتی صاحبان) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا زمانہ آیا، تو والد نے انھیں خود فارسی اور اردو پڑھانا شروع کی جیب کافی استعداد ہو گئی، تو حکم ہوا کہ روزانہ کسی اپنی پسند کے موضوع پر ایک مضمون اردو میں لکھ کر دکھایا کرو۔ موضوع کی قید نہیں تھی؛ یہ کسی برتن، پھول، چارپائی، لگائے کھیتیں

پر ہو سکتا تھا۔ روزانہ نماز مغرب کے بعد وہ یہ مضمون دیکھتے، ادنیٰ آواز سے اسے خود پڑھتے اور ہمیشہ اس کی تعریف کرتے۔ سال کے آخر میں یہ ۳۶۵ صفحات مجلد کر ایسے جاتے۔ اب آغاز سال سے دو کام ان کے ذمے ہو جاتے: ایک ایسا مضمون حسب معمول لکھنا؛ اور دوسرے پچھلے سال کے اسی تاریخ کے مضمون کی سرخ روشنائی سے اصلاح کرنا۔ مغرب کے بعد وہ یہ دونوں چیزیں والد کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ وہ ہمیشہ کی طرح انھیں پڑھتے، تعریف کرتے اور لوٹا دیتے۔ یہ سلسلہ برسوں تک رہا۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے:

اگر کسی دن کسی وجہ سے مضمون نہیں لکھتے تھے، تو والد ناراض نہیں ہونے تھے، نہ زبردستی بیٹے کو لکھانے پر مجبور کرتے، بلکہ انھوں نے تنبیہ کا ایک الگ طریقہ اختیار کیا تھا شب کا کھانا باپ بیٹے دونوں روزانہ دیوانخانے میں ایک ساتھ کھاتے تھے جس دن یہ مضمون نہ لکھتے، والد اندر کھلا بھیجتے کہ آج کھانا صرف حامد اللہ کے لیے بھیجا جائے، ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔ اور کھانا آجانے پر انھیں حکم ہوتا کہ کھانا کھاؤ۔ یہ ایسی سخت سزا تھی کہ ان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ تیز سے تیز بخار تک کی حالت میں بھی وہ ایک صفحے کا یہ مضمون ضرور لکھ لیتے تھے۔

رات کو یہ اپنے والدی کے پاس دیوانخانے میں سوتے تھے۔ سونے سے پہلے وہ انھیں ملکوں ملکوں کے بڑے بڑے لوگوں کے، خاص طور پر تاریخ اسلام کی برگزیدہ اور ممتاز شخصیتوں کے حالات اور قصے سنایا کرتے تھے۔ جب تک یہ انگریزی اسکول میں داخل نہیں ہوئے، وہ پہلا دستور ایک صفحہ روزانہ لکھنے کا جاری رہا۔ اس کے بعد اس میں ترمیم ہو گئی کہ اب موضوع اپنی پسند کا نہیں بلکہ پچھلی رات جو مشاہیر کے واقعات سنائے گئے تھے، ان میں سے کوئی واقعہ ایک صفحے میں لکھا جائے۔

مفتی محمد عصمت اللہ بیٹے کو فارسی اور عربی کا عالم بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھیں مدرسہ عالیہ میرٹھ میں داخل کرایا گیا۔ لیکن یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ سال بھر بعد امتحان ہوا تو کسی مضمون میں ممکن نے انھیں پچاس نمبر کے پرچہ میں پچپن نمبر دے دیے۔

جب یہ بات مفتی صاحب کے علم میں آئی تو بہت متعجب ہوئے۔ کہتے: پچاس تک تو خیر
غیبت تھا، یہ پچپن کیسے ہو گئے؟ پنج فاضل کہاں سے آئے؟ اس پر وہ کچھ بدظن
ہو گئے، حامد اللہ کو مدرسہ عالیہ سے اٹھا کر دیوبند بھیج دیا، جہاں کے اکابر سے ان
کے ذاتی تعلقات تھے۔ لیکن یہ وہاں سال بھر سے زیادہ نہ رہ سکے۔ ایسے بیمار پڑے
کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر علاج کے لیے میرٹھ آنا پڑا۔ علاج سے اچھے تو ہو گئے۔
لیکن پھر دیوبند واپس نہ جاسکے۔ اب مفتی صاحب نے خود ہی پڑھانا شروع کیا۔
فارسی کا نصاب ختم کیا، بلکہ اسی زمانے میں یہ فارسی شاعری کرنے لگے۔ پھر ان کے دو
بزرگ راہ نے یہ فیصلہ کیا کہ انھیں عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ اندلس، قاہرہ بھیج
دیا جائے۔ چنانچہ اس کا خرچ پورا کرنے کے لیے اپنا ایک مکان بیچنے کی تیاریاں
کرنے لگے۔ اور ساتھ ہی سفر کے لیے پاسپورٹ کی درخواست دی۔ لیکن عربی
کی تکمیل قسمت میں نہیں تھی تھی۔ پاسپورٹ کی درخواست منظور نہ ہوئی اور یہ مصر
نہ جاسکے۔

اس اثنا میں ان کے ایک مکان میں آگرے کے ایک نقشہ نویس کرایہ دار آگئے۔ ان کا
ایک بیٹا اسکول کے ساتویں درجہ میں فارسی میں قیل ہو گیا۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو انگریزی
اور ریاضی کے مضامین گھر پر ہی طور پر پڑھانے کا انتظام کر رکھا تھا، لیکن فارسی کا
کوئی معقول انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ انھوں نے مفتی صاحب سے مشورہ کیا، تو انھوں
نے حامد اللہ کو بلوایا اور پوچھا کہ انھیں مشکل درپیش ہے، کیا آپ کوئی مدد کر سکتے ہیں؟
یہ اس لڑکے کو فارسی پڑھانے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک دن اس لڑکے نے حامد اللہ صاحب
سے پوچھا کہ کیا آپ انگریزی نہیں جانتے؟ ان کے نفی میں جواب دینے پر اس نے پیشکش
کی کہ میں آپ کو انگریزی پڑھا دیا کروں گا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ خود ساتویں درجے میں
پڑھتا تھا، اس لیے وہ زیادہ دن تک ان کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ بہر حال یہ انگریزی
پڑھنے لگے۔ جب ان کے والد مفتی عصمت اللہ کو ان کے نئے شوق کا علم ہوا، تو انھوں
نے جو صلاح فرمائی کی اور کچھ ابتدائی کتابیں بھی منگوادیں۔ استاد شاگردی کا یہ

سلسلہ دو برس تک جاری رہا۔ اس کے بعد محض حسن اتفاق سے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ان کی زندگی کا رخ ہی بدلا گیا۔ اپنے ڈپٹی تدریس احمد کے دل کالج میں داخلے کا قصہ تو پڑھا ہو گا کہ کیونکر داخلے والے دن بھڑ میں ان کا پاؤں پٹا تھا، جس سے وہ گر گئے، اور پرنسپل نے لیک کر انھیں اٹھایا اور مفتی صدر الدین آزاد کے حوالے کر دیا اور مفتی صاحب نے ان کا امتحان لے کر انھیں کالج کے عربی درجے میں داخل کر لیا۔ اور یوں وہ کسی مسجد کی پیش امت سے بال بال بچ گئے۔ حامد اللہ کے ساتھ جو کچھ گزری وہ اس سے کم دلچسپ نہیں۔

ان کا وہ فارسی کا شاگرد اب کچھ نہیں تھا امتحان پاس کر کے مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول کے نویں درجے میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ جس دن داخلے کا فیصلہ ہونا تھا، یہ بھی تفریح ٹہلنے تھلنے اس کے ساتھ اسکول چلے گئے۔ کسی نے بتایا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سب امیدوار کا خود امتحان لینگے، اور داخلے کا فیصلہ کرینگے۔ اسی سال نئے ہیڈ ماسٹر فریئر صاحب ولایت سے تشریف لائے تھے۔ سب امیدوار ان کے کمرے کے باہر جمع ہو گئے اتنے میں فریئر صاحب بنگلے سے برآمد ہوئے اور حکم دیا کہ سب طلباء ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں اس پر اسکول کے کوئی اور معلم آگے بڑھے، اور بچوں کی قطار بنوانے لگے۔ جب اس نے حامد اللہ کو بھی قطار میں کھڑا کرنا چاہا تو انھوں نے کہا کہ میں داخل ہونے کو نہیں آیا۔ استاد نے ان سے بھرپور کہا: خاموش رہو اور چپ چاپ قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ اس معلم نے غالباً سنا بھی نہیں تھا کہ حامد اللہ نے کیا کہا ہے۔ طوعاً و کرہاً یہ قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اب ہیڈ ماسٹر صاحب نے آگے بڑھ کر قطار میں سے لڑکوں کا انتخاب شروع کیا۔ وہ جس لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے تھے وہ قطار سے الگ ہو جاتا۔ یہ دوڑیں استاد شاگرد قطار میں ایک دوسرے کے برابر کھڑے تھے۔ ماسٹر صاحب نے حامد اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ان کے شاگرد (یا استاد) کو چھوڑ دیا۔ اب اسکول کے اسی استاد نے ان سے نام، پتا وغیرہ پوچھنا شروع کیا۔ یہ پھر امتحان کرنے لگے کہیں نویں درجے میں داخلہ نہیں چاہتا۔ میں اس کے لائق ہی نہیں۔ لیکن وہ استاد

ہوئے کہ جب نوحہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے تھا داداؤں کے لیے انتخاب کر لیا ہے، تو تم کون مہوتے ہو انکا کرنے والے تو صاحب، یہ گورنمنٹ ہائی اسکول کے نویں درجہ میں داخل ہو گئے۔ خیر یہ داخل ہونے کو تو ہو گئے، لیکن اس نعمت غیر مترقبہ کے باعث اچھی خاصی مصیبت میں بھی گرفتار ہو گئے۔ انھوں نے تاریخ، جغرافیہ، ریاضی (حساب)، الجبرا، اقلیدس وغیرہ کا کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ پہلی سہ ماہی کے اخیر میں اردو فارسی اور انگریزی میں تو کسی طرح پاس ہو گئے، بقیت مضامین میں صفر۔ اس پر والد نے ان کے پڑھانے کے لیے خاص استاد کا انتظام کیا ششماہی میں، ریاضی کے علاوہ دوسرے مضامین میں بھی بھلے بُرے پاس ہو گئے۔ اس سے کچھ حوصلہ بڑھا۔ بہر حال سال کے آخر میں ششم پشتم چل نکلے۔ غرض انھوں نے ۱۹۲۰ء میں میرٹھ کالج سے بی اے کی سند لی۔ اس کے بعد ایم اے اور وکالت کی تعلیم کے لیے علی گڑھ بھی گئے۔ لیکن عین امتحان کے زمانہ میں انھیں تہ مجرقہ نے آدو جا۔ میرٹھ چلے آئے اور امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔

علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں (۱۹۲۲ء) میں انھوں نے یونیورسٹی بورڈنگ ہاؤس میں رہنے کے بجائے شہر میں ایک کمرہ کرایے پر لے لیا تھا۔ یہ کمرہ شہر بھر کے شاعروں کی آماجگاہ بن گیا۔ باہر کے شاعر بھی آکر ان کے وہاں ڈیرہ اڈال دیتے جنکو اردو فانی کئی مرتبہ ان کے ہمان رہے۔ انھوں نے ایک پرچہ "ذہب سار" کے نام سے جادی کر دیا جس کے لیے وہ مختلف عنوان خود ہی تجویز کر کے دستوں سے مضمون لکھواتے رہے۔ اس سلسلے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک حصہ دوسرے ہندی اور اردو کے رسائل میں چھپنے والے ممتاز مقالات کے لیے وقف تھا۔ اس زمانے میں ڈائجسٹ کا تصنیف بالکل نادر تھا۔

جب وہ علی گڑھ سے واپس آکر میرٹھ میں مقیم ہوئے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انھوں نے ایک مقامی اخبار انجیل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔

ان کے دسویں کی سند لینے کے بعد ہی سے والد ان کی ملازمت کے لیے کمشنر میرٹھ کے پاس سفارشیں پہنچا رہے تھے۔ ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ حامد اللہ صاحب نائب تحصیلدار

کے لیے نامزد ہو گئے۔ جب انہیں معلوم ہوا، تو انہوں نے والد سے احتجاج کیا کہ میں اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت یہ میرٹھ کالج کے انٹر میڈیٹ کے متعلم تھے۔ والد نے ان کے شوق کے پیش نظر اصرار تو نہ کیا، لیکن یہ کہ اب ان کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں تھی کہ وہ اتنے بڑے کینے کی پڑوسش کے ساتھ ان کی تعلیم کا خرچ بھی برداشت کر سکتے۔ کالج کے پرنسپل مسٹر جمیس کو جب معلوم ہوا کہ اس طالب علم نے سرکاری ملازمت پر تعلیم کو ترجیح دی ہے، حال آنکہ اس کے گھر کی مالی حالت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ملازمت قبول کر لیتا، تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس کا اظہار انہوں نے منجملہ ادرہ سہولتوں کے اس طرح سے کیا کہ انہیں ایک انگریز مسٹر نکسن کو اردو فارسی پڑھانے پر مقرر کر دیا۔ مشاہرہ چالیس روپے مقرر ہوا۔ لیکن ایک ہینا بھی مشکل سے گزرا ہو گا کہ انہوں نے مسٹر نکسن سے کہا کہ میں آپ کو اردو، فارسی پڑھاؤنگا، آپ مجھے انگریزی پڑھا دیا کیجیے، اس صورت میں آپ کو مجھے تنخواہ دینے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑی سی جیس بیس کے بعد مسٹر نکسن اس انتظام پر رضی ہو گئے، جس سے دونوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ چنانچہ ہندستان سے واپس جانے کے بعد نکسن صاحب غالباً لیڈز یونیورسٹی میں فارسی پڑھانے پر مقرر ہو گئے تھے۔ انہوں نے حامد اللہ افسر کی کئی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔

بی اے کا امتحان پاس کر لینے کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین (ف: دسمبر ۱۹۲۷ء) نے کوشش کی تھی کہ یہ سرکاری ملازمت میں لے لیے جائیں۔ لیکن افسر صاحب نے کہا کہ میں یا تو کتاب کی اشاعت کا کام کرؤنگا، یا پھر تعلیمی محکمے میں پڑھانے کا۔ ۱۹۲۷ء میں ان کے والد مفتی محمد عصمت اللہ کا انتقال ہو گیا۔ تعزیت کے لیے آنے والوں میں ان کے والد کے ایک دوست کا یوپی حکومت میں اچھا خاصا اثر و رسوخ تھا۔ ان کی وساطت سے دسمبر ۱۹۲۷ء میں وہ گورنمنٹ جوبلی کالج، لکھنؤ میں اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ یہیں سے ۲۳ برس بعد ۱۹۵۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے آخری زمانے میں وہ کالج کے وائس پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے۔

ان کے آخری ایام بہت تکلیف میں بسر ہوئے۔ آمدنی تقریباً مفقود، اسباب معیشت کی مدد افزوں گرائی، بکری سنی۔ ان سب کے نہ ہونے نہ ڈھال کر دیا تھا۔ تپ دق ہو گئی۔ یوپی حکومت اور یوپی اردو اکاڈمی نے کچھ مالی امداد دی، لیکن حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ آخر کار بغرض علاج لکھنؤ میڈیکل کالج کے تپ دق کے شعبے میں داخل ہو گئے تھے، لیکن اب حالت علاج کی حدود میں نہیں رہی تھی۔ وہیں ۱۹ اپریل ۱۹۷۱ء سہ پہر میں انتقال ہو گیا۔ تجہیز و تکفین اگلے دن ۲۰ اپریل کو ہوئی۔ قدیم اطباء لکھنؤ کے خاندانی قبرستان محلہ جھواٹی ٹولہ کی مٹی مسمت میں بھی تھی۔

افسر نے شعر گوئی بہت جلد شروع کر دی تھی۔ اول اول انھوں نے لوریاں اور گیت لکھے۔ یہ آج سے ۶۵۔ ۷۰ سال پہلے کی بات ہو، جیسے اردو دواؤں کو ان باتوں کا علم بھی نہیں تھا۔ ان کی یہ لوریاں یوپی کے دیہات میں میٹس اور بڑی بوڑھیاں آج بھی اپنے بچوں کو سناتی ہیں، اگرچہ یہ کسی کو معلوم نہیں کہ ان کا لکھنے والا کون ہے۔ ان کا ایک مختصر مجموعہ "بچوں کے افسر" کے عنوان سے نود الحسن ہاشمی نے چند سال پیشتر شائع کیا تھا۔ افسر کا نام خاص کر بچوں کے شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوا، لیکن انھوں نے نظم و نثر میں خاصا بڑا ذخیرہ اپنی یاد گار چھوڑا ہے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب "چاند چاند" ہے جس میں چاند کہانیاں ہیں۔ یہ کتاب جب پہلی مرتبہ چھپی ہے، تو وہ اُس کے پہلے سال کے طالب علم تھے۔

اسی زمانے میں بیگم کو ذیل انعام ملا، تو مسٹر نکسن نے انھیں مشورہ دیا کہ بیگم کی کتاب کو رینڈ مون (ریشٹو) کا اردو ترجمہ کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے ترجمہ کیا اور اس کا نام "ماہ نو" رکھا (مسٹر نکسن) نے "چھوٹی چھوٹی کہانیاں" نام تجویز کیا تھا، یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا اور اسی کے ساتھ "چاند چاند" بھی جواب تک گنا م تھی، منظر عام پر آگئی۔ دونوں کتابوں کے سال بھر میں کئی ایڈیشن نکل گئے اور ان سے افسر صاحب کو اتنی یافت ہو گئی کہ وہ اپنے تعلیمی اخراجات کی طرف سے بے فکر ہو گئے۔

"ماہ نو" کے ترجمہ کا شاخسانہ ایک اور طرح نمودار ہوا۔ انگریزی کتاب کے ناشر (میک ملین پبلی)

نے انھیں ہر جانے کا نوٹس دیا کہ تم نے ہماری اجازت کے بغیر سادی "کاپی رائٹ" کتاب کا ترجمہ کیوں چھاپا ہے۔ یہ بیچارے سیدھے سادے آدمی، بھلا ان قانونی موثر گائیڈوں کو کیا جانیں؛ کلکتے کا ٹکٹ لیا اور خود ٹیگور کی خدمت میں جا پہنچے۔ ٹیگور نے انھیں اس ضابطے سے نکلنے کی راہ سمجھائی۔ کتاب کا ہندی ترجمہ بعنوان "شیشو" بھی چھپ چکا تھا اور اس کے جملہ حقوق خود ٹیگور کے پاس تھے۔ ٹیگور نے ان سے کہا کہ تم میک میلین کمپنی کے نوٹس کے جواب میں لکھ دو کہ میں نے اردو ترجمہ انگریزی سے نہیں بلکہ ہندی سے کیا ہے۔ یہی انھوں نے لکھ دیا، جس پر انگریزی ناشر خاموش ہو گئے اور یوں یہ بلا ٹلی گئی۔ اس کے بعد سٹے ٹیگور سے عمر بھر کے لیے ذاتی تعلقات قائم ہو گئے۔

ان کی تصانیف کی مختصر فہرست یہ ہے:

۱۔ نظم: پیام روح (الہ آباد ۱۹۲۷ء)؛ جوئے ڈان (لکھنؤ ۱۹۵۴ء) دونوں میں نظمیں اور غزلیں ہیں۔ دوسری کتاب پر حکومت یو پی نے ۵ روپے انعام دیا تھا۔ حتیٰ کی آواز (لکھنؤ ۱۹۴۲ء) دوسری جنگ عظیم سے متعلق نظمیں۔

۲۔ افسانہ: چادر چاند (میرٹھ ۱۹۱۷ء)؛ ڈالی کا جوگ (الہ آباد ۱۹۲۷ء)؛ آنکھ کا نور (لکھنؤ ۱۹۴۰ء)؛ پرچھائیاں (لکھنؤ ۱۹۴۵ء)۔

۳۔ ڈراما: سفت منظر (لکھنؤ ۱۹۴۲ء) ایک ایکٹ کے ڈرامے۔

۴۔ تنقید: نقد الادب (لکھنؤ ۱۹۳۵ء) تنقید کی تاریخ اور اس کے اصول؛ کتاب کی جنگ (لکھنؤ ۱۹۳۸ء)؛ نورس (لکھنؤ ۱۹۳۸ء)؛ تنقیدی اصول اور طریقے (ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ)۔

۵۔ ترجمہ: ماہ نو (میرٹھ ۱۹۱۸ء) ٹیگور کے کریسٹ مون کا ترجمہ

۶۔ قومیات: ہمارا جھنڈا (لکھنؤ ۱۹۵۸ء) پندرہ اگست (لکھنؤ ۱۹۴۷ء) تاریخ تحریک آزادی؛ گاندھی جی کے ساتھ (لکھنؤ ۱۹۶۰ء) گاندھی جی کے اقوال؛ حکایات گاندھی (سنگم، دہلی) گاندھی جی کی روزمرہ کی زندگی کے سبق آموز واقعات۔

۷۔ متفرقات: آسمان کا ہمایہ (الہ آباد ۱۹۵۴ء) ایورسٹ کی کہانی؛ ترقی

کی راہیں، عملی نفسیات (بچوں کے لیے) جانوروں کی عقلندی (سنگم، دلی)، گلیو کا سفرنامہ (بچوں کے لیے) سوفٹ کی مشہور کتاب کا ترجمہ، مکانوں کی کہانی۔ ان کے علاوہ انھوں نے بچوں کے نصاب کی متعدد کتابیں بھی لکھی تھیں۔ جو برسوں یوپی کے مدراس میں پڑھائی گئیں۔ غیر مطبوعہ کتابوں میں ایک طویل مثنوی 'آدم نامہ' ہے جس میں انسان کی آفرینش کا مقصد بیان کیا ہے۔ ایک مسدس "رازِ مخسر" بھی ہے اس کا موضوع اورنگ زیب۔ اور داراشکوہ کی جنگ ہے۔ ایک اور کتاب "ذوقِ ادب کی تربیت" بھی لکھی تھی۔ ۱۹۶۷ء میں انھوں نے اپنی سوانح عمری لکھنا شروع کی تھی۔ خدا معلوم یہ مکمل ہوئی تھی، یا نہیں۔

اب آخر میں چند شعر ملاحظہ کیجیے۔ بختگی اُن کا طرہ امتیاز ہے۔ حسنِ فطرت کے دلدادہ اور رجائیت کے علمبردار ہیں۔ محبِ وطن اور بنی نوعِ انسان کے مہمدر۔

ہزارینر بگیوں کے مالک! مجھے تبادے یہ کیا تم ہو
کہ تیرے کعبے میں رسنے والا، کبھی خدا سے کبھی صنم ہو
مجھے بتانا تھا حال کچھ تو وہ پوچھتے تھے کہ حال کیا ہے
مگر میں بے اختیار، افسر! یہ کہ اٹھا! آپ کا کرم ہے

چاہتے ہیں اب تو یہ سودا ئیانِ جستجو — کاش، منزل پر کوئی کہے دے کہ یہ منزل نہیں
"اردن کا گوشا" میں آنا محال ہے — لیکن کسی کو نیند نہ آئے، تو کیا کرے

جب دل پہ نہ ہو قابو اپنا، کیا ضبط کریں کیا صبر کریں!
مجھ جیسے کاش، وہ ہو جائیں جو آ کر سمجھاتے ہیں

سب خوشی کا خیال آتا ہے — دل مایوس کانپ جاتا ہے
صدائیں آتی ہیں دھیمے نرں میں گانے کی — اب کج بھر نہیں امید نیند آنے کی
کیا پوچھتے ہو، کیا حالت ہے؟ جو پڑتی ہے وہ سہتے ہیں

پھر شام ہوئی، پھر رات ہوئی، یہ دن بھر دھڑکتے رہے ہیں
فطری ہسی خاموشی لیکن کچھ چوٹ بھی دل پر کھائی ہے
یہیں نے اکثر دیکھا ہے، کچھ افسر چپ چاپ رہتے ہیں

یہ بھی اک تماشا ہے کا اباد الفت میں دل کسی کا ہوتا ہے، بس کسی کا چلتا ہے
اس قدر بھی الفت میں ہونہ کوئی بے قابو دل میں سوچتا کیا ہوں منہ سے کیا نکلتا ہے
انسان وہ ہے جو، اے افسر! ٹھکرائے مصائب کو بہیم

ساحل جسہ نہمتی ہے دنیا، سمایہ ہے طوفانوں کا
حسن ہستی کے اندر بنقاب حسن پھر بھی ہے حجاب اندر حجاب
دیر و کعبہ پر حقیقت تو کھلے اب الٹ ہی دیکھئے رخ سے نقاب
جب سفر، افسر! کبھی کرتے نہیں دیکھتے پھر کیوں سو تم منزل کے خواہ
موت ہے وہ دراز جو آخر کھلیگا ایک دن زندگی ہے وہ معراج جس کا کوئی حل نہیں
جو جینا ہو تو پہلے زندگی کا مدعا سمجھے خدا تو فبق ہے، تو آدمی خود کو خدا سمجھے
ہے وہ، جس کی امیدیں ہیں خزاں پر موقوف

شاخ گل سوکھ کے گر جلے، تو کا شانہ بنے
کیف سامان کوئی مجھ سا بھی نہ ہوگا، افسر!

آنکھ جس پھول پر ڈالی، وہی پیمانہ بنے
شے نہیں کم بجر کے مادوں کی سحر بھی یعنی وہی غفلت ہے، وہی بھری ہے
اب آپ اسے دل کہیں، یاد دل کی تمنا اک آگ سی افسر! مرے سینے میں بھری ہے
جو غم حد سے زیادہ ہو، خوشی نزدیک ہوتی ہے

چمکے ہیں ستارے رات جب تا دیک ہوتی ہے
ہے زندگی عالم کی عمل ہی سے سرا فراز فطرت کے ہر انداز سے افشا ہے یہی راز
پر دانہ سے مل جاتی ہے جگمگ کو تپ تاب نار ایک ہے جگمگ کا جہاں، مگر نہ ہو پرداز
بے ادج سی، بے جان سی پھر آج ہے دنیا دیران ہے، برباد ہے، تاراج ہے دنیا
اب منہ نہیں بزدان سے گن سننے کا، افسر! انسان سے گن سننے کی محتاج ہے دنیا

اندر حیدر آبادی، صدیق احمد

حضرت امیر مینائی (ف: اکتوبر ۱۹۰۵ء) کے شاگرد رشید فصاحت و جملہ مانچووری کے نام نامی سے کون اوردوان واقف نہیں ہوگا۔ وہ امیر اللغات کی ترتیب و تدوین میں استاد کے دست راست تھے۔ ۱۸۹۹ء میں جب نظام دکن میر محبوب علی خان شہابی سند کی سر کے لیے تشریف لائے، تو استاد داغ (ف: ۱۹۰۵ء) نے امیر مینائی کو جنھیں وہ اپنے قیام واپس کے زمانے سے جانتے تھے، بنارس کے مقام پر حضور نظام کی خدمت میں پیش کیا۔ اعلیٰ حضرت نے ایمان فرمایا کہ امیر مینائی حیدر آباد آئیں۔ واپس کی بساط اٹھ چکی تھی، اور امیر بہت پریشان حال تھے۔ یہ تھوڑا سا سہارا ملنے پر انھوں نے پرانے اور گونا گون جسمانی عوارض کے باوجود طوعاً و کرہاً دکن کا کالے گھوڑوں کا سفر کو آرا کر لیا۔ لیکن یہ سفر حیدر آباد کا نہیں بلکہ ان کا سفر آخرت ثابت ہوا۔ جہاں حیدر آباد سے ہو کر جانا ان کے مقدر میں لکھا تھا۔ وہاں پہنچنے کے چند ہی ہفتے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

امیر اس سفر میں اپنے چھوٹے شاگرد جلیل مانچووری کو بھی ساتھ لیتے گئے تھے۔ استاد کی وفات کے بعد جلیل حیدر آباد ہی میں مقیم رہے، اور انھوں نے بقیہ زندگی وہیں بسر کر دی۔ داغ نے ۱۹۰۵ء میں رحلت کی تو ان کے بعد میر محبوب علی خان مرحوم جلیل سے مشورہ کرنے لگے اور جب ۱۹۱۱ء میں خود ان کی رحلت کے بعد اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان نظام مفتی ان کے جانشین ہوئے، تو انھوں نے بھی جلیل کی شاگردی اختیار کی۔ اس عہد میں جلیل کو بہت عروج حاصل ہوا۔ قدر دان شاگرد نے جاہ و منصب کے لالچ سے

کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ جلیل نے یہیں حیدرآباد میں ۶ جنوری ۱۹۴۶ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

صدیق احمد اثر انھیں جلیل کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۲۲۵ اگست ۱۸۸۸ء (۴ ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور اس کی تکمیل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کی۔ یہ وہی زمانہ ہے، جب علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۵۳ء) میں وہاں طالب علم تھے، ان دونوں کا بار بار نہ بھی تھا۔ لکھنؤ سے فارغ ہوئے تو یہ بھی والد کے پاس حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں وکالت اور عدلیہ کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ (۱۹۱۱ء) ملا کچھ مدت پایگاہِ وقار الامراء میں عہدہ دارِ عدالت کے طور پر کام کیا؛ بعد کو ۱۹۱۵ء میں ریاست کی باقاعدہ ملازمت مل گئی اور منصف دیوانی مقرر ہوئے۔ بتدریج ترقی کر کے ناظم ضلع عدالت کے عہدے تک پہنچے اور بالآخر یہیں سے ۱۹۳۰ء میں وظیفہ حسن خدمت (پنشن) پر سکد و ش ہوئے۔ وظیفہ پانے کے بعد حضور نظام نے اول ہتم توشہ خانہ مقرر کیا، پھر محکمہ صرف خاص (برہروی پرس) میں منصف بنادیا۔ وہاں کی میعاد پوری کرنے کے بعد بھی فراغت اور فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔ چونکہ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور اب کوئی دفتری ذمہ داری حائل نہیں رہی تھی، اس زمانے میں انھوں نے ایک گلدستہ فصاحت "زمانہ جاری کیا۔ اس میں شاہ میر عہد کا کلام شائع ہوتا تھا۔

جلیل کے انتقال (۱۹۴۶ء) کے بعد حضور نظام میر عثمان علی خان مرحوم اپنی وفات (۲۴ فروری ۱۹۶۷ء) تک اثر سے مشورہ سخن بھی کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے کلام کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کی نگرانی بھی ان کے سپرد کر دی تھی اور اس سلسلے میں احکام بھی جاری ہو گئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد نظام ٹرسٹ قائم ہوا، تو محترم جاہ بہادر نواب میر برکت علی خان بالقابہ نے اثر کو ادبی ٹرسٹ کا صدر نامزد کر دیا۔ چنانچہ نظام ہتم مرحوم کا کلام مرتب ہو گیا اور اب شاید زیر طباعت ہے۔

وفات سے قبل دونوں آنکھوں میں بو تیا بند تر آیا تھا، جس کا آپریشن نہیں ہو سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ بنیائی بالکل زائل ہو گئی۔ اس کا اثر ان کے دماغ پر بڑا اور تو اذن قائم نہ رہا؛ سوچھ بوجھ مطلق نہیں تھی۔ دماغ کا علاج آخر وقت تک جاری رہا۔ اسی حالت میں اپنے مکان جلیل منزل، حیدر آباد میں بیٹھنے کے دن ۲۷ اپریل ۱۹۷۴ء (۲ ربیع الثانی ۱۴۰۲) فجر سے پہلے چار بجے انتقال کیا، ۷۷ برس کی عمر پائی۔

خطہ صالحین (نام پٹی، حیدر آباد) میں سپرد خاک ہوئے یہ سرکاری قبرستان ہے۔ اعلیٰ حضرت بیہ عثمان علی خان مرحوم کے عہد میں یہ قبرستان مخصوص بزرگ شخصیتوں اور عمائد سلطنت کے دفن کرنے کو استعمال ہوتا تھا، اب یہ بھی نظام چیرٹی ٹرسٹ کی نگرانی میں ہے۔ ان کے والد حضرت جلیل بھی اسی قبرستان میں آسودہ خواب ہیں۔

کتبہ مزار کے لیے ان کے برادر خرد جناب علی احمد جلیلی نے عیسوی میں تاریخ کہی: وہ جو تھے صدیق احمد خوش سیر کر گئے اس دار فانی سے سفر
 باے بسم اللہ سے مصرع ملا فاتحہ پڑھو اثر کی قبر پر

(۶۱۹۷۲ = ۱۹۷۴ء)

مرحوم صاحب فن تھے جلیل کی قدرت کلام اداجہارت فن ان کے متعدد نظم و نثر کے مجموعوں سے عیاں ہے۔ اثر اپنے والد کے شاگرد اور متبع تھے۔ انھیں کی طرح رموز و اشعار اور کلمات عروض گویا ان کی گھٹی میں پڑے تھے جلیل کی ذفات کے بعد ان کے اکثر تلامذہ نے اثر سے رجوع کیا۔ اثر کا ضخیم دیوان ان کی زندگی میں مرتب ہو چکا تھا، لیکن انھوں نے کہ آج تک اس کے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں، جو ان کے برادر خرد جناب علی احمد جلیلی نے عنایت فرمائے ہیں:

جان دیتا ہوں میں اس پر کہ مجھے یاد کیا	صل منظور ہو یا قتل نہیں اس سے غرض
بال دہر باندھ کے صیاد نے آذا کیا	اس سے ظاہر ہے کہ ہے شاق جدائی میری
مجھ کو رسوا صفت نہ کہتے یاد کیا	تیرے دامن کی ہوا بھی کہ صبا کے جھونکے
ہجوم حسرت درنخ دالم میں دل نہیں ملتا	وہ دل لینے کو آئے ہیں، مگر طرفہ تماشا ہے
وہ چپ یوں ہو کہ کوئی بات کے قابل نہیں	تیری تصویر کا رازِ خموشی کیا کوئی جانے!

کہاں کھویا کہاں بھولا، خدا جانے کہاں چھوٹا
اثر! اشعار تیرے سن کے اہل ذوق کہتے ہیں
تھے کوچے میں کب سے ڈھونڈتا ہوں، دل نہیں ملتا
غنیمت ہے یہ ناقص! جب کوئی کامل نہیں ملتا
وہ ہے میری داستانِ دردِ دل
سن رہے تھے جو بیانِ دردِ دل
جو میکدے میں ہے ڈوبا ہوا شراب میں ہے
کہ آئینہ بھی وہاں آج کل عتاب میں ہے
جو میکدے میں ہے عالم، وہی شباب میں ہے
آہ کی چنگاریاں شمعِ شبتاں بن گئیں
پاس میں وہ چند بوندیں آبِ حیاں ہو گئیں
کیا رنگ پہ جو بن ہے عروسانِ چمن کا
ساغر ہو عنایت کوئی صہبائے کہن کا
ہر طرف خندہ گل، خندہ پیمانہ ہے
گل کا بلبل، نہ کسی شمع کا پردانہ ہے
کے تھے اب تو قرارِ ازلے دلِ ناشاد آیا
ہو گیا دل جو نشاندہ، تو جگر یاد آیا
پیشوئی کے لیے ناوکِ جلا د آیا
میں ہوش میں کب ساقی بیگنا نہ نہیں ہوتا!
پردے سے عیاں رہے جانانہ نہیں ہوتا
ففس آباد، ویراں آشتیاں ہے
اندھیرے میں رواں یہ کارواں ہے
زمین نیچے ہے، اوپر آسمان ہے
یہ تہلا دو، مری منزل کہاں ہے
جہیں اس کی ہے، سنگِ آستاں ہے

حشر کا ہنگامہ کہتے ہیں جسے
ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آگے
نہ چھو سیلگی جہنم کی آگِ مندوں کو
پھر ایسے دیکھنے والوں سے تنگ آئے ہیں
ادائیں مست، نظر مست، چال میں مستی
دل جلیوں سے بڑھ گئی رونقِ تھادی بزم کی
تھی نوراسی نے، مگر تیرے کرم سے ساقیا!
کہتا ہے یہ اندازِ گل و سرو و سخن کا
دیرینہ گدائے درمیانہ ہوں، ساقی!
موسمِ گل میں چمنِ مکرشِ میخانہ ہے
وہی اچھا ہے جو ہے بزم و چمن میں آزاد
دی صدا آہ نے، جب ناوکِ جلا د آیا
اور اک تیر یہ کہ کر مجھے اس نے مارا
کیا تو وضع ہے جو ہم کو چہ قاتل کو چیلے
جامِ و خمِ دینا سے ہر دم ہے مشنا ساقی
کرتا ہے دو عالم میں وہ حشر بیا، لیکن
ترا بھی دور کیا، اے باغباں ہے
خیالِ زلف میں بہتے ہیں آنسو
کہاں پہنچی ہے، مشتِ خاک اُر کر
میر منزل پہنچ کر پوچھتا ہوں
چمک اٹھیں اب قسمتِ اثر کی

مے پائے نگہ مست ، رہیں ہم ہشیار
 طرف اتنا ترے قربان کہاں سے لائیں !
 مان لی بات اُن کی دھوکا ہو گیا
 مہفت میں خونِ تمنا ہو گیا
 حشر کا دن بھی بڑے خوف کا دن ہے ، لیکن

منہ دکھانا نہ ، الہی ! شبِ تنہائی کا
 حوصلہ دل کا ، نہ دل سے نہ جگر سے نکلا
 اشک بن بن کے مرے دیدہ تر سے نکلا
 پھاڑنا جیب و گریباں کا بہاؤ آنے پر
 عاشقوں کا یہ طریقہ گل تر سے نکلا
 اتنی نسبت مری بخشش کو بہت کافی ہے
 تیرا بندہ ہوں ، ترا نام بیا کرتا ہوں

حضرتیمہی، مولانجش

کسی زمانے میں چیئوٹ، ضلع جھنگ (پاکستان) میں قصا بوں کی برادری بڑی با اثر اور متمول تھی، شاید اب بھی ہو۔ مولانجش اسی خاندان کے نور نظر تھے۔ چنانچہ وہ بھی کبھی الاراہِ تفنن کہا کرتے تھے۔

دلقِ دودمانِ قصا بیم

اگرچہ سرکاری اسادا اور کاغذات میں ان کی تاریخِ ولادت ۱۱ مارچ ۱۹۰۹ء درج ہے لیکن دراصل یہ یکم جنوری ۱۹۰۸ء تھی۔ خود لکھتے ہیں:

تاریخِ پیدائش (دروغہ برگردنِ لادای) یکم جنوری ۱۹۰۸ء ہے۔ باری پیدائش کے اعزاز اور احترام میں اس روز نہ سبھی اور پاری دنیا میں تعطیل منائی جاتی ہے۔ (شعراے پنجاب ۲۵۰)

ابتدائی تعلیم اپنے وطن چیئوٹ میں پائی۔ انٹر کا امتحان گورنمنٹ کالج، لائل پور میں فیصل آباد اور بی اے کا امتحان کالج لاہور سے پاس کیا۔ چونکہ طبیعت میں شعر و ادب کا مذاق تھا، اس کے بعد لاہور کے مختلف روزناموں اور ماہانہ پرچوں میں لکھنے لگے۔ چنانچہ اس زمانے میں انھوں نے روزنامہ احمد اور حریت (۱۹۲۹ء - ۱۹۳۱ء) اور اختر شیرانی مرحوم کے ماہانہ رسالوں خیالستان اور دومان میں کام کیا (۱۹۳۱ء - ۱۹۳۳ء) اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں ایم اے (فارسی) کا سند پرائیویٹ طور پر حاصل کیا۔ اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی میں شام کے وقت قالون (لا) کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا، تاکہ دفتر دن کے ملازم وغیرہ اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر قالون کے درجوں کی تعلیم

جمل کر سکیں۔ (خود میں نے وہاں سے ۱۹۳۳ء میں اسی طرح ایل ایل پی کا امتحان پاس کیا تھا) مولابخش نے بھی اسی سے فائدہ اٹھایا اور یوں ایم اے، ایل ایل بی ہو گئے۔ اب انھوں نے چیونٹ میں وکالت شروع کر دی۔ اور رفتہ رفتہ زیادہ تر اپنی برادری کی پشت پناہی اور اثر و رسوخ سے، اور کچھ اپنی محنت اور ریاض کی بدولت، ان کا وہاں کے اچھے وکیلوں میں شمار ہونے لگا۔

چیونٹ کے اسی قیام کے دوران میں انھوں نے اپنا ذاتی ہفتہ وار پرچہ "جہاں نما" جاری کیا تھا۔ وکالت اور ادبی پرچے کی ادارت، دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ چنانچہ سال بھر کے اندر پرچہ بند کرنا پڑا۔ لیکن ہے یہ کہ درحقیقت کسی مرحلے پر بھی وکالت انھیں راس نہیں آئی۔ شاید چیونٹ کا دیہاتی ماحول بھی سبب رہا ہوگا۔ کچھ ہو، ۱۹۳۶ء میں وہ گورنمنٹ کالج، دھرمسالہ میں اردو فارسی کے مدرس مقرر ہو گئے۔ شکل

سے سال بھر وہاں گزارا ہوگا کہ مستعفی ہو کر اب کے لاہور میں وکالت شروع کر دی یہاں لاہور میں حکومت وقت اور ریڈیو نے ان کی صلاحیتوں کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ محکمہ دیہات سدھار و پنچایت نے انھیں اپنا تعلیمی افسر مقرر کر دیا۔ اس میں جہاں انھیں پنجاب کے دیہاتی علاقے کی خاک چھاننا اور تقریر بازی کرنا پڑی، وہیں محکمے کے انجمن پنچایت کی ادارت بھی ان کے سپرد ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ چراغ حسن حیرت (دف: جون ۱۹۵۵ء) کے ہفتہ وار "شیرازہ" اور مجید لاہوری (دف: جون ۱۹۵۷ء) کے "ننگران" میں مزاحیہ مضامین اور نظمیں بھی لکھتے رہے۔ سیاسی نوعیت کے مضامین "قلمبر" کے قلمی نام سے "روزنامہ" "نوائے وقت" میں لکھے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۶ء تک رہا۔ اسی دوران میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک وہ جُز قسٹی طور پر یونیورسٹی کالج، لاہور میں لیکچرر بھی رہے۔

آخر میں سب طرف سے فارغ ہو کر پھر لاہور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی تھی اور اچھے وکیلوں اور قانون دانوں میں گنے جاتے تھے۔

اپریل ۱۹۷۶ء لاہور میں انتقال ہوا۔

ادب اور موسیقی گویا ان کی گھٹی میں پڑے تھے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ وہ طالب علمی کے زمانے میں بھی طبلہ بجانے میں لاہور آئے چوٹی کے طبلہ نوازوں میں سے تھے؛ نیز فن اکھوں نے سبقاً سبقاً اساتذہ وقت سے سیکھا تھا۔ شعر میں زیادہ توجہ طنز و مزاح اور سپردی پر مبذول رہی، اگرچہ سنجیدہ کلام بھی مقدار میں کچھ کم نہیں ہے۔ انھیں مکالمہ لکھنے میں خاص مہارت تھی۔

اسی انداز کی ایک نظم "منظرہ سازنگی و طبلہ" ملاحظہ ہو، جس میں چودھری خوشی محمد ناظر کی نظم "جوگی" دُشاعر کا اثر نمایاں ہے؛ بحر بھی وہی ہے:

دنیا بھر کے بسفکر دں نے کل بزم سرور سجائی تھی

کیا دل کو مسلتا تھا طبلہ، کیا سازنگی رنگ لائی تھی
بسل کی رگ جان منتی تھیں، طاؤس کی تاریں لرزش سے

چائے کا پیالہ دہریں تھا، حق نے دھوم مچائی تھی
زندوں نے جھنڈے گاڑے تھے، زہاد نے دیرے الے تھے

اس دیر و حرم کی محفل میں، موسیقی گانے آئی تھی
یاں شکوے سے پُر سازنگی، داں بیچ و تاب میں تھا طبلہ

گزر بھر کی زباں یاں چلتی تھی، واں ہاتھوں کی بن آئی تھی
داں ننھا پکے ارگر جتے تھے، نغموں کی پُھہاریں پڑتی تھیں

یاں ہر دل پر موسیقی کے گہرے نے قنات لگائی تھی
اڑتی تھیں فضا بھر میں تباہیں، تھی چال صبا کی مستانہ

اس حال میں بیچ میں دونوں کے جا بیٹھا شاعر مستانہ

سازنگی بولی طبلے سے، تم یونہی شور مچاتے ہو

بے منہ پھٹ طبلے دیوانے اکیوں کان مارے کھاتے ہو

آواز تمھاری کوئے سدا در شکل چھلاوے سی تیری

ان میٹھی میٹھی تانوں سے، تم رنگ میں بھگ لاتے ہو

لعنت ہے تمہارے جینے پر، آرام نہیں عزت بھی نہیں
 میں گو دوں بھی ملتی ہوں، تم سراپا پٹواتے ہو
 ہے خام ابھی تک عشق ترا، کچھ صبر نہیں کچھ تاب نہیں
 یاں تان اڑی اک سٹھی سی، داں تمہام کے دل جاتے ہو
 میں راج دلارئ اسیل ناری ہوں، پریم کنھیا ہوں
 تم ہونڈی کاٹے مردک ہو، ہر جا پردھکے کھاتے ہو
 تہذیب تمہیں منظور نہیں، اور عقل ترا دستور نہیں
 تم بھیم کی تالوں میں باہر کیوں آپے سے ہوجاتے ہو
 نازوں سے پلی شہزادی ہوں، مینا ری محلوں والی ہوں
 تم جس ددام کے قیدی ہو، ضد و قووں میں ٹٹ جاتے ہو
 جب سازنگی نے طبلے سے یوں دیشکنی کا کلام کیا
 کچھ دیر تو وہ خاموش رہا، پھر بھابی جاں کو سلام کیا
 یوں کہنے لگا سازنگی سے: جلتی پر تیل گھراتی ہو
 ہم رنج دالم کے مارے ہیں، تم اکرا درستانی ہو
 عشاق سے یوں منہ پھیرا کیوں، پھر تو نے ہمیں گھیرا کیوں؟
 رہنے دداسے چپ، مجبوراً کیوں میری زباں کھلواتی ہو
 میں زنجیبار کا شہزادہ، میدان میں آکر ضیغم سا
 جب ایک دھاڑ لگا تا ہوں، تم پردوں میں ڈجاتی ہو
 پیمانِ وفا جس سے باندھوں میں پاس اسی کے رہتا ہوں
 تم ہر جانی ہو، ہر اک کے پہلو میں دل بہلاتی ہو
 کچھ لطف ہے سبکد کوئی میں، سر پھوٹنے میں ہم مستوں کو
 بی! یہ تو عشق کے زیور ہیں، تم یونہی ہمیں بناتی ہو
 عزت پہ ہماری حرف زنی، اللہ غنی، اللہ غنی

وہ وقت بڑی بی بھول گئیں، جب ان اپنے کچھواتی ہو
 تو پریم کنھیا، محفل میں کس بیباکی سے گاتی ہے
 گویاں تم بھولی بھالی ہو، کچھ کہتے بھی شرماتی ہو
 میں تیری شمیمِ نغمہ کو، مانندِ نسیم اڑاتا ہوں
 یہ میری تھاپ کی برکت ہے، دل بزم میں مسلے جاتی ہو
 جب لڑکے مل کر گاتے ہیں، عرفان کی تانیں اڑاتے ہیں
 ہاتھوں سے میز بجاتے ہیں، تم یاد کب ان کو آتی ہو!
 میں آذِ عشق کی تابش سے دل محفل کے گرماتا ہوں
 طاؤس کو، طبنورے کو، تجھے دن میں تارے دکھاتا ہوں
 یہ سن کر شمس الدین ڈرے، تلوارِ مبادا جل جائے
 اور طبلہ سسکتا رہ جائے، سازنگی روتی رہ جائے
 چمکارے سازنگی سے: تم سیدھی سادی بھولی ہو
 زیبا نہیں، مگر منہ میں ترے گنواروں کی سی بولی ہو
 طبلے کے دکیلِ مطلق نے، داں ہاتھ سے اس کو سمجھایا
 اچھا نہیں، خوں کی ہنردوں سے مگر محفل بھر میں بولی ہو
 تم زرخیار کے شہزادے، سازنگی، سازنگی ٹھہری
 پھبتی نہیں، مگر شہزادوں کی ایسی بولی ٹھولی ہو
 خاموش ہوئیں بی سازنگی، اور طبلہ صم بکم تھا
 یوں جیسے کسی نے زباں، اپنی آبِ کوثر میں دھولی ہو
 القصۃ بچھڑے دستِ ملے، نہ جھگڑا تھا، نہ شکوہ تھا
 نے تن تنائن، تن تن تھی، نے تاکر تاکر دھیا تھا۔

۵۔ اس زمانے میں لاہور کا مشہور طبلہ بجانے والا تھا۔

نثار اٹاوی، نثار حسین

یکم مارچ ۱۹۱۴ء کو اٹاویہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ادا حسین صاحب عطر فریش تھے، اٹاویہ کے محلہ مقصود پورہ میں ان کی دکان تھی۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہے۔ کیٹی کے جبر میں ان کے نام کے ساتھ ولدیت کے خانے میں کچھ راج (عرف پچھو) لکھا ہے۔ یوں خیال ہوتا ہے کہ کوئی اُن پر بھڑکتی عورت اندراج کرنے لگی، اسے ان کے والد کا نام معلوم نہیں تھا، اس نے ماں کا نام لکھوا دیا۔ مڈل کلاس بعد خود نثار صاحب نے اس کی اصلاح کریں۔

ابتدائی تعلیم انجمن ہدایت الاسلام جوئیر ہائی اسکول میں پائی۔ آٹھویں درجے تک یہاں پڑھے۔ اس کے بعد چونکہ حالات کی عدم موافقت کے باعث مزید تعلیم ممکن نہیں تھی، اس لیے اسکول ہی میں بارہ ویسے مشاہیر پر مدرسہ قبول کر لی۔ اسی زمانے میں انھوں نے شعر کہنا شروع کیا اور اسکول کے میڈیما سٹر شیدا اٹاوی سے اصلاح لینے لگے۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں مقامی اسلامیہ اسکول (حال انٹر کالج) میں ایک کل ہند مشاعرہ ہوا تھا۔ حضرت سیاب اکبر آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) بھی اس میں مدعو تھے۔ نثار نے بھی غزل پڑھی۔ سیاب مرحوم اسے سن کر چونکے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ شیدا کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے نثار کو جوہر قابل پا کر انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اس کے بعد یہ آخر تک سیاب کے حلقہ تلامذہ میں شامل رہے۔ استاد نے بھی ان کی تہذیب تربیت میں کوئی دقیقہ فرو کر اشت نہیں کیا۔ ان کا شمار سیاب کے ممتاز فارغ الاصلاح شاگردوں میں ہوتا تھا۔

اس واقعے کے تھوڑے ہی دن بعد وہ نوکری سے الگ ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ ان کے پاس ٹرننگ کی سند نہیں تھی، اس لیے جب اسکول کا سالانہ معائنہ ہوا تو سرکل انسپکٹر مدراس نے یہ بات اپنی رپورٹ میں درج کر دی۔ اس سے اسکول کی آمدنی رقم میں تخفیف ہو جاتی۔ لہذا اسکول والوں نے انھیں نوکری سے برخواست کر دیا۔ اب یہ پریشان حال تھے۔ بارے بیدم شاہ دادی نے کچھ سہارا دیا۔ وہ خود مفلوکلحال تھے، کتنی مدد دے سکتے تھے! بہر حال اس سے سرچھپانے کا آسرا ہو گیا۔ اس زمانے میں انھوں نے کچھ رقم حاصل کرنے کے لیے ایک ڈراما "سوداگر بچہ" لکھا اور اسے بیس روپے میں فروخت کر دیا۔ اس سے انھیں کچھ جرأت ہوئی اور انھوں نے ایک طویل نظم "سیر پرستان" کہی اس میں بازا حسن اور اس کے مکینوں اور اس سے وابستہ لوگوں کا طنز یہ انداز میں خاکا اڑایا گیا ہے۔ اس پر شہر کی طوائفوں نے بہت شگامہ برپا کیا، جس سے واقع ہے کہ نثار صاحب کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں انھیں کچھ عشق مجازی کا بھی تجربہ ہوا۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں اگرچہ میں پورا واقعہ جانتا ہوں، ان کے اس زمانے کے کلام میں اس کے نام تک کی تلمیحات موجود ہیں۔ بہر حال یہ طوفان بحیرہ رنجی گزر گیا، بعد کے زمانے میں وہ اس پر تعجب کیا کرتے تھے۔

بیدم دادی صاحب ان کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ ان کی دساطت سے بدھونہ تحصیل میں زانڈا میں کی جگہ پر تقرر ہو گیا۔ لیکن چونکہ اس اسامی کے لیے کچھ ذریعہ نقد بطور ضمانت جمع کرانا پڑتا ہے، اور اسی کا انتظام نہ ہو سکا، وہ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس کے بعد بیدم صاحب کی سفارش کی اور انھیں دوبارہ اپنے اسی پرانے انجمن ہدایت الاسلام اسکول میں عارضی جگہ مل گئی۔ اٹامہ کا اسلامیہ ہائی اسکول اپنے زمانے میں بہت مشہور تھا۔ اس کے فارغ التحصیل طلبہ میں بعض مشاہیر کے نام ہیں (ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند بھی ان میں سے تھے) یہاں کے ہڈاگر جاب الطاف حسین مرحوم، خدا بخش، بڑی خوبیوں کے فرشتہ صفت بزرگ تھے۔

انہوں نے نثار کی بے بسی کا اندازہ لگایا کہ اگر انھیں سہارا نہ ملا تو یسے بادبان کی کشتی کی طرح طوفان مصائب کا شکار ہو جائینگے۔ انہوں نے دستگیری کی اور انھیں اپنے اسکول میں جگہ دے دی۔ یہ گویا ان کے لیے شاہراہ ترقی پر پہلا قدم تھا۔ یہیں سے انہوں نے ملازمت کے دوران میں یکے بعد دیگرے انٹر، ادبی اے، اور ایم اے (اردو) کے امتحان ناگپور یونیورسٹی سے پاس کیے۔ اسکول کے زمانے میں بھی وہ اردو کے صدر مدرس رہے اور جب یہ ترقی کر کے انٹر کالج بنا، تو صدر شعبہ اردو مقرر ہو گئے۔ اپنی ذنات تک وہ اسی عہدے پر قائم رہے۔

انہوں نے ۶ مئی ۱۹۷۲ء کو گلے کے کینسر سے انتقال کیا۔ ایک مرحلے پر ان کے کالج کے رفیقوں اور دوستوں نے چندہ جمع کر کے ان کے علاج کی پیشکش کی، لیکن مرحوم نے اسے قبول نہ کیا۔ کہا: یہ مرض لاعلاج ہے صحت تو مجھے اب نصیب ہو نہیں سکتی، آپ حضرات کیوں اپنے گاڑھے پسینے کی کماچی برباد کریں! ڈیڑھ برس بیمار رہے اور آخر اسی میں جان بحق ہو گئے۔ انہوں نے دذکاح کیے تھے پہلی بیوی موضع بلہور کی تھیں۔ ان سے ایک لڑکا ہوا۔ لیکن نہ معلوم کس بات پر اختلاف ہو گیا اور انہوں نے اس بیگم سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے بعد دوسرا نکاح ۱۹۴۴ء میں جالون کے ایک معز نگہرانے میں ہوا۔ اس سے چھ بچے ہوئے: چار بیٹیاں اور دو بیٹے۔ ان میں سے صرف بڑی بیٹی (رافعہ) کی شادی اپنی زندگی میں کر سکے تھے۔ یہ بیگم اور ان کی اولاد ماشاء اللہ اداہ میں موجود ہے۔

اگرچہ نثار صاحب نے شاعری ۱۹۳۰ء میں شروع کی تھی، لیکن ان کا اصل دور شعر گوئی سیلاب کے تلمذ کے بعد شروع ہوا۔ اب تک وہ صرف غزل کہتے تھے، اس کے بعد استاد کے کہنے پر انہوں نے نظم پر بھی توجہ کی۔ ہندی بھی اچھی جانتے تھے انہوں نے ۱۹۳۵ء میں ہندی کا "دیش یوگیتا" امتحان پاس کیا تھا (اس لیے انہوں نے اردو میں ہندی نپگل کے تجربے کیے۔ ان کا ایک مجموعہ ہندی میں "دھرتی میرے پیار کی" شائع ہو چکا ہے۔ مدت لمبی، اردو کلام کا ایک مختصر انتخاب "ماہ دا نجم" کے عنوان سے شائع ہوا تھا (دئی ۱۹۵۲) یقیناً بہت کلام غیر مطبوعہ رہ گیا ہوگا۔ کسی زمانے میں کلام

بڑے دلکش انداز میں پڑھا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ پہلا انداز رخصت ہو گیا، جلد تھک جاتے تھے کسے معلوم تھا کہ یہ کچلے کے کنیسر کا آغاز ہے۔

کلام نچیتہ اور فنی پہلو سے بے عیب ہے، اور بجا طور پر وہ سیما ب کے ارشد تلامذہ میں گنے جاتے تھے۔ نمونے کے پسند شعور مل نظر ہوں!

کس گوشہ ظلمت میں ہاں ہے دنیا ہے بھی کہ فقط وہم و گماں ہے دنیا
پیمانے میں تھوڑی سی جگہ ہے اب بھی لانا تو زرا کوئی، کہاں ہے دنیا
ذہاد کی تسبیح ریا چھوٹ پڑی آنکھوں سے امیدوں کی کرن پھوٹ پڑی
گھونگھٹ سے جو مسکرا کے جھانکا اس نے آکاش سے شرما کے دھماک ٹوٹ پڑی
سوچتے ہیں سر منزل، یہ معما کیا ہے! جس سے گزرتے تھے، اسی راہگزار تک پہنچے
جو لوگ یہاں کچھ کرنے سکے، دیکھینگے وہاں کیا کرتے ہیں

امروز یہ جن کا زور نہیں، اندیشہ فردا کرتے ہیں
ناہید و قمر نے راتوں کے ماحول کو روشن کر تو دیا
وہ دیپ کسی سے جل نہ سکے جو دل میں اجالا کرتے ہیں

بادہ عشق کو ہے ہمت شرط ہاتھ اگر کانپتا ہو، جام نہ لے
شوق کتنے فریب دیتا ہے مسکرا کر ہمارا نام نہ لے
یہ بھی سچا کہ درد نہ ترا کر سکے تلاش یہ بھی ہوا کہ ہم ترے در سے گزر گئے
محبط کا سکیں نہ عقل کی منزل فریبیاں گمراہ بن کے راہگزار سے گزر گئے
مائے سماں عرش پہ پہنچے تو تھے، مگر بچ کر زرا مقام اثر سے گزر گئے
رگ رگ میں ہے سرورِ محبت کا انبساط اب تم حدودِ قلب و نظر سے گزر گئے
آنکھوں سے دل کا کام نہ لینا تھا، اے کلم جلوے تڑپ کے دامِ نظر سے گزر گئے
ہر لمحہ بڑھ رہی ہیں مرے دل کی دھڑکن جیسے ابھی ابھی وہ ادھر سے گزر گئے
حریف جاں سہی وہ، لیکن اس کا کیا کرے کوئی کہ اس کی دشمنی بھی دوستی معلوم ہوتی ہے
مٹا ہے دل کو تیری گلی میں سکون سا کیا اس زمین پر فلک بیلگوں نہیں!

اے عقل! ساتھ رہ کہ پڑ گیا تجھی سے کام
بجھ کو انشا! از غم نظر نے کیا خراب
ہمیں بدل گئے ہیں کچھ، کہ گلستان بدل گیا
بلوے تو ہر قدم پہ کیا رکے کہ یوں نہیں

موجِ تخیل، گل کا تبسم، پر تو شبنم، بھلی کا سایہ
دھوکا ہے دھوکا عہدِ جوانی، اس کو جوانی کوئی نہ سمجھے
اُن کی بھی قسمت، میری بھی قسمت، دونوں میں لیکن کتنا افتاد
ان کے اشارے دنیا سمجھے، میری کہانی کوئی نہ سمجھے
مانا یہ ہم نے دنیا ہے فانی، فانی سمجھنا ہے نادانی
جینے کی دل میں گر ہو تمنا، دنیا کو فانی کوئی نہ سمجھے

دامن تو یہ رہا، مگر اے موسمِ بہار! میں سوچتا یہ ہوں کہ مری آستیں بھی تھی
زندگی کی بائے، وہ راتیں بھی کیا راتیں ہوئیں

ان سے جب چھپ چھپ کے کوٹھے پر ملاقاتیں ہوئیں
لگ گئی جب چپ، تو گھنٹوں بت بنے بیٹھے رہے

چھڑ گئیں باتیں، تو پھر دود پر باتیں ہوئیں
یاد ہے اب تک وہ ملتے کا پسینا، یاد ہے

ان سے جب پہلے پہل میری ملاقاتیں ہوئیں
وہ گئے وہ اپنے دانتوں میں دوڑا داب کر

آنکھوں آنکھوں میں 'خدا معلوم' کیا باتیں ہوئیں
ایک عجیبی آسمان پر ایک بجلی گود میں

زندگی میں بار بار ایسی بھی برساتیں ہوئیں
انے اشارہ! اب تک مرا ہر سانس ہے ہکا بکا ہوا
مذقوں اس لطف کے سایے میں برساتیں ہوئیں

ہم کو بھی دیوانگی بھاتی نہیں، پر کیا کریں ہاتھ اگر آجائیں خود اٹھ کر گریبانوں کے پاس
 پھر دے گیا فریب تسلی کوئی مجھے اب صبر آچکا مجھے، موت آچکی مجھے
 تمیزِ شمع دیرِ چراغِ حرم نہیں پروانہ ہوں، نہیں بھی لمے روشنی مجھے
 صبح بچھڑ کر شام کا وعدہ، شام کا ہونا سہل نہیں
 ان کی تمنا پھر کر لینا، صبح کو پہلے شام کر دو
 موسمِ گل ہے، بادل چھائے، کفناک رہے ہیں پیمانے
 کیسی توبہ! توبہ توبہ! توبہ نذرِ جام کر دو
 پوچھا کسی نے اے نثار! مقصدِ شاعری ہے کیا؟
 میں نے کہا حضورِ دستِ ایک طریقِ التماس

امجد (محمد امجد) عبدالمجید

۲۹ جون ۱۹۱۲ء کو پنجاب (پاکستان) کے شہر جھنگ لگھیانہ میں پیدا ہوئے۔ جب ان کے والد میاں علی محمد نے دوسری شادی کر لی، تو عبدالمجید کی والدہ اپنے کسب بیٹے کو ساتھ لے کر میکے چلی گئیں۔ ان کے نانا میاں نور محمد فارسی عربی کے عالم تھے۔ انھیں انگریزی میں ان کی تعلیم شروع ہوئی۔ فارسی عربی کے علاوہ کچھ طب بھی پڑھی۔ اس کے بعد فارسی تعلیم شروع ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں مقامی اسلامیہ ہائی اسکول سے دسویں کی سند لی۔ پھر گورنمنٹ انسٹرکٹ کالج، جھنگ میں داخلہ لیا، اور یہاں سے ۱۹۳۲ء میں انسٹرکٹ امتحان پاس کر کے لاہور چلے آئے۔ ۱۹۳۴ء میں اسلامیہ کالج، لاہور سے بی اے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کب رونا گار کا مسئلہ پیش آیا، تو سب سے پہلے ایک قانون گو صاحب کی زیر نگرانی اسے دہلی کے دہلی گان کی فہرٹس بنانے کا کام ملا۔ جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی روش سے انتخاب کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ یہ کام عارضی تھا، اور چند مہینوں میں مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ایمپائر آف انڈیا انشورنس کمپنی کے ایجنٹ بن گئے۔ لیکن اس کام کے لیے جس محنت مشقت کی ضرورت ہے، وہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس میں متواتر سفر ناکزیر تھا۔ صبح کہیں، شام کہیں، غرض سال بھر کے اندر اندر وہ آٹھ مہینے سے دست بردار ہو گئے۔

لکھنے پڑھنے کی عادت شروع سے تھی اور جھنگ کے ادبی حلقوں میں بھی وہ غیر معروف نہیں تھے۔ اسی زمانے میں وہاں ایک نیم سرکاری رسالہ "غرض" جاری ہوا۔ اصحاب مجاز

کی نظر امجد صاحب پر پڑی اور وہ اس کے مدیر مقرر ہو گئے۔ یہاں تقریباً دس برس
۱۹۴۵ء تک رہے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ حکومت وقت کسی تحریر پر "عروج"
سے ناراض ہو گئی؛ نذر ردائی عضو ضعیف پر گرا، اور مجید امجد کو نوکری سے جواب
مل گیا۔

صحافت کے اس تلخ تجربے کے بعد وہ ڈسٹرکٹ بورڈ، جھنگ میں بطور لکچرار ملازم ہو
گئے۔ یہ تعلق چار برس تک رہا۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان کے محکمہ خوراک (فوڈ ڈپارٹمنٹ)
میں جگہ مل گئی۔ وہ ملازمت کے اختتام تک اسی محکمے سے وابستہ رہے؛ اور ۱۹۷۲ء میں
اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

ان کی زندگی کے آخری ۲۷-۲۸ سال ساہیوال (سابقاً منٹگری) میں بسر ہوئے۔ ملازمت کے
اختتام کے بعد بھی انھوں نے یہاں کی سکونت ترک نہیں کی۔ ان کے والد کی دوسری شادی سے
خاندان کا شیرازہ تو بکھرا ہی تھا، مجید امجد کی زندگی شفقت پوری کے فقدان کے باعث
مخروبی اور تلخی کا نمونہ بن گئی۔ بد قسمتی سے ان کی اپنی ازدواجی زندگی بھی بالکل ناکام
رہی۔ ان کی شادی اپنے اہوں کی بیٹی سے ہوئی تھی لیکن نبھ نہ سکی، اور وہ (طلاق
لیے بغیر) ان سے الگ رہنے لگیں۔ ان سے کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ وہ محکمہ تعلیم میں
لازم تھیں اور کسی ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری سے ریٹائر ہوئیں؛ آخری زمانے میں ان کی
بنیائی بالکل ضائع ہو گئی تھی۔

مجید امجد بالکل اکیلے رہتے تھے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور بڑی تنگی ترشی سے
گزر بسر ہوتی تھی۔ ایسے جانگزا حالات میں بھی انھوں نے اپنی خودداری کی حفاظت کی،
اور کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ جو روکھی سوکھی میسر آگئی، صبر شکر سے
اسی پر گزارا کیا۔ آخر ان کے بعض دوستوں کے توجہ دلانے پر حکومت پاکستان نے مایچ
۱۹۷۴ء میں ان کا پانچ سو روپے ماہانہ ادبی وظیفہ مقرر کر دیا، لیکن اب سفینہ کنارے
آگیا تھا۔ دہہینے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ حادثہ بھی بڑے المناک حالات میں
ہوا۔

ان کے ساتھ ان کی ملازمت کے زمانے کا ایک پرانا چیراسی (علی محمد) دہتا تھا۔ وہ بازار سے سودا سلفے آتا اور وقت بوقت ان کا چھوٹا موٹا کام بھی کر دیتا۔ صبح جب وہ اپنے کام پر جاتا، تو مجید امجد کی ہدایت کے مطابق باہر سے تالا ڈال دیتا اور واپسی پر اسے کھول دیتا۔ ۱۱ مئی ۱۹۷۴ء کو بھی یہی ہوا۔ ۹ بجے صبح تالا بند کر کے وہ چلا گیا۔ لیکن جب دو بجے واپس آیا، تو اسے ان کی جگہ امجد کی لاش زمین پر پڑی ملی۔ لاش جھنگ گئی اور اگلے دن (۱۲ مئی) وہیں سپرد خاک ہوئی۔

زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ زندگی میں تو کسی نے یہ تک نہ پوچھا کہ کہو بھی، کیسے بسر ہو رہی ہے؟ مرنے کے بعد ساہیوال کے مشہور باغ "کنعان پارک" اور "ساہیوال ہال" کا نام بدل کر علی الترتیب "امجد پارک" اور "امجد ہال" رکھ دیا گیا۔ ہائے، اس زور و پشیمان کا پشیمان ہونا۔ کسریٰ منہاس نے قطعہ "تاریخ وفات" کہا:

موت برحق ہے، مگر اک جو ہر قابل کی موت	دائے برحق، مجدا ہم سے مجید امجد ہوئے
کیسے کیسے دوست کسریٰ چل دیے منہ پھیر کر	دوستی کے جتنے دعوے تھے، وہ سارے دھوئے
چن لیا دستِ قضا نے ہر گل شاداب کو	زندگی پر اے فلک تیرے کرم بید ہوئے
عجز و انشادِ خلوص دے ریائی کے قصو	ایک شخص ایسا تھا، جس سے عمر بھر نڈ ہوئے
نغمہ جس کا ہر نفس، ہر بات تھی سحرِ حلال	وہ نشانِ زندگی بھی زینتِ مرقد ہوئے
ایک روشن طبع تھا جس کی بدولت کتنے دوست	محفلِ شعروادب میں زینتِ مسند ہوئے
جس کے فن میں وقت کی لے، دل کی دھڑکن بگنی	اس کے گیتوں میں ڈھلے، جتنے بھی جرز و ہر ہوئے

عیسوی میں فرد نکلا مصرعِ سالِ وفات

"داخلِ باغِ جاں عبدالمجید امجد ہوئے"

(۲۱۹۷۴)

وہ بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ لیکن حالات کی مجبوری نے اشاعت سے محروم رکھا۔ ایک مختصر انتخاب "شبِ رفتہ" کے عنوان سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ بقیہ کلام کا مبسوط مجموعہ ان کی موت کے بعد ۱۹۷۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔

اگرچہ انھوں نے غزلیں بھی کہیں، لیکن دراصل وہ نظم کے شاعر ہیں۔ ان کا کلام بہت تہ دار ہے۔ حزن و ملال کی زیریں لہر تو مونا ہی چاہیے کہ خود ان کی اپنی زندگی کہاں کی آرام آسائش اور مسرت و سرور کی زندگی تھی! لیکن جس انداز سے وہ زندگی اور اس کے مسائل کو دیکھتے ہیں، وہ سراسران کا اپنا ہے۔ انھوں نے زبان اور اسلوب میں بھی کئی تجربے کیے۔ افسوس کہ زندگی میں انھیں وہ مقام نہ ملا، جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

حسین

وہ شام صبحِ دو عالم تھی جب بسرِ حدِ شام
مناجے کون دمکان تجھ شہید کا سجدہ
یہ نکتہ تو نے بتایا، جہانِ دالوں کو
کہ ہے فرات کے ساحل سے سلسبیلِ اک گام
سوارِ مرکبِ ددشیں رسول، پورِ تبول
چراغِ محفلِ ایماں، ترا مقدس نام

زینب

وہ قتل گاہ، وہ لاشے، وہ بکیوں کے خیاں
وہ رات جب تیری آنکھوں کے سامنے لڑنے
یہ کون جان سکے، تیرے دل پہ کیا گزری
ستم کی رات کی کالی قنات کے پیچھے
تیری ہی بدقصدی کی کردکھ کا نہ بکے
جہاں پہ سایہ کناں ہے تیرے شرف کی یاد
اکھر چکے ہیں تیرے خیمہ افگنوں کے خیاں
کیا کہیے، کیا حجابِ حیا کا فسانہ تھا
سب کچھ بس اک نگاہِ کرم کا بہانہ تھا

یہ کون ادھر سے گزرا، میں سمجھا حضور تھے
 اک چہرہ، اس پہ لاکھ سخن تاب زنگیتیں
 اک بوڑا درمڑ کے جو دیکھا، زمانہ تھا
 لے جرات نگہ! تری قسمت میں کیا نہ تھا
 لے غم! انیس دل! یہ تری دل لڑا زیاں
 ہم کو تری خوشی کے لیے مسکرا نا تھا
 ہاے، وہ دھڑکنوں سے بھری ساعتیں مجید
 میں ان کو دکھتا تھا، کوئی دیکھتا نہ تھا
 اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دام پیر
 میں اپنی زندگی انھیں دے دوں، جوین پردہ
 ابجد! طریقے میں ہے یہ احتیاط شرط
 اک داغ بھی کہیں نہ سر پر ہوں پڑنے

بہار

ہر بار اسی طرح سے دنیا
 سونے کی ڈلی سے ڈھالتی ہے
 مسروں کی کلی کی زرد موت

تھا ہے جسے خم ہوانے

ہر بار، اسی طرح سے شاخیں
 کھلتی ہوئیں کوئلیں اٹھائے
 رستوں کے سلاخچوں سے لگ کر

کیا سوچتی ہیں، یہ کون جانے!

ہر بار، اسی طرح سے بوندیں
 پھولوں بھری بدلیوں سے چھن کر
 آتی ہیں مانتوں پہ پھیلے

مانے کے درق کو ٹھن ٹھناتے

ہر سال، اسی طرح کا موسم
ہر بار، یہی مہکتی دودی
ہر صبح، یہی کھوڑا آسنو

رونے کے کب آئیں گے زمانے!

توسیع شہر

بیس برس سے کھڑے جو اس گاتی نہر کے دوار
چھوٹے کھیتوں کی سرحد پر بانگے پہریدار
گھنے، سہانے، چھانڈ چھڑکتے، پورے چھتنا
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے انجنا

جن کی سانس کا ہر جھوٹا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے ان سادنتوں کے جسم

گری دھڑام سے گھائل پڑوں کی نیلی دیوار
کٹے ہیکل، چھٹے پنجر، جھڑتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار

اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
اس پر بھی اب کاہلی ضرب اک اے آدم کی آل

اب یہ مسافت کیسے طے ہو، اے دل تو ہی بنا
کتنی عمر ادر گھٹتے فاصلے، پھر بھی دہی صبرا
چیت آیا، چیتاؤں کی بھی پیٹا چن بھیا
پت جھڑ آئی، پتر لکھے، آجیون بیت چلا

خوشیوں کا مکھ چوم کے دکھاء دنیا مان بھری
 اپنا پیکر، اپنا سایہ، تکانے کو سٹھن
 اپنے گرد، اب اپنے آپ میں گھلتی سوچ بھلی
 کانچ کی اک دیوار زمانہ، اُمنے سامنے ہم
 راہیں دھرو کس شاخیں کو دیں اک اک سُر
 دکھڑے کہتے لاکھوں مکھڑے، کس کس کی تینے
 جنون عشق کی رسم عجیب، کیا کہتے!
 آخر کوئی کنارا، اس سیل بیکراں کا
 شاید ادھر سے گزرے پھر بھی ترا سیفندہ
 یہ کیا عجیب راز ہے، سمجھ سکوں تو بات ہے
 مری تباہیوں کا بھی فائدہ کیا فائدہ ہے!
 چراغ بجھ چکے، تنگے جل چکے، سحر موٹی
 دل سے، ہرگز وہی بات گزری ہے
 چاندنی، نیم وادریچہ، سکوت
 دکھ وہ سچ کٹھن کہ جس کو روح کرے سجدہ
 دوری کی جب شکست لڑی، کوئی قریب نہ تھا
 کس کے دوست اور کیسے دشمن، سب دکھ لیا
 نظروں سے نظروں کا بندھن، جسم سے جسم جدا
 کتنی تیز چلی ہے اب کے دھول بھری دکھنا
 بولی تو اک اک کی دیسی، بانی سب کی جدا
 میں ان سے دور، وہ مجھ سے قریب، کیا کہنا
 آخر کوئی مداوا، اس دردِ زندگی کا!
 بیٹھا ہوا ہوں ساحل پر نے بلب کبھی کا
 نہ اب وہ ان کی بیرخی، نہ اب وہ التفات ہے
 نہ بچلیوں کا تذکرہ، نہ آشیاں کی بات ہے
 مگر ابھی مری جدائیوں کی رات رات ہے
 کس قیامت کی رات گزری ہے
 آنکھوں آنکھوں میں رات گزری ہے

ریاض النزاری، ریاض الدین، قاضی

ان کا آبائی وطن ضلع بلندشہر (یوپی) کا قصبہ جیور تھا۔ انیسویں صدی میں اس علاقے میں نیل کی کاشت بڑے وسیع پیمانے پر ہوتی تھی، اور یہ بہت نفع مند کاروبار تھا۔ وہاں کے قاضی رفیع الدین صاحب بھی نیل کی آٹھ کوٹھیوں کے مالک اور اپنے علاقے کے متمول زمیندار اور رئیس تھے۔ لیکن یورپ سے مصنوعی نیل کی درآمد شروع ہوتی تو اس دہائی تجارت کو بھی گھن لگنا شروع ہو گیا۔ کساد بازاری کے باعث رفتہ رفتہ ان کی حالت خراب ہونے لگی۔ چنانچہ جب ان کے بیٹے قاضی حسام الدین ان کے وارث ہوئے تو خاندان کی شان و شوکت میں بہت کمی آچکی تھی۔ لیکن وہ منہ میں روایتی چاندی کا چمچ لیے پیدا ہوئے تھے، اس لیے ان کے لیے بدلتے حالات سے سمجھوتا کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ رہی سہی کسر شاعری نے پوری کر دی، آزاد و تخلص کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسام الدین کا سارا وقت یارہاشی میں گزرتا اور ان کی اولاد نے خاندانی عظمت کے افسانوں کے سوائے اور کچھ نہ پایا۔

قاضی ریاض الدین انھیں قاضی حسام الدین کے دوسرے بیٹے تھے۔ یہ ۱۸۹۷ء میں جیور میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کا ابتدائی نصاب وطن میں سخی طور پر پورا کیا۔ گھر کا جو رنگ تھا، اس میں ان کی مزید تعلیم کی طرف کسی کو توجہ نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے ان کے بڑے بھائی قاضی عزیز الدین رخشاں جو پہلے سے نقل مکان کر کے اپنے ماموں کے پاس گوالیار چلے گئے تھے، جیور آئے اور چھوٹے بھائی کو اپنے

ساتھ لوالے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۳-۱۴ برس کی ہو گئی۔
 گوالیار میں انھوں نے ۱۹۱۶ء میں دسویں کی اور ۱۹۱۸ء میں انٹر کی سند حاصل کی۔
 پہلی عالمی جنگ کے اختتام کے بعد ۱۹۱۸ء میں اس ملک میں انفلونزا وبا کی شکل میں
 پھیل گیا تھا۔ بلامبالغہ لاکھوں جانیں اس مرض کا شکار ہو گئی تھیں۔ اسی میں قاضی
 عزیز الدین رخشاں بھی خدا کو پیارے ہو گئے۔ والد کا انتقال اس سے تین چار سال
 قبل ہو چکا تھا، اب بڑے لہجائی کی دائمی مفارقت کے بعد وہ بالکل بے یار و
 مددگار رہ گئے۔ اس لیے آگے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کا کیا امکان تھا، بلکہ
 مرحوم بھائی کے اہل و عیال کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی ان کے ناتوان کندھوں پر
 آپڑی، جس نے انہیں ملازمت تلاش کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس پر انھوں نے
 مقامی گورکھی ہائی اسکول میں اردو فارسی پڑھانے کی ملازمت اختیار کر لی تین
 چار برس کے علاوہ ان کا سارا زمانہ ملازمت اسی اسکول میں گزرا۔ وہ ۱۹۵۴ء
 میں سبکدوش ہوئے۔

تعلیم کا سلسلہ انھوں نے حالات کی مجبوری سے منقطع کیا تھا، نہ کہ اپنی خوشی سے۔
 جب حالات موافق ہوئے تو انھوں نے اس کمی کے پورا کرنے کی از سر نو کوشش کی۔
 ۱۹۳۰ء میں بلا تنخواہ رخصت لی اور چار سال علی گڑھ یونیورسٹی میں رہ کر بی اے
 سے لے کر ایم اے (اردو فارسی) اور بی ٹی تک کے امتحان پاس کئے۔

۱۷ برس کی عمر تھی، جب انھوں نے ۱۹۱۴ء میں شعر گوئی شروع کی۔ ان کا پہلا شعر تھا،
 بوجھ تم سے جب سنبھل سکتا نہیں تلوار کا
 کیا کرو گے خون تم دس بیس کا، دو چار کا!

یہی زبان کی طرف رجحان ان کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ اسی نے انھیں نوح
 فاروقی (ف: اکتوبر ۱۹۶۲ء) کا تلمذ اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ ۴۰ برس کی مشق
 میں بہت کچھ کہا، لیکن کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔

اردو کے عاشق تھے۔ بزم اردو، گوالیار گویا انھیں کے دم سے زندہ تھی، ۱۹۱۹ء

۱۹۷۲ء تک اس کے سیکٹر رہے۔ اس بزم کے اہتمام میں جو شاندار کل ہند مشاعرے ہوتے، وہ ہمیشہ یادگار رہینگے۔ ان کا انتظام مرحوم خود ہی کیا کرتے تھے۔ ان کی اردو دوستی کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ ان کی طویل اور کامیاب مدرسی کے اعتراف میں ۱۹۴۴ء میں ریاست نے انھیں انسپکٹر مدارس کی اسماعیلی پیش کی مرحوم نے یہ پیشکش قبول کرنے سے اس لیے معذرت کر دی کہ ان کے چلے جانے سے گورکھی اسکول میں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام باقی نہیں رہیگا اور ممکن ہے کہ اس پر یہ درجہ ہی بند کر دیا جائے۔

ان کی بیوی کا جو ان کے اپنے خاندان ہی کی سٹھیں، ۱۹۷۱ء میں انتقال ہو گیا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نہیں نوازا تھا، لیکن میاں بیوی میں مثالی محبت تھی۔ اس کی دائمی جدائی کے بعد بچہ کے رہ گئے۔ مختلف امراض نے آگھرا۔ دل کا پہلا دورہ ۱۹۷۲ء میں پڑا، اس سے تویح نکلے؛ مگر تا بجے ۲ جون ۱۹۷۴ء کو اچانک فالج کا حملہ ہوا، اور بایاں حصہ بیکار ہو گیا۔ فشار دم کا عارضہ پہلے سے تھا، دماغ کی نس پھٹ گئی۔ بارہ دن تک منٹامیج آر وگیہ اسپتال میں بیہوش رہنے کے بعد ۹ جولائی ۱۹۷۴ء علی الصبح تین بجے جان بحق ہو گئے۔ اسی دن ظہر کے وقت کریل حسن خان والے قبرستان، کمپوشکر گوالیار میں اپنی مرحومہ بیوی کے قریب دفن ہوئے۔

فیاض احمد خان فیاض گوالیاری کے قلعے میں تاریخ کا شعر ہے:

کہا ہاتھ نے سینہ چاک کر کے

ریاض خلد ہے جاگیر ان کی

(۱۹۷۵ - ۱ - ۱۹۷۴ء)

ان کا کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ یہ چند شعر مختلف رسالوں میں مطبوعہ غزلوں سے انتخاب کر کے دیے رہا ہوں۔ زبان کی شاعری ان کا طرہ امتیاز ہے۔

انہیں دیکھ کر زمانہ ہو گیا ہے یہ قصہ اب فسانہ ہو گیا ہے
 محبت نے ہمارے جان لے لی قضا کا تو بہانہ ہو گیا ہے
 ہجوم غم نے یوں احساس کو میرے مٹا ڈالا
 مصیبت بھی مصیبت اب نہیں معلوم ہوتی ہے
 کہانہ تھا کہ محبت کا ہے بُرا انجام بس اب تو اے دل خانہ خراب! دیکھ لیا
 نہ وہ ہیں، نہ دل ہے، نہ قسمت نہ دنیا محبت میں کوئی ہمارا نہیں ہے
 خدائی بھی ان کی، زمانہ بھی ان کا نہیں ہے تو کوئی ہمارا نہیں ہے
 وہ ہوں نامراد تمنا جہاں میں جسے موت کا بھی سہارا نہیں ہے

کہاں کی دوستی کس کی محبت، کیسی غمخواری
 یہ اندازِ خلوصِ درد مندوں دیکھتے کیا ہوا!
 نہ کیوں دیکھو خلوصِ باہم اربابِ مینخانہ
 یہ فرسودہ نزاعِ کفر و ایمان دیکھتے کیا ہوا
 حیاتِ غمگین کی تلخیوں کو اسی طرح خوشگوار کر لوں
 خوشی نہیں سازگار مجھ کو، تو غم ہی کو سازگار کر لوں
 ارادہ ترکِ عشق و الفت تو، ہمنشین! میں ہزار کر لوں
 جو یہ میرے اختیار میں ہو، تو میں اسے اختیار کر لوں

آج یہ گھر سے مرے کون ہوا ہے رخصت! کیوں فرسودہ در و دیوار نظر آتے ہیں
 تیری جنت میں، نہ واعظ ہیں، نہ زاہد یا با! یہ تو دنیا کے گنہگار نظر آتے ہیں
 کسی کا سنگِ در ہے، اور میں ہوں یہ میرا دردِ سر ہے، اور میں ہوں
 محبت دیکھ لی، اہل وطن کی ریاض! اب اپنا گھر ہے، اور میں ہوں
 یہ دو جہلوں میں ہے روتا غم بیمارِ الفت کی
 جو دن ہے، وہ مصیبت کا، جو شب ہے، وہ قیامت کی

بجائے تو نے جو، اے ناصح مشتاق! نصیحت کی
 مگر جب چین بھی دے بیٹھی، دردِ محبت کی
 کوئی کجبت ہی اب رکھ سیکے گا دل کو قافو میں
 جوانی، وہ بھی ان کی! اور وہ بھی اس قیامت کی!
 ریاض! اس کا چھپنا محال ہے کہ عیشِ ناز بن کے رہیگا، نہ راز ہو کے رہا
 دنیا ہے الگ اوروں کی، مرے فن کا جہاں اور
 رنگ اور، روش اور، بیاں اور، زبان اور
 بے اُن کے، نہ رُت وہ، نہ سماں وہ، نہ فضا وہ
 وہ سہنے تو فضا اور سہتی، رُت اور، سماں اور
 اقرار میں انکار ہے، انکار میں اقرار
 ان شوخِ حیلوں کی نہیں اور ہے، ہاں اور
 دیدان کی سہل ہی سہی ممکن مگر کہاں!
 ذوقِ نظر بھی ہو، تو مجالِ نظر کہاں!
 ہر چیز میں ہے پُر تو حسن و جمالِ دوست
 لیکن ہر اک نگاہِ حقیقت نگر کہاں!
 جا تو رہا ہوں جوشِ جنوں میں کہیں، مگر
 لے جا رہا ہے جوشِ جنوں، کیا خبر، کہاں!
 محوِ طلب کو جوشِ طلب میں کہاں یہ ہوش
 منزل کہاں ہے، راہِ کدھر، راہِ ہر کہاں!
 یہی دنیا، یہی دنیا کے عیشِ بیکراں ہونگے
 یہ سب ہوگا مگر اے عمرِ فانی! ہم کہاں ہونگے!
 اب آئے ہو تو بیٹھو بھی ذرا، کل کی خبر کیا ہے
 نہ جانے تم کہاں ہونگے؛ نہ جانے ہم کہاں ہونگے

غم ہستی، غم الفت، غم دوراں ہو کر
 غم یہ ہر رنگ رہا، زلیست کا عنوان ہو کر
 کر لیا ضبط غم عشق بھی بالفرض، ریاض!
 رہ سکو گے غم دوراں سے گریزاں ہو کر؟
 غم دل کا نگہبان ہوا جاتا ہے ہر وقت کا مہمان ہوا جاتا ہے
 اس دور کی کشمکش الہی! توبہ انسان، پریشان ہوا جاتا ہے
 کوئی ہمدم نہ رہا، کوئی یگانہ نہ رہا
 کوئی مسکن نہ رہا، کوئی ٹھکانہ نہ رہا
 دن وہی رات وہی، صبح وہی شام وہی
 ہم وہی ہیں، مگر اپنا وہ زمانہ نہ رہا
 نہ انگلیں، نہ ترنگیں، نہ مسرت، نہ امید
 یہی جینا ہے، تو اس جینے میں کیا رکھا ہے!
 یہی کہتا ہے، ہر اک دیکھ کے صورت میری
 تو نے، کجخت! یہ کیا حال بنا رکھا ہے!

محمد حسین حسان

ان کا خاندان دراصل سہسوان کا رہنے والا تھا، لیکن خود ان کی پیدائش ۱۹۰۷ء میں پٹی بھیت میں ہوئی۔ والدین کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ والد کا نام محمد بنی جان تھا۔ اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر مدرسۂ اسلامیہ بریلی میں عربی پڑھی اور اس کی تکمیل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کی۔ ۱۹۲۷ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں چلے آئے۔ اسی زمانے میں انگریزی کی طرف توجہ کی۔ لیکن ۱۹۳۰ء-۱۹۳۱ء میں کانگریس کی نمک سازی کی تحریک میں شرکت کے باعث جلد ہی یہ سلسلہ منقطع ہو گیا، اور پھر اس طرف توجہ نہ کر سکے بہر حال اتنی قابلیت پیدا کر لی تھی کہ انگریزی کتابوں سے بآسانی استفادہ کر سکتے تھے۔ اسی زمانے میں دہلی کانگریس نے اردو، ہندی، انگریزی تینوں زبانوں میں خبرنامے شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اردو کے نگران اردو دارالشفیق الرحمن قدوائی مرحوم (ف: اپریل ۱۹۵۳ء) تھے اور انگریزی کے رگھونندن سرن، بی اے (کینب) (ف: دسمبر ۱۹۵۳ء)۔ قدوائی مرحوم نے اردو خبرنامے کی ترتیب قدوائی میں محمد حسین حسان کو اپنا معاون مقرر کیا۔ یہ خبرنامہ کوئی سال بھر شائع ہوتا رہا تھا۔ جب قدوائی صاحب گرفتار ہوئے، اور قید خانے بھیج دیے گئے، تو چندے بعد خود حسین حسان صاحب بھی گرفتار کر لیے گئے۔ حوالات کے زمانے میں پولیس نے ان پر بے پناہ مظالم توڑے۔ مطالبہ یہ تھا کہ بتاؤ، یہ خبرنامے کس چھاپے خانے

میں چھپتے ہیں؟ (یہ ایک دلچسپ داستان ہے کہ رگھونندن سرن صاحب ان کی طباعت کے لیے کیا کیا پاڑے بیلتے تھے۔ کیونکہ کوئی مطبع ان کے چھاپنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا)۔ حسان صاحب نے سب سختیاں برداشت کیں، لیکن منہ سے ایک لفظ نہیں بولے۔ بالآخر قید کی سزا ہوئی۔

قید سے رہائی کے بعد وہ مکتبہ جامعہ میں ادبی معاون مقرر ہوئے اور بعد کو ”پیام تعلیم“ کی ترتیب ان کے سپرد کر دی گئی۔ ”پیام تعلیم“ شروع میں بچوں کا رسالہ نہیں تھا۔ اسے مسیح الملک حکیم اجمل خان (ف: دسمبر ۱۹۱۲ء) اور عبد الحمید خواجہ بیرسٹر (ف: دسمبر ۱۹۴۲ء) کے ایہما پر ذاکر صاحب مرحوم (ف: مئی ۱۹۴۹ء) اور ڈاکٹر سید عابد حسین مدظلہ نے ۱۹۲۴ء میں جاری کیا تھا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ہی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ اس کا مقصد عوام کو جامعہ ملیہ کے کاموں سے باخبر رکھنا اور انہیں نئے نئے تعلیمی مسائل اور تجربات سے مانوس کرنا اور ان کی طرف ترغیب دلانا تھا۔

جب محمد حسین حسان مدیر معاون ہو کر آئے، تو انہوں نے بہت خاموشی سے اسے آہستہ آہستہ بچوں کا پرچہ بنا دیا۔ اس زمانے میں خالص بچوں کے لیے اچھے معیار کا قابل مطالعہ مواد بہت کم تھا۔ ذاکر صاحب مرحوم کو بچوں کی تربیت سے جو دلچسپی تھی، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ حامد علی خان (ف: ۱۹۴۳ء) مکتبہ جامعہ کے مینجر تھے۔ ان کی تجارتی سوچ بوجھ بلا کی تھی۔ انہوں نے اس خوشگوار تبدیلی کو مالی مفاد کے پہلو سے جانچا۔ غرض دونوں نے محمد حسین حسان صاحب کے کام کی تحسین کی؛ اور ”پیام تعلیم“ نے بہت جلد اس صنف کے صفِ اول کے پرچوں میں اپنی جگہ بنالی۔ حیدر آباد اور کشمیر کے محکمہ تعلیم میں یہ منظور شدہ فہرست میں شامل ہو گیا، اور ان دونوں ریاستوں کے مدارس کے لیے اس کی سرکاری خریداری منظور ہو گئی۔ اس سے اس کی اشاعت کہیں سے کہیں پہنچ گئی؛ اسی کی حامد علی خان مرحوم کو توقع تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس دور میں اس

کے مضمون نگاروں میں خود ذاکر صاحب کے علاوہ، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سید عابد حسین کے نام بھی ملتے ہیں۔ شیخ الدین نیر کا بچوں کے شاعر کی حیثیت سے نام اسی زمانے میں چمکا۔ آج کے بعض مشہور لکھنے والوں نے مضمون نگاری کی ابتدا پیام تعلیم ہی سے کی تھی۔ اس کے سالناموں اور خاص نمبروں کا بھی اس دور میں بہت شہرہ تھا؛ بلکہ اس کی یہ خصوصیت تو آج تک قابل لحاظ ہے۔

محمد حسین حسان صاحب نے لکھنا دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طالب علمی کے زمانے میں شروع کیا، بلکہ شاید اس سے بھی کچھ پہلے۔ مدتوں ان کے مضامین الناظر (لکھنؤ)، نقیب (بدایون)، زمانہ (کانپور)، شمع (آگرہ) وغیرہ میں شائع ہوتے رہے شروع میں زیادہ توجہ عربی مضامین کے تراجم پر رہی۔ ان کا ایک طویل مضمون ”محمود غزنوی کی بزم ادب“ بالاقساط جامعہ میں شائع ہوا تھا۔ لیکن ان کے اصلی جوہر پیام تعلیم کی ادارت کے زمانے میں کھلے۔ انھیں سہل ممتنع اور سلیس زبان اور روزمرہ پر حیرتناک قدرت حاصل تھی۔ بچوں کی نفسیات اور ان کی پسند اور ناپسند کا انھیں گہرا شعور تھا۔ اس لیے انھوں نے بچوں کے لیے معلوماتی مضامین اور کہانیاں لکھیں۔ یہ بہت مقبول ہوئیں۔ ان کی سب سے پہلی کتاب آنحضرت صلعم کی سوانح عمری ”سرکارِ دو عالم“ کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس کی مقبولیت کا کچھ اندازہ اس سے لگایا کہ اس کتاب کے ۱۸-۱۹ ایڈیشن چھپ چکے ہیں؛ یہ کسی زمانے میں ریاست میسور کے مدارس کے نصاب میں شامل تھی۔ ان کی دوسری کتاب ”دنیا کے بچے“ کا بھی یہی حال ہے؛ اس کے بھی ۱۵-۱۶ ایڈیشن کل چکے ہیں۔ ایک اور کتاب ”نامورانِ اسلام“، انھی؛ اس پر انھوں نے بہت محنت کی تھی اور اس کا مواد بڑی تحقیق سے فراہم کیا تھا۔ چھپنے سے پہلے مسودہ ڈاکٹر ذاکر صاحب مرحوم اور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۵۳ء) کو دکھایا تھا، تاکہ اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہ رہ جائے۔

یہ تقسیم سے کچھ قبل (غائباً ۱۹۴۵ء) میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ میرے علم میں تقسیم کے بعد اس کا کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ وہ اس پر نظر ثانی کر رہے تھے۔ اس کا مسودہ یقیناً محفوظ ہوگا۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے۔ یا دایا، ان کی ایک اور مفید اور معلوماتی کتاب ”ہماری زمین“ بھی تھی۔ اس میں مختلف مآخذ سے سائنسی کوائف جمع کر کے یکجا کر دیے ہیں کہانی کے پیرائے میں؛ بڑے کام کی چیز ہے۔

تقسیم ملک کے ساتھ ملکتہ جامعہ پر بھی ابتلا آئی۔ پیام تعلیم بند ہو گیا۔ جب جامعہ ملیہ کے دفاتر ادا کھلا آئے، تو انھوں نے کوشش کی کہ اسے دوبارہ جاری کیا جائے لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ اسی زمانے میں جامعہ نے ایک ادارہ تعلیم ترقی کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد بالغوں کے لیے لٹریچر پیدا کرنا تھا۔ حسین حسّان صاحب اس ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ اس جگہ انھوں نے جہاں دوسروں کے مسودوں پر نظر ثانی کی اور انھیں اشاعت کے لیے تیار کیا، وہیں خود بھی بہت کچھ لکھا۔ اس میں سے کچھ چھپ گیا، کچھ مسودوں کی شکل میں رہ گیا (اور اب تک غالباً دیمک کی نظر ہو چکا ہوگا) ”الزام کس پر؟“ ”آستین کا سانپ“؛ ”الٹی دوا“؛ ”برف کا گھر“؛ ”چاند“؛ ”تاؤ کے اپدیش“؛ ”زمین کے بھائی بہن“؛ ”رامونے پڑھنا سیکھا“؛ ”دیمک“؛ ”کتنی زمین“ وغیرہ۔ یہ کتابیں اسی زمانے میں شائع ہوئیں۔

۱۹۴۳ء میں پیام تعلیم دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا، تو ترتیب کے لیے قرعہ فال پھر ان کے نام پڑا۔ وہ آخر تک اس کے مدیر رہے۔ صحت بہت دن سے سقیم چلی آرہی تھی۔ دے کا عارضہ تھا۔ بہت ہی نحیف و نزار ہو کے رہ گئے تھے۔ اگر کثیر العیالی اور سخی مجبوریاں دامیگر نہ ہوتیں، تو وہ کب کے ان جھیلوں سے الگ ہو چکے ہوتے۔ لیکن ہندوستان کے ادیب کی قسمت میں آرام صرف کنارہ لحد میں لکھا ہے۔ اسی حالت میں ۱۲ جولائی ۱۹۷۲ء

کو انھیں جلس بول کی تکلیف لاحق ہو گئی۔ اس پر وہ اسپتال میں داخل ہوئے۔
لگے دن ۱۳ جولائی ۱۹۷۴ء (دوہیں مول چند اسپتال میں) صبح ساڑھے چھ بجے
کے قریب حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اسی دن ظہر کے بعد جامعہ
ملیہ کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میرا ذاتی تعلق ان سے ۱۹۳۶ء سے تھا۔ اور میں نے عربی کا پہلا سبق اسھیں
سے پڑھا تھا۔ اس زمانے میں جامعہ ملیہ کے دوسرے عملے کے ساتھ وہ سبھی
تزلزل باغ میں رہتے تھے۔ حسن اتفاق سے میں نے بھی کرایے کا مکان اسی
جگہ لے لیا۔ جب ان سے خاصا ربط مضبوط پیدا ہو گیا تو ایک دن میں نے ان
سے عربی پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ سجد خندہ پیشانی سے اس پر تیار
ہو گئے۔ چنانچہ میں نے ممبئی سے ابتدائی نصاب کی کتابیں (القرآن الرشیدہ
کے چاروں حصہ منگوا لیے۔ ان میں سے پہلے دو یا تین میں نے ۱۹۳۷-۱۹۳۸ء
کے جاڑوں کے چار پانچ مہینوں میں سبقاً ان سے پڑھے تھے۔

پہلی بیوی سے ایک لڑکی یا دو لڑکیاں تھیں۔ دوسری بیگم سے چار بیٹے (حسیب،
شعیب، انجیب، شکیب) اور تین بیٹیاں (صفیہ، ریحانہ، فرزانہ) ان کے
ہوگواروں میں ہیں۔

اب کہاں ملیں گے، اس محبت اور ذوقِ علم کے لوگ۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ
کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین!

ساغر صدیقی، محمد اختر

ساغر صدیقی نے ایک مرتبہ کہا تھا: "میری ماں دلی کی تھی، باپ پٹیالے کا، پیدا امرتسر میں ہوا، زندگی لاہور میں گزری؛ میں بھی عجیب چوں چوں کا مرتبہ ہوں؛" اس قول میں صرف ایک معمولی سی غلطی کے سواے اور سبب سچ ہے۔

در اصل ان کا خاندان انبالے کا تھا، اور وہ پیدا بھی انبالے میں ہوئے۔ سال ۱۹۲۸ء تھا۔ گھر میں ہر طرف افلاس و محنت کا دور دورہ تھا۔ ایسے میں تعلیم کا کیا سوال! محلے میں ایک بزرگ حبیب حسن رہتے تھے، انھیں کے پاس جانے آنے لگے۔ جو کچھ پڑھا انھیں سے۔ اس کے بعد شاید ورنیکلر ہڈل کے کچھ درجے بھی پاس کر لیے ہوں۔ ایک دن انھوں نے اس ماحول سے تنگ آ کر امرتسر کی راہ لی، اور یہاں ہال بازار میں ایک دوکاندار کے وہاں ملازم ہو گئے، جو لکڑی کی کنگھیاں بنا کر فروخت کرتا تھا۔ انھوں نے بھی یہ کام سیکھ لیا۔ دن بھر کنگھیاں بناتے اور رات کو اسی دوکان کے کسی گوشے میں پڑ رہتے۔ لیکن شعروہ اس ۱۴-۱۵ برس کی عمر ہی میں کہنے لگے تھے، اور اپنے بیتکلف دوستوں کی محفل میں سناتے بھی تھے۔ شروع میں تخلص ناصر مجازی تھا۔ لیکن جلد ہی اسے چھوڑ کر ساغر صدیقی ہو گئے۔

ساغر کی شہرت ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔ اس سال امرتسر میں ایک اچھے بڑے پیمانے پر مشاعرہ قرار پایا۔ اس میں شرکت کے لیے لاہور کے بعض شاعر بھی مدعو تھے۔

ان میں سے ایک صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ "لڑکا" (ساغر صدیقی) بھی شعر کہتا ہے۔ انہوں نے منتظین سے کہہ کر اسے مشاعرہ میں پڑھنے کا موقع دلوا دیا۔ ساغر کی آواز میں بلا کا سوز تھا اور وہ ترقم سے پڑھنے میں جواب نہیں رکھتا تھا۔ بس پھر کیا تھا، اس شب اس نے صحیح معنوں میں مشاعرہ لوٹ لیا۔

قدرتاً اس کے بعد امرتسر اور لاہور کے مشاعروں میں اس کی مانگ بڑھ گئی۔ اب اس نے کنگھیاں بنانے کا کام چھوڑ دیا اور بعض سرپرست اصحاب کی مدد سے اپنا علم اور صلاحیت بڑھانے کی کوشش کی۔ مشاعروں میں شرکت کے باعث اتنی یافت ہو جاتی تھی کہ اسے اپنا پیٹ پالنے کے لیے مزید تنگ و دو کی ضرورت نہ رہی۔ گھر والے بیشک ناراض تھے کہ لڑکا آوارہ ہو گیا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا، لیکن اُسے اُن کی کیا پرواہ تھی، اس نے گھر آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔ کلام پر اصلاح کے لیے لطیف انور گورداسپوری مرحوم کا انتخاب کیا اور ان سے بہت فیض اٹھایا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا، تو وہ امرتسر سے لاہور چلا گیا۔ یہاں دوستوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُس کا کلام مختلف پرچوں میں چھپنے لگا۔ سینما فلم تیار کرنے والوں نے اس سے گیتوں کی فرمائش کی اور اس میں اسے حیرتناک کامیابی حاصل ہوئی۔ اس دور کی متعدد فلموں کے گیت ساغر کے لکھے ہوئے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں اس کے سب سے بڑے سرپرست انور کمال پاشا (ابن حکیم احمد شجاع مرحوم) تھے، جو پاکستان میں فلم سازی کی صنعت کے بانیوں میں ہیں۔ انہوں نے اپنی بیشتر فلموں کے گانے ساغر سے لکھوائے اور یہ بہت مقبول ہوئے۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک ساغر کی زندگی کا زریں دور کہا جاسکتا ہے۔ وہ لاہور کے کئی روزانہ اور ہفتہ وار پرچوں سے منسلک ہو گیا، بلکہ بعض جریدے تو اسی کی ادارت میں شائع ہوتے رہے۔ لیکن اس کے بعد شامت اعمال سے

حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ کہیں کا نہ رہا اور اخیر میں صحیح معنوں میں رقیع عبرت بن گیا۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ وہ ایک ادبی ماہنامے کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ انھوں نے سر درد اور انفعال کی شکایت کی۔ پاس ہی ایک اور شاعر دوست بھی بیٹھے تھے۔ انھوں نے تعلق خاطر کا اظہار کیا اور خاص ہمدردی سے انھیں مارفیا کا ٹیکہ لگا دیا۔ سر درد اور انفعال تو دور ہو گیا، لیکن اس معمولی واقعے نے ان کے جسم کے اندر نشہ بازی کے تناور درخت کا بیج بو دیا۔ بد قسمتی سے ایک اور واقعے نے اس رجحان کو تقویت دی۔

اس زمانے میں وہ انارکلی لاہور میں ایک دوست کے والد کے (جو پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے) مطب کی اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ اسی کمرے میں ان کے ساتھ ایک اور دوست بھی مقیم تھے (اب نام کیا لکھوں!) ان صاحب کو ہر طرح کے نشوں کی عادت تھی۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے! ان کی صحبت میں ساغر بھی رفتہ رفتہ اولاً بھنگ اور شراب اور ان سے گزر کر افیون اور چرس کے عادی ہو گئے۔ اگر کوئی شخص راہِ راست سے بھنگ جائے اور توفیقِ ایزدی اس کی دستگیری نہ کرے، تو پھر اس کا تحت الشری سے ادھر کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔

یہی ساغر کے ساتھ ہوا۔ اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ خود ان کے دوستوں میں سے بیشتر نے ان کے ساتھ ظلم کیا۔ یہ لوگ انھیں چرس کی پڑیا اور مارفیا کے ٹیکے کی شیشیاں دیتے اور ان سے غزلیں اور گیت لے جاتے، اپنے نام سے پڑھتے اور چھیواتے اور سببِ شاعر اور گیت کار اپنی شہرت میں اضافہ کرتے۔ اس کے بعد اس نے رسائل و جرائد کے دفتر اور فلموں کے اسٹوڈیو میں جانا آنا چھوڑ دیا۔ اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ ان اداروں کے کرتا دھرتا اس کے کام کی اجرت کے دس روپے بھی اس وقت تک ادا نہیں کرتے تھے، جب تک وہ ان کے درِ دولت کی چوکھٹ پر دس سجدے نہ کرے۔ اس نے ساغر کے مزاج کی تلخی

اور دنیا بیزاری اور ہر وقت "بہ خود" رہنے کی خواہش میں اضافہ کیا۔ اور وہ بالکل آوارہ ہو گیا۔ نوبت بایں جا رسید کہ کبھی وہ ننگ ہڈی ایک میلی کچیلی چادر اوڑھے، اور کبھی چیخڑوں میں ملبوس، بال بکھرائے ننگے پاؤں — منہ میں پیری یا سگریٹ لیے سڑکوں پر پھرتا رہتا اور رات کو نشے میں ڈھلتا، مدہوش کہیں کسی سڑک کے کنارے کسی دوکان کے خنڈے یا تخت کے اوپر یا نیچے پڑ رہتا۔

اب اس کی یہ عادت ہو گئی کہ کہیں کوئی اچھے وقتوں کا دوست مل جاتا، تو اس سے ایک چوٹی طلب کرتا۔ اس کی یہ چوٹی مانگنے کی عادت سب کو معلوم تھی چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ کسی دوست نے اسے سامنے سے آتے دیکھا اور فوراً جیب سے چوٹی نکال کر ہاتھ میں لے لی۔ پاس پہنچے، اور غلیک سلیک کے بعد مصافحہ کرتے وقت، چوٹی ساغر کے ہاتھ میں چھوڑ دی۔ وہ باغ باغ ہو جاتا۔ یوں تمام تک جو دس بیس روپے جمع ہو جاتے، وہ اس دن کے چرس اور مارفیا کے کام آتے۔ غاعتبر وایا اولی الالبصار۔

جنوری ۱۹۷۴ء میں اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ اس کا علاج بھی چرس اور مارفیا سے کیا گیا۔ فالج سے تو بہت حد تک نجات مل گئی، لیکن اس سے دایاں ہاتھ ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گیا۔ پھر کچھ دن بعد منہ سے خون آنے لگا۔ اور یہ آخر تک دوسرے تیسرے جاری رہا۔ ان دنوں خوراک بالکل برائے نام تھی۔ جسم سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اب وہ دن دور نہیں بوجہ وہ کسی سے چوٹی نہیں مانگیگا۔ چنانچہ ۱۹ جولائی ۱۹۷۴ء صبح کے وقت اس کی لاش سڑک کے کنارے ملی، اور دوستوں نے لے جا کر اسے میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یزدانی جالندھری نے قطعہ تاریخ وفات کہی :

ساغر نے رختِ زلیست جہاں سے اٹھالیا افسردہ اس کے غم میں ہیں یارانِ انجمن
وہ شہرِ یارِ شعر، وہ درویشِ بے ریا نظمیں سنجیں جس کی منظرِ معراج فکر و فن

نعتوں میں جس کی جذبہ حب رسول تھا غزلوں میں جس کی حسن و جوانی کا باتکین
یرزدانی حزیں نے لب جام رکھ کے ہاتھ تاریخِ رحلت اس کی کہی "ساغر سخن"

(۱۹۷۱-۱۹۷۲ء)

(۳)

اس نے غزل، نظم، قطعہ، رباعی ہر صنفِ سخن میں خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ وہ خود
تو اسے کیا چھپوانا، ناشروں نے اپنے نفع کی خاطر اسے چھپا لیا، اور اسے معاوضے
میں ایک حبہ تک نہ دیا۔ چھپوے اس کی زندگی میں لاہور سے چھپے و غم بہار
نہر آر زور (۱۹۷۲ء) لوحِ جنون (۱۹۷۱ء) اور سبز گنبد اور شبِ آہی (۱۹۷۲ء)
یقین ہے کہ اگر کوشش کی جائے، تو ایک اور مجموعے کا مواد باسانی ہوتا ہو سکتا
ہے۔ ساغر کا کلام بہت جاندار ہے اور زندہ رہنے کا مستحق۔

جی چاہتا ہے کہ یہاں اس کی زندگی کا ایک واقعہ قلمبند کر دوں، جس سے مشہور
یونانی فلسفی دیوجانس کلبی کی روایت تازہ ہوتی ہے:

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں فوجی انقلاب ہوا۔ جرنیل محمد ایوب (ف: اپریل
۱۹۷۲ء) برسرِ اقتدار آگئے اور تمام سیاسی پارٹیاں اور سیاست دان، جن کی
باہمی چپقلش اور رستہ کشی سے عوام تنگ آچکے تھے، حرفِ غلط کی طرح فراموش
کر دیے گئے۔ لوگ اس تبدیلی پر واقعی خوش تھے۔ ساغر نے اسی جذبے کا
اظہار ایک نظم میں کیا ہے۔ اس میں ایک مصرع تھا:

کیا ہے صبر جو ہم نے، ہمیں ایوب ملا

یہ نظم جرنیل محمد ایوب کی نظر سے بھی گزری یا گزاری گئی۔ اس کے بعد جب وہ
لاہور آئے، تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں اس شاعر سے ملنا چاہتا ہوں
جس نے یہ نظم لکھی تھی۔ اب کیا تھا! پولیس اور خفیہ پولیس اور نوکرتا ہی کا
پورا عملہ حرکت میں آگیا اور ساغر کی تلاش ہونے لگی۔ لیکن صبح سے شام تک
کی پوری کوشش کے باوجود وہ ہاتھ نہ لگا۔ اس کا کوئی سٹور ٹھکانا تو تھا
نہیں، جہاں سے وہ اسے پکڑ لائے۔ پوچھ گچھ کرتے کرتے سب شام پولیس نے اسے

ایک پان والے کی دوکان کے سامنے کھڑے دیکھ لیا؛ وہ پان والے سے کہہ رہا تھا کہ پان میں تو ام زرا زیادہ ڈالنا۔ پولیس افسر کی ہاجیہ کھل گئیں کہ شکر ہے ظلم سبجانی کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔ آنکھوں نے قریب جا کر ساغر سے کہا کہ آپ کے حضور صدر مملکت نے یاد فرمایا ہے۔ ساغر نے کہا: بابا، ہم فیروں کا صدر سے کیا کام! افسر نے اصرار کیا، ساغر نے انکار کی رٹ نہ چھوڑی۔ افسر بیچارہ پریشان کرے تو کیا کیونکہ وہ ساغر کو گرفتار کر کے تو لے نہیں جاسکتا تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا، اور اسے کوئی ایسی ہدایت بھی نہیں ملی تھی، جرنیل صاحب تو محض اس سے ملنے کے خواہشمند تھے اور ادھر یہ ”پگلا شاعر“ یہ عزت افزائی قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اب افسر نے جو مسلسل خوشامد سے کام لیا، تو ساغر نے زچ ہو کر اس سے کہا: ارے صاحب، مجھے گورنر ہاؤس میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ مجھے کیا دینگے، دوسو، چار سو، فیروں کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے جب وہ اس پر کبھی نہ ملا تو ساغر نے گھوڑی کلتے میں دباٹی اور زمین پر پڑی سگریٹ کی خالی ڈیا اٹھا کر کے اُسے کھولا۔ جس سے اس کا اندر کا حصہ نمایاں ہو گیا۔ اتنے میں یہ تماشا دیکھنے کو ارد گرد خاصی سمیٹ جمع ہو گئی تھی۔ ساغر نے کسی سے قلم مانگا اور اس کاغذ کے ٹکڑے پر یہ شعر لکھا:

ہم سمجھتے ہیں ذوقِ سلطانی
یہ کھلونوں سے بہل جاتا ہے

ساغر صدیقی بقلم خود

اور وہ کاغذ پولیس افسر کی طرف بڑھا کر کہا: یہ صدر صاحب کو دے دینا، وہ سمجھ جائینگے۔ اور اپنی راہ چلا گیا:

پیدا کہاں ہیں ایسے پر اگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میسر سے صحبت نہیں رہی

ایک نغمہ، ایک غنچہ، ایک تارا، ایک جام
ایک غم دوراں، غم دوراں! تجھے میرا سلام

ہم بنائینگے یہاں، ساغر انبی تصور شوق
ہم تخیل کے مجدد، ہم تصور کے امام
گیت اس عہد پینکلف میں
بربط و جنگ و نے کو ترسے ہیں
ساتیلا تیرے بادہ خانے میں
نام ساغر ہے، نے کو ترسے ہیں
چراغ طور جلاؤ، بڑا اندھیرا ہے
وہ جن کے ہوتے ہیں نور شیدائستہ نہیں
نراقب اسٹھاؤ، بڑا اندھیرا ہے
انہیں کہیں سے بلاؤ، بڑا اندھیرا ہے
میرے قریب نہ آؤ، بڑا اندھیرا ہے
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ، بڑا اندھیرا ہے
ابھی قریب نہ کھاؤ، بڑا اندھیرا ہے
مجھے یقین دلاؤ، بڑا اندھیرا ہے
وہ روشنی سی پلاؤ، بڑا اندھیرا ہے
کسی کرن کو جگاؤ، بڑا اندھیرا ہے
ساغر کسی کی یاد میں جب اشکبار تھے
کتنے حسین دن تھے جہاں خراب ہیں
جگمگاتے ہیں وحشتوں کے دیار
عقل نے آدمی کو سیح دیا
ہم الٹ دیتے ہیں صدیوں کے نقاب
ہم زمانوں کی خبر رکھتے ہیں
یوں چٹکتے ہیں شاخ پر عینے
جیسے ان کے سلام آتے ہیں
رہبروں کے ضمیر مجرم ہیں
معبودوں کے چراغ گل کر دو
ہر مسافر یہاں لیٹا ہے
قلب انسان میں اندھیرا ہے
میں بھی جنت سے نکالا ہوا اک بت ہی تو ہوں
ذوق تخلیق! تجھے کیسے ستم آتے ہیں!
ہاں میں نے لہوا اپنا گلستاں کو دیلا ہے
مجھ کو گل و گلزار پہ تنقید کا حق ہے
صبح دیکھا، شگوفے تھے ٹوٹے ہوئے
گل کھلاتی رہی، رات بھر، چاندنی
اے ستاروں کے چاہنے والے
آنسوؤں کے چراغ حاضر ہیں
رونقِ جشنِ رنگ و بو کے لیے
زخم حاضر ہیں، داغ حاضر ہیں

تشنگی تشنگی، ارے توبہ !
 اے خداوند کوثر و نسیم !
 قطرے قطرے کو ہم ترستے ہیں
 تیرے بادل کہاں برسے ہیں ؟
 کچھ نہیں مدد افقروں کا
 درد ہے لاود افقروں کا
 اپنی تنہائیوں پہ ہنستے ہیں
 کون ہے آشنا فقروں کا
 ایک وعدہ ہے کسی کا جو فنا ہوتا نہیں
 ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں
 ہر شناور کو نہیں ملتا، تلاطم سے خسراج
 ہر سفینے کا محافظ ناخدا ہوتا نہیں
 ہر جھکاری پا نہیں سکتا مقام خواجگی
 ہر کس و ناکس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں
 ہاے یہ بیگانگی، اپنی نہیں مجھ کو خبر !
 ہاے یہ عالم کہ تو دل سے جبار ہوتا نہیں
 زمانے کو نہ دے الزام، اے ناواقف منزل !
 زمانے کی نظر ہم ہیں، زمانے کا چلن ہم ہیں
 آوارگی بزرگ تماشا بری نہیں
 ذوقِ نظر ملے، توبہ دنیا بری نہیں
 کہتے ہیں تیری زلف پر لیشاں کو زندگی
 اے دوستِ زندگی کی تمنا بری نہیں
 ساغر کے ساتھ چل کے کبھی میکہ میں سن
 اتنی حدیثِ ساغر و بادہ بری نہیں
 یاد رکھنا ہماری تربت کو
 قرض ہے تم پہ چار پھولوں کا

جمالی، طفیل احمد

ان کا خاندان دراصل الہ آباد کا رہنے والا تھا، لیکن یہ ۱۹۱۹ء میں بنارس میں پیدا ہوئے، جہاں اس زمانے میں ان کے والد محمد اسحاق صاحب مقامی جیل خانے کے مہتمم تھے۔ وہ وہاں بہت لمبا عرصہ تعینات رہے تھے۔ چنانچہ جمالی کی ابتدائی تعلیم بنارس ہی میں ہوئی۔ بی۔ اے کا امتحان بعد کو ۱۹۴۱ء میں اپنے وطن الہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے دلی کی راہ لی۔ سیاست اور مضمون نگاری سے انھیں طالب علمی کے زمانے ہی میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں دلی میں انھوں نے مختلف اخباروں میں جزوقتی کام شروع کیا۔ پھر مستقل طور پر ”منشور“ کے عملے سے منسلک ہو گئے۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو کراچی چلے گئے۔ ابتدا میں چندے روزنامہ ”جنگ“ میں کام کیا۔ جب مشہور کانگریسی اور کمیونسٹ لیڈر میاں افتخار الدین (ف) جون ۱۹۴۲ء) نے اردو روزنامہ ”امروز“ جاری کیا، تو اس کا ایک ایڈیشن کراچی سے بھی چھپنے لگا۔ اس کے ایڈیٹر مشہور صحافی چراغ حسن حسرت (ف) جون ۱۹۵۵ء) تھے۔ انھوں نے جمالی کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا اور انھیں امروز کے اسٹاف میں لے لیا۔ جمالی اس میں روزانہ ”پہلا درویش“ کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم لکھنے لگے۔ وہ اس کے ہفتہ وار ایڈیشن کے لیے

”گر تو بُرا نہ مانے“ کے عنوان سے ملک کی معاشری سیاسی ہماجی ادبی سرگرمیوں پر طنز یہ انداز میں تنقید کرتے رہے۔ یہ دونوں کالم (خاص کر موخر الذکر) بہت مقبول ہوئے۔

”امروز“ کراچی ایڈیشن بند ہو جانے کے بعد وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ اس زمانے میں انھوں نے متعدد فلموں کے مکالمے اور گانے لکھے۔ وہ کراچی کے مشہور فلمی رسالے ”نگار“ (ہفتہ وار) کے مستقل فلمی معاون تھے۔ اس میں وہ مختلف ناموں سے ہر ہفتے کئی کئی مضمون لکھتے رہے۔ یہ تعلق تقریباً دو برس تک قائم رہا۔

مجید لاہوری (ف: جون ۱۹۵۷ء) اور ان کا ہفتہ وار مزاحیہ اخبار ”نمکدان“ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ”نگار“ سے علاحدہ ہونے کے بعد جمالی نے ”نمکدان“ اپنی تحویل میں لے لیا۔ وہ دو برس تک اس کے مرتب رہے۔ زیادہ حصہ اس کا بھی ان کے قلم سے ہوتا تھا۔

۱۹۶۳ء میں وہ روزنامہ ”انجام“ (کراچی) کے مدیر مقرر ہو گئے۔ اسی سال انھوں نے روس کا دورہ کیا۔ دو سال بعد مئی ۱۹۶۵ء میں وہ ایک سرکاری ادارے ”نیشنل ان ویسٹ منٹ ٹرسٹ“ کے افسر تعلقات عامہ نامزد ہو گئے، لیکن یہاں سال بھر بھی مشکل سے گزرا ہو گا کہ حکومت چین نے ان کی خدمات حاصل کر لیں اور وہ ریڈیو پکنگ کے رسالے ”تصویر چین“ میں مترجم ہو کر چلے گئے۔ چین سے ۱۹۶۹ء میں واپس آئے۔

وہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے بانیوں میں تھے۔ ۱۹۶۲ء-۱۹۶۴ء تک دو سال اس کے سکریٹری رہے اور کچھ مدت اس کے رسالے ”ہم قلم“ کی ادارت بھی کی۔ بعد کو اس سے بھی تعلقات منقطع کرنا پڑے، اور انھیں بسر اوقات کے لیے ریڈیو اور فلمی رسالوں کا سہارا لینا پڑا۔

۱۹۷۰ء میں کراچی سے فیض احمد فیض نے ایک ہفتہ وار ”یل دنہار“ شروع کیا

تھا۔ جمالی اس میں اپنا کالم "گر تو بڑا نہ مانے" لکھنے لگے۔ لیکن یہ تعلق بھی زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد جمالی نے اپنا ذاتی پرچہ "انقلاب" (ہفتہ وار) جاری کیا۔ لیکن اس نے بھی پانچ شماروں کے بعد دم توڑ دیا۔

انجمن اردو، فارسی، انگریزی تینوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ اردو اور انگریزی میں بیشکلف لکھتے تھے۔ فارسی میں ان کا کوئی مضمون نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن اس میں گفتگو اور تقریر وہ بڑی روانی سے کرتے تھے۔ وہ انجمن صحافیان پاکستان کی مجلس عاملہ کے رکن بھی تھے۔

انہی صلاحیتوں کا مالک اور کامیاب غزلگو اور طنز نگار ہونے کے باوجود افسوس کہ ان کے مزاج میں استقلال نہیں تھا۔ انجمن آرا اور انجمن ساز قسم کے انسان تھے۔ لاابالی پن گویا ان کے خمیر میں تھا۔ ہر وقت دوستوں کے حلقے میں خوش گیلیوں میں مصروف رہتے۔ اسی لیے عمر بھر پریشان رہے اور کوئی دیر پا کام نہ کر سکے۔ اور تو اور اپنا کلام تک جمع نہیں کیا۔ حافظہ بہت اچھا تھا، اس لیے جو کچھ کہا، سب یاد تھا؛ ضرورت پڑے پر وہ لمبی لمبی نظمیں (طنز بہ اور مزاحیہ) اور غزلیں سنا دیتے تھے۔

آخری عمر میں انھوں نے صحافت سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور لمبر اوقات کے لیے ایک سیمنٹ ایجنسی چلانے لگے تھے۔ اسی کاروبار کے سلسلے میں ۱۰ اگست ۱۹۷۲ء ہفتے کے روز جیدر آباد (سندھ) گئے۔ اگلے دن شام کو کراچی واپسی ہوئی۔ رات سوتے میں شدید کمر درد کی شکایت کی۔ صبح (۱۲ اگست) دل کا دورہ پڑا۔ فوراً اسپتال منتقل کرنے کا انتظام کیا گیا، لیکن رستے ہی میں جان بحق ہو گئے۔ اسی دن مغرب کے بعد سخی حسن دربار قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ شادی خاصی دیر سے ۱۹۷۲ء میں کی تھی۔ دو کمسن لڑکیاں ان کے سوگواروں میں ہیں۔

افسوس کہ ان کے کلام کا مجموعہ آج تک نہیں چھپا۔ اپنی بے پروائی اور لاابالیانہ پن

کی بدولت کبھی کوئی باقاعدہ بیاض تک نہیں رکھی۔ مندرجہ ذیل تین غزلوں مختلف رسائل سے جمع کی گئی ہیں:

کسی حبیب، نہ کسی نازنین کی بات کرو
 اہو سے بھیگی ہوئی آستیں کی بات کرو
 گماں ہے موت، یقین موت کا جواب صواب
 گماں سے ہاتھ اٹھاؤ، یقین کی بات کرو
 مقام آہ و فغاں سے گزر چکی ہے حیات
 نگاہ گرم و دم آتشیں کی بات کرو
 زمیں ہے پیاسی اسے خون دل کے چھینٹے دو
 پھر اس کے بعدے وانگیں کی بات کرو
 مہ و ستارہ کی محفل بڑی حبیب ہے، مگر
 زمین والو! کچھ اپنی زمیں کی بات کرو
 سیاہی شب، بحراں کی داستاں چھوڑو
 سحر قریب ہے مہر مہربان کی بات کرو
 شکستِ گل کے فسانے تو سن چکے ہیں بہت
 شکستِ خاطر اندوگاہیں کی بات کرو

باعناں کو مائلِ شر و کچھ کر چپ ہو گئے
 اس چمن میں ہم ہی کیا سب دیدہ و رچپ ہو گئے
 گر می محفلِ جویوں باقی رہی، تو کیا رہی
 اہل دل چپ ہو گئے، اہل نظر چپ ہو گئے
 رات اس محفل میں کس شوریدہ سر کا ذکر تھا
 ساز نوئے راگ بہکے نغمہ گر چپ ہو گئے

اک شبستاں نور کو ترسا کیا، ترپا کیا
 سوئے یزداں دیکھ کر شمس و قمر چپ ہو گئے
 کارواں کٹنے کا غم بھی رفتہ رفتہ دھل گیا
 رنگرز سپر سو گئی، اہل سفر چپ ہو گئے
 کم نہ تھے نازک مزاجی میں کسی سے ہم، مگر
 رنج دینے والے کو پہچان کر چپ ہو گئے
 اپنے دل کی دھڑکنیں ہم بھی سنانے آئے تھے
 قلبِ عالم کو دھڑکتے دیکھ کر چپ ہو گئے

داستانِ غم میں لفظِ آسماں رہنے دیا
 ایک نکتہ ستھا کہ محتاجِ بیاں رہنے دیا
 ان کو دیکھا، پھر بھی نظروں سے نہاں رہنے دیا
 اپنی آنکھوں پر حجابِ گلستاں رہنے دیا
 گل کو چوما، چاند کو دیوانہ دار آواز دی
 ایک پردہ ان کے اپنے درمیاں رہنے دیا
 اس جہاں سے سرکشی کی، اس جہاں سے خود سری
 لیکن اک نازک سا سنگِ آستاں رہنے دیا
 اپنی پلکوں پر چین کے سارے آنسو لے لیے
 گل کو خنداں، بلبلوں کو نغمہ خواں رہنے دیا
 کیا بھٹکتے چشمہ حیواں کی خاطر در بدر
 اپنے پاس اک غم ستھا، اس کو جاوداں رہنے دیا
 اے جمالی! بسکہ اک گلشن سے نسبت تھی ہمیں
 اپنے نغموں میں بھی اندازِ فغاں رہنے دیا

ٹھاکر پونچھی، جگن ناتھ

ان کا اصلی نام سوہن لال تھا، لیکن مشہور جگن ناتھ کے نام سے ہوئے۔ وہ پونچھ کے ایک راجپوت خاندان میں ۳۱ دسمبر ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ پونچھ اس زمانے میں ریاست جموں و کشمیر کی ذیلی باجگزار ریاست تھی۔ ان کے والد بابو بھیم سین کو درزشی کھیلوں، خاص کر پولو اور نیزہ بازی میں خاص مہارت حاصل تھی، اسی باعث وہ راجہ صاحب پونچھ کے بڑے چیتے اور منہ چڑھے تھے اور اس کے باوجود کہ سرکاری طور پر محض ریاست کے محکمہ حسابات میں ملازم تھے، راجہ صاحب موصوف کی نجی محفلوں میں بھی برابر شریک رہتے تھے۔ شاید حکمران خاندان سے دور نزدیک کی کچھ رشتے داری بھی ہو۔ غرض ٹھاکر پونچھی بھی بچپن سے محل میں آنے لگے اور ان کی تربیت اچھے مرنہ الحال طبقے کے ڈھنگ پر ہوئی۔ پھر جب تعلیم کا زمانہ آیا، تو اول انھیں مقامی دکتوریہ جوبلی اسکول میں اور بعد کو تکمیل کے لیے پرنس آف ویلز کالج (حال گاندھی میموریل کالج) جموں میں بھیجا گیا، جہاں سے انھوں نے بی اے کی سند لی۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ اولاً چندے محکمہ سول سپلائی میں ملازم رہے۔ لیکن ان کی طبیعت کی جولانی کے لیے یہ میدان بہت تنگ تھا۔ وہ محض کلر کی اور بے عملی کی زندگی پر قانع نہیں رہ سکتے تھے۔ مشہور ہے کہ بچپن میں وہ گلی محلے کے بچوں کو ساتھ لے کر ڈرامے کھیلا کرتے تھے، اور سب لوگ انھیں جتھہ دار کے نام سے پکارتے تھے۔ اس سے ان کے مزاج کے رجحان کا پتا چلتا ہے۔ وہ واقعی علمی اور ادبی صلاحیتیں لے کر آئے تھے۔ چنانچہ جب

سول سپلائی کے محکمہ سے دل اُچاٹ ہو گیا، تو ۱۹۴۸ء میں دہلی چلے آئے۔ آدمی دجیہیں اور شکل و صورت کے لحاظ سے اچھے تھے، کچھ سفارشوں نے بھی کام کیا ہوگا، بغرض انھیں یہاں جلد ہی اعلیٰ انڈیا ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ یہاں وہ ڈوگری نیوز سروس میں سب ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔

دہلی اس زمانے میں پنجاب سے آئے ہوئے پناہ گزینوں سے سی پڑی تھی۔ یہ لوگ جو بھوکے ننگے جان بچا کر یہاں آئے تھے، اور جن کے پاس سر چھپانے کے لیے آسمان کی چھت کے سوا کچھ کانا نہیں تھا، ہر طرح کی مدد کے مستحق اور طلبگار تھے۔ ٹھہا کر پوچھنے کے کچھ اور فنکاروں کے تعاون سے ڈرامے کیے اور پروگرام بنائے، جن کی آمدنی انھوں نے شری رام تھی ری لیف فنڈ میں پیش کر دی۔ اس کے لیے کچھ ڈرامے خود بھی لکھے تھے۔

دہلی میں وہ دسمبر ۱۹۶۱ء تک رہے۔ اس کے بعد اسی عہدے پر جموں ریڈیو اسٹیشن میں تبادلہ ہو گیا۔ انھوں نے خاص طور پر ڈوگری علم و ادب اور کلمہ کے فروغ میں نمایاں کام کیا۔ وہ ریاستی اکادمی کے بھی رکن تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی افسانہ نویسی سے شروع کی تھی۔ ان کا پہلا افسانہ غالباً "خانہ بدوش" تھا جو ۵۰ء میں "ایشیا" (ہفتہ وار) بمبئی میں چھپا۔ ۲۴ برس بعد اپنی موت تک انھوں نے کوئی دو درجن ناول اور افسانوں کے تین مجموعے شائع کیے۔ ان کے بعض ناولوں اور افسانوں کا ملک کی دوسری زبانوں، بنگالی، پنجابی، ملیالم، ہندی، میں بھی ترجمہ ہوا۔ ان کے چند ناولوں کے نام یہ ہیں: ڈیڈی، دادیاں اور دیرانے، رات کے گھونگٹ، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، زلف کے سر ہونے تک، چاندنی کے سایے، یادوں کے کھنڈر، پیاسے بادل، اداس تنہائیاں، جب پتھر روتے ہیں، یہ رشتے بیدار، پت بھڑکے بھڑکے، بھنڈو وغیرہ۔ زندگی کی دوڑ، چناروں کے چاند، آدھے چاند کی رات، افسانوں کے مجموعے ہیں۔

وہ ڈوگری میں بھی بلا تکلف لکھتے تھے۔ ان کی تحریریں ہماری زندگی اور عوام کے مسائل کا اچھا مرتعہ ہیں۔

زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے ایک نیا ناول لکھنا شروع کیا تھا۔ "اب میں وہاں

نہیں رہتا، اسے انھوں نے ۱۴ اگست ۱۹۷۴ء کو مکمل کیا اور آخری صفحے پر یہ لفظ لکھا:
 . اہنا پرودہ

" پرنام
 " سلام
 " خدا حافظ

" سب کچھ دور ہے۔ سب کچھ پاس ہے، صرف احساس کی بات ہے۔"
 یہ آخری لفظ لکھ کر وہ سر پر کو میز سے اٹھے اور دفتر سے باہر کچھ کھانے پینے کے لیے گئے۔
 شرک پر پہنچے ہی تھے کہ ایک ٹیز آتی ہوئی جیپ ان سے ٹکرائی۔ دماغ کو ضرب شدید آئی،
 جس سے بیہوش ہو گئے۔ فوراً مٹری ہمارا جاگلاب سنگھ اسپتال پہنچا یا گیا، جہاں اسی
 بیہوشی کے عالم میں جمعہ ۱۶ اگست (۱۹۷۴ء) صبح طائر روح نفسِ عنصری سے پردہ اڑ کر
 گیا۔ موت سے کوئی تین مہینے پہلے سے انھوں نے "کہانی ختم" قصہ ختم" کے الفاظ
 کو اپنا تکیہ کلام بنالیا تھا۔ اس وقت انھیں کیا معلوم ہو گا کہ واقعی اتنی جلد ان کی جیون
 کہانی یا قصہ حیات ایسے المناک طریقے پر ختم ہونے والا ہے۔
 ۱۹۷۶ء میں پونچھ کے وزیر خاندان میں شادی ہوئی تھی، لیکن بیوی سے نبھ سکی اور کوئی
 ڈیڑھ دو سال میں علیحدگی ہو گئی۔ لاولد فوت ہوئے۔ وہ ہر کسی کے دوست، ہمدرد اور
 غمخوار تھے۔ ان کے جنازے کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا جو
 ہجوم تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے مقبول اور ہر دل عزیز تھے۔

بہزاد لکھنوی، سردار احمد خان

۱۹۰۰ء میں اپنے خاندانی مکان، امین آباد پارک، لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ خاندان مذہبی خیالات کا اور وہ بھی متوسط الحال مہتمم کا تھا، اس لیے تعلیم کے پہلو سے تشفی بخش انتظام نہ ہو سکا۔ پھر بھی شتم و شتم بڈل کے درجوں تک اُردو، فارسی، عربی اور کچھ انگریزی حاصل کر لی۔ جب معاش کا مسئلہ پیش آیا، تو ریلوے کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ وہ بدلتوں، ٹی، ٹی، ای سی (چلتی گاڑی) میں فکٹ معائنہ کرنے والے کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کے خاندان کا بریلی کی درگاہ نیاز سے پرانا تعلق تھا، یہ بھی وہیں مرید تھے۔ اس لیے نماز روزے کے سختی سے پابند تھے۔ بچپن سے قوام کے تیلے اور جسم کے کمزور تھے ہی، متواتر سفروں نے اسی سہی کسر پوری کر دی اور بیمار رہنے لگے۔ صحت سقیم، فرائض منصبی میں متواتر لمبے سفر لازم، جن میں بعض اوقات راتوں کو جاگنا پڑتا، اس پر مذہبی ریاضت۔ غرض صحت نے بالکل جواب دے دیا اور اختلاجِ قلب کے دورے پرنے لگے۔ گھنٹوں پہوش پڑے رہتے، اسے یار لوگوں نے حالتِ جذب سے تعبیر کیا۔ جب صحت کچھ بہتر ہوئی، تو اب نئی اور نسبتہ سکون کی ملازمت کی تلاش میں دلی آ گئے۔ اس زمانے میں یہاں آل انڈیا ریڈیو کے اصحاب مجاز بڑے ہمدرد مہتمم کے لوگ تھے، ان کی عنایت سے نوکری مل گئی اور میضون (سکرپٹ) لکھنے پر مقرر ہو گئے۔ دلی میں وہ تین چار برس رہے۔ یہی زمانہ بچے جب میں نے انہیں دیکھا۔

اختلاجِ قلب کے مرض سے انہیں آفاقہ تو ہو گیا، لیکن اس کے بعد سے وہ مستقلًا موت کی

اچھی خاصی بوٹی دوسری رسی گٹے میں ڈالے رہتے۔ جب کلام پڑھتے پڑھتے جوش میں آجاتے تو دونوں ہاتھوں سے اسے کھینچنے لگتے تھے۔ چونکہ وہ دوسری تھی اس لیے نیچے اوپر چلتی رہتی اور اس سے گلا گھونٹے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ میں جس ملاقات کا ذکر کر رہا ہوں اس دن طبیہ کالج (قدوباغ) دلی کے کسی مشاعرے میں کلام سنانے کے لیے اسٹیج پر آئے تھے۔ میں نواب سائل مرحوم (ف: ۱۹۲۵ء) کے قریب بیٹھا تھا۔ برابر میں کسی نے کہا: "اے یہ گلے میں رسی کیوں ڈالے ہوئے ہے اور اسے کھینچ کیوں رہا ہے؟" اس پر سائل صاحب بولے: "بھائی، یہ دیوانہ ہے، لیکن بکا و خوش ہشیار۔ اگر کھینچنے کو رسی نہیں ہو، تو یہ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے گا۔"

بہزاد اگرچہ یہاں ہر طرح خوش تھے، لیکن ۱۹۲۰ء میں وہ ریڈیو کی لڑکھائی ترک کر کے پچھلی فلم کمپنی، لاہور میں مکالمہ نویس بن کر چلے گئے۔ لاہور میں وہ تین برس رہے تھے۔ وہاں کا معاہدہ ختم ہوا تو وہ دوبارہ ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا ریڈیو میں آگئے، اب کے ان کا لکھنؤ اسٹیشن میں مضمون (سکرپٹ) لکھنے پر تقرر ہوا۔ دو سال بعد، ۱۹۲۵ء میں انھیں راج کمل کلامتار بھٹی نے اپنی فلموں کے لیے گیت لکھنے پر ملازم رکھ لیا۔ وہ ۱۹۵۱ء تک بھٹی میں رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے ۴۰-۵۰ فلموں کے لیے گیت لکھے ہونگے۔ اسی سال پاکستان چلے گئے، جہاں جمعہ کے دن ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو قریب مغرب ان کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ سخی حسن درگاہ کے قبرستان (کراچی) کی چار دیواری کے باہر اس لحاظ خاص میں دفن ہوئے، جہاں ان کے سلسلے کے لوگوں نے درگاہ تعمیر کی ہے۔

بہزاد سب اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ غزل، گیت، نظم کا وافر ذخیرہ ان کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن ان کی خصوصی شہرت نعت نگاری کی حیثیت سے ہوئی اور اس میں شہرہ نہیں کہ ان کی نعت میں خاص کیفیت اور درد ہے۔ لحن سے پڑھتے بھی خوب تھے۔ ان کے متعدد مجموعے شائع ہوئے تھے۔ ان میں سے نغمہ نور، موجِ طور اور چراغِ طور بہت مقبول ہوئے۔

افسوس کہ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ تلاشِ بسیار کے باوجود دستیاب نہ ہو سکا۔ بعض سال

میں شائع شدہ چند غزلیں ملیں، انھیں میں سے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔ کلام میں بھی تصوف کا رنگ غالب ہے، جوان کی زندگی کا مابہ الامتیاز تھا:

اک عجیب عالم ہے حسن کی یہ دنیا بھی
راہبر سے کیا پوچھوں راہزن سے کیوں بھلوں
میں سے چھینی کیوں ہے غم کا اک سہارا بھی
جس جگہ نظر آئے جلوہ گر بھی، جلوہ بھی
ہاں، یہیں پہ ہوتا ہے زندگی کا سودا بھی
عجیب دور سے لے جانِ جاں گذرتی ہے
خدا گواہ کہ بیاختہ ابھرتی ہے
دفور زحمت و آلام سے بھرتی ہے
جو موح ڈوب چکی تھی وہ خود ابھرتی ہے

تجھے خبر ہے مرے سوزِ عشق کی، پھر بھی
بتا تا کہ تری زلف کیوں سنو رتی ہے

تو بے زلف درخ کا یہ رنگیں نظام
مبارک، مبارک، اٹھی خود نقاب!
میں کیوں راہبر! تجھ کو تکلیف دوں
وہ اٹھی، وہ اٹھی کسی کی نظر
نہ اپنی خبر ہے، نہ دل کی خبر

ہے، بیخود سا بہر ادِ مضطر، مگر

ہے اس کے لبوں پر تمھارا ہی نام

یہ تو ہی بتائے زاہد! ہے ریا کہ بے ریاں
تو بے آستان کے صدف، کوئی حد بھی کیف کی ہے
میں جہاں سے منھ پھرا کر تے پاس آ رہا ہوں
مرا جذبہ نہ دامت، تری شان پادشاہی
کہیں مست ہو نہ جائے، مرادوق جہہ سانی
کوئی اور کیا بھر گیا مرا کا سہ گدائی

مری الجھنوں سے پوچھو، مری دھڑکنوں سے پوچھو
 بڑی منزلوں سے گزری ہے جنوں کی نارسائی
 مری زندگی ہے سستی، مری زندگی کا حاصل
 نہ جنوں نہ ہوشمندی، نہ دفا، نہ بیوفائی
 مری بیخودی تصدیق، مری مستیاں بچھاؤ
 وہ ادھر ہی آ رہے ہیں، بکمالِ درباری
 تری رہگذر کے پھیرے، ترے آستان کے سجد
 یہی ہیں مری خطائیں، یہی میری پارسائی

خبر نہ تھی تیری جستجو میں، کشاکش رہروی ملیگی
 قدم قدم پر جہیں جھلکی، قدم قدم آگہی ملیگی
 تمہیں مبارک مرا ٹپنا، مجھے مبارک تمہارا جلو
 یہ دونوں عالم رہیں سلامت، جہاں کو آسوی ملیگی
 نہ ڈھونڈم کو نگاہِ عالم، جہاں یہ میں ہوں جہاں وہ ہو
 جہاں بھی کھویا ہوا ملیگا، فضا بھی کھوئی ہوئی ملیگی
 ابھی نہ چھڑو، ابھی نہ چھڑو، ابھی تو ذوقِ طلب میں ہو
 یہ راز کیوں مجھ پہ کھوئے تھے ہو کہ اور مشکل ابھی ملیگی
 خودی کے دھوکے میں آ رہا ہوں جنوں سے من بجا رہا ہوں
 سمجھ رہا ہوں یقین میں بھنس کر، سکون کی زندگی ملیگی
 ہمیں تو ہر ذرہ میکہ ہے کہ ہم تو ہیں تیرے رند، ساقی!
 مگر کہاں مستیاں ملینگی، مگر کہاں بیخودی ملیگی!
 گماں کے ہاتھوں خرابِ خستہ، کدھر یہ دیوانے جا رہیں
 کہیں نہ کعبہ نہ بتکدہ ہے، ملی تو ان کی گلی ملیگی

محشر مرزا پوری، مرزا فرزند علی

یکم جنوری ۱۸۹۸ء کو مرزا پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم علی صاحب تھے، جو بچوں کو نجی تعلیم دینے کے لیے اس دور میں خاصی شہرت کے مالک تھے۔ فرزند علی صرف پانچ برس کے تھے، جب ان کا انتقال ہو گیا۔ محشر صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد کے بعض شاگردوں سے گھر ہی پر حاصل کی؛ اور اس کے بعد بمبر سولہ سال ۱۹۱۲ء میں مقامی لندن مشن ہائی اسکول (حال بابوالا جیسوال انٹر کالج) سے دسویں درجے کا امتحان اول ڈویژن میں پاس کیا۔ اس طرح وہ اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی میں خاصی لیاقت کے مالک ہو گئے۔ چونکہ خاندان کی ذمہ داریاں مزید تعلیم کے رستے میں حائل تھیں، اس لیے اسخوں نے بسر اوقات کے لیے ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اولاً چند مرزا پور کلکٹریٹ میں نوکری کی۔ ۱۹۱۸ء میں ان کی شادی الہ آباد میں ہو گئی اور یہ اگلے برس وہاں چلے گئے۔ یہاں کوئی سال بھر ڈسٹرکٹ بورڈ میں کام کیا اور اس کے بعد خفیہ پولیس کے محکمے میں بھرتی ہو گئے۔ شروع میں کرایے کے مکان میں قیام رہا۔ بعد کو جب حالات سازگار ہو گئے، تو ۱۹۲۸ء میں وہیں محلہ بچی پور میں اپنا مختصر مکان خرید لیا۔ ملازمت اور اس کے بعد بھی اپنی وفات تک وہ اسی مکان میں مقیم رہے۔

۱۹۳۹ء میں ان کا دفتر الہ آباد سے لکھنؤ منتقل کر دیا گیا، تو یہ بھی اس کے

ساتھ وہاں بھیج دیے گئے۔ نہ معلوم کیوں، وہاں کی آب و ہوا ان کے راس نہ آئی اور اکثر بیمار رہنے لگے، خاص طور پر آنکھوں میں سخت تکلیف پیدا ہو گئی اور بینائی بتدریج کمزور ہونے لگی، اس پر ان کا الہ آباد کے ایک متعلقہ دفتر میں تبادلہ ہو گیا، لیکن اس سے بھی چنداں فائدہ نہ ہوا، رفتہ رفتہ بصارت بالکل جاتی رہی۔ آخر اسی باعث، انہیں قبل از وقت ۱۹۴۷ء میں ریٹائر ہونا پڑا۔

ان کا الہ آباد کے جناب راحت حسین کی صاحبزادی سے نکاح ہوا تھا۔ ان کے بطن سے آٹھ بچے ہوئے: پانچ لڑکے (محمد علی مضطر، غضنفر علی غضنفر، اظہر علی، حیدر علی صفدر علی) اور تین لڑکیاں (قیصر جہان، انیس جہان، فردوس جہاں)۔ بڑی بیٹی قیصر جہان کا ان کی زندگی میں انتقال ہو گیا تھا۔ باقی سب بچے بفضلہ تعالیٰ زندہ سلامت موجود ہیں۔

انہوں نے ۱۹۲۲ء میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ آغاز سخن گوئی میں پروفیسر ضامن علی ضامن صدر شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی کے برادرِ خور و مید حامد علی حامد مرحوم سے مشورہ رہا۔ پھر سید حسن مرتضیٰ شفیق عماد پوری تلمیذ امیر مینائی سے رجوع کیا۔ شفیق نے چند غزلیں دیکھنے کے بعد فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔ اس کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی۔ افسوس کلام کا مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو فالج کا حملہ ہوا اور ہفتہ بھر بعد بروز جمعہ یکم نومبر ۱۹۷۴ء کو دن کے دس بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔ جنازہ اگلے دن ہفتے کو بوقتِ صبح اٹھا، اور انہیں ہمت گنج کی کربلا میں اپنے خاندان کے بیشتر دوسرے لوگوں کے قریب دفن کر دیا گیا۔

عمر بھر کی مشق و مزدورت اور اساتذہ کی صحبت کا اثر تھا کہ ان کا کلام زبان اور فن کے پہلو سے بے عیب ہو گیا، اور انہوں نے خود استاد

کا درجہ حاصل کر لیا۔ افسوس کہ ان کا مجموعہ کلام آج تک شائع نہیں ہوا۔
 نمونے کے چند شعر درج دیل ہیں؛

میں اسی شبہ میں گمراہ ہوا جاتا ہوں
 بی وفا کہتی ہے دنیا جسے، وہ تم تو نہیں!
 بدگماں کیوں نظر آتی ہیں تمھاری نظریں
 خامشی میری بہ اندازِ تکلم تو نہیں!
 اے تمناؤں کے خالق! خلشِ غم کے خدا!
 عشق ہی حسن کا معصوم تبسم تو نہیں!

یہ مانا چھین گیا آنکھوں کا نور اے محشر! تو کیا جو دل میں تھی میرے وہ روشنی بھی گم
 خطا معاف، ہم اس زندگی سے باز آئے نفسِ نفس کا ہمارے شمار ہوتا ہے
 تو بہارِ سنِ فطرت، میں جموں عشقِ رسوا
 تری زندگی حقیقت، مری زندگی فسانہ

یہ زمانے میں نہیں دم کہ مٹا دے مجھ کو محشر! میں زمانے سے نہیں ہوں، مردم سے ہے زمانہ
 عشق بہارِ بیخزاں، عشق سرورِ جاوداں عشق کا غم نشاطِ جاں، عشق سے دل جبرِ کھر
 مرنے کا ٹھکانہ مل تو گیا، جیسے کا سہارا ہو تو گیا
 امید کی دنیا بس تو گئی، کچھ ان کا اشارہ ہو تو گیا
 اے دردِ فراق! اے دشمنِ جان! اے زندگی غم کے سماں!
 تھے قلبِ جگر جس سے لرزاں، صدمہ وہ گوارا ہو تو گیا
 کلیوں کا تبسم غائب ہے، پھولوں کے ہیں چہرے پر مردہ
 لیکن ہم اس پر سچوے ہیں، گلزار ہمارا ہو تو گیا

خموشی رات میں، جب کائنات ہوتی ہے
 ترے خیال سے تا صبح بات ہوتی ہے

تاج ٹونکی، نواب محمد اسماعیل علی خان بہادر (والی ٹونک)

انگریزی زمانے کے راجپوتانے میں ۲۲ ریاستیں تھیں؛ اور ٹونک ان میں واحد مسلم ریاست تھی۔ اس کی بنیاد امیر الدولہ نواب محمد امیر خان (ف ۱۸۳۴ء) نے انگریزوں کے ساتھ طویل کشمکش کے بعد ایک عہد نامے کی رو سے نومبر ۱۸۱۷ء میں رکھی تھی۔ علم و ادب کی سرپرستی اور اسلامی شعائر کی حفاظت اور پابندی ہمیشہ اس ریاست کا خاص شعار اور طرۂ امتیاز رہی۔ حضرت سید احمد بریلوی کی مہم کی ناکامی کے بعد ان کے یقیۃ السیف قافلے کے بیشتر مجاہدین کو یہیں پناہ ملی تھی، محلہ ”قافلہ“ انھیں اسی کا بسایا ہوا ہے۔ ٹونک کے دوسرے حکمران نواب وزیر الدولہ محمد وزیر خان (ف ۱۸۶۲ء) کا نام غالب کی سوانح حیات میں بہت نمایاں ہے۔

نواب محمد اسماعیل خان اسی سلسلۃ الدہب کی ایک کڑی تھے۔ وہ ۳۱ جنوری ۱۸۱۷ء کو ٹونک میں پیدا ہوئے۔ وہ چوتھے فرمانروا نواب محمد ابراہیم خان صولت جنگ کے بیٹے تھے۔ اور بظاہر ان کے والی ریاست ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا، لیکن مقتدر کو کون ٹال سکتا ہے! نواب محمد ابراہیم خان کے انتقال (۲۳ جون ۱۸۳۱ء) پر ان کے بیٹے سعید الدولہ نواب سعادت علی خان سعیدان کے جانشین ہوئے۔ وہ سبھی تقریباً پندرہ برس کی جہان بینی کے بعد جمعہ ۲۳ مئی ۱۸۶۷ء کو رانگراے عالم جاودانی ہوئے۔ چونکہ ان کے کوئی فرد نہر سینہ نہیں تھا، ان کے چھوٹے علاقے سجائی ممتاز الدولہ فاروق علی خان گدی پر بیٹھے۔ لیکن اس پر شکل

سے چھ مہینے گزرے ہونگے کہ ان کا اچانک دلی میں انتقال ہو گیا۔ ان کے بھی کوئی نرہینہ اولاد نہیں تھی۔ اب ان کے برادر خور و محمد اسماعیل خان (جو باقی بھائیوں میں سب سے بڑے تھے) ان کے جانشین قرار پائے۔ جب تک حکومت ہند کی طرف سے اس کی باقاعدہ توثیق نہیں ہو گئی، تاریخ ادب اردو کے مصنف جناب رام بابو سکسینہ (ف: ۱۹۵۷ء) جو یوپی میں کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے، ریاست کے منتظم قرار پائے۔ بعد کو حکومت ہند نے ۱۱ فروری ۱۹۴۸ء کو نواب محمد اسماعیل خان کی تخت نشینی کی منظوری دے دی، تو سکسینہ صاحب ہی وزیر اعلیٰ بنا دیئے گئے تھے۔ انھوں نے عزیز الدولہ امیر الملک کا لقب اختیار کیا تھا۔

لیکن ملک آزاد ہو چکا تھا اور حکومت ہند چاہتی تھی کہ ویسی ریاستیں بھی ملک کے نظم و نسق میں ضم ہو جائیں۔ چنانچہ اس دعوت پر لیبیک کہتے ہوئے نواب محمد اسماعیل خان بہادر نے بھی ٹونک کو مارچ ۱۹۴۸ء میں راجستھان سے ملا دیا۔ اس کے باوجود ان کے لیے ٹونک کی رعایا کی محبت اور احترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اسی طرح یہاں کے لوگوں کا ملجا و ماوا بنے رہے۔

جمعرات ۲۱ نومبر ۱۹۷۴ء کو بعد ظہر بجائے کینسر اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ تجہیز و تکفین اگلے دن صبح گیارہ بجے ہوئی۔ جنازے کے ساتھ ہزاروں ہندو مسلمانوں کا مجمع تھا۔ ہر طرف سے جنازے پر گلباری ہو رہی تھی اور کوئی آنکھ ایسی نہیں تھی جو شکبار نہ ہو، موتی باغ (شاہی قبرستان) کے قطعہ خاص میں اپنے پردادا نواب وزیر الدولہ کے سرمانے سپرد خاک ہوئے۔

ان کے بھی اولاد نہیں تھی۔ اہل خاندان اور ٹونک کے عوام نے ان کے چھوٹے علاقے بھائی نواب معصوم علی خان کو ان کا جانشین قرار دیا۔

نواب محمد اسماعیل علی خان نے ہوش سنبھالا، تو اپنے ارد گرد علم و فضل اور شعر و سخن کی فضا دیکھی۔ ان کے والد نواب محمد ابراہیم علی خان خود بھی شاعر تھے؛ خلیل شمس تھا۔ وہ مضطر اور پھر بسمل سے مشورہ سن کرتے رہے تھے۔

نواب محمد اسماعیل خان کی تعلیم کا معقول نجی انتظام ہوا تھا، انھوں نے مختلف علوم متعدد اساتذہ سے حاصل کیے۔ بعد کو انگریزی تعلیم کے لیے میو کالج، اجیر بھیجے گئے اور وہاں ایک انگریز ماہر تعلیم تالیق کی نگرانی میں چند برس رہے۔ ٹونک اس زمانے میں شعر و ادب کا شہر تھا۔ یہاں نواب محمد ابراہیم علی خان خلیل کی سرپرستی کے باعث شاعری کا دور دورہ تھا۔ اساتذہ وقت نواب سلیمان خان بہادر اسد لکھنوی، سید محمد حسین بسمل خیر آبادی، سید محمد افتخار حسین خان مضطر خیر آبادی، سید ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی اور ان کے تلامذہ نے ٹونک کو حریف دہلی و لکھنؤ بنا دیا تھا۔ شاہی خاندان کے بیشتر افراد اور شہر کے لوگ شعر سے دلچسپی لیتے تھے اور آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ ایسی فضا میں اگر نوجوان محمد اسماعیل خان بھی شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے تو اس میں تعجب کا کیا مقام ہے! چنانچہ انھوں نے تاج تخلص اختیار کیا اور اردو میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

انھوں نے مشورہ سخن مولانا عبدالقادر خنداں ننگینوی ثم اجیری سے کیا، جو عربی، فارسی کے عالم اور اردو کے صاحب فن کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انھوں نے خود اپنے کلام پر مفتی مہدی حسن اور مولانا معنی اجیری سے اصلاح لی تھی۔ وہ ۱۹۴۷ء تک اجیر ہی میں رہے۔ آزادی ملک کے بعد حب وہاں کی سکونت مخدوش ہو گئی، تو ٹونک چلے گئے۔ شروع میں بہت دنوں تک نواب صاحب کے کتا بخانے کے مہتمم بھی رہے۔ نواب صاحب مرحوم ان کے بڑے قدر دان تھے۔

تاج مرحوم غزل سے بھی شغف رکھتے تھے۔ ان کے غزلیہ کلام کا دیوان (لمعات تاج) مرتب شدہ خنداں صاحب کے پاس موجود ہے، جس میں سے چند شعرا انتخاب کر کے آخر میں دیے جا رہے ہیں۔ انھیں حضرت رسالت کی ذات ستودہ صفات سے جو محبت اور ارادت تھی، اس کا اظہار اکثر لغت کی

شکل میں ہوتا رہتا تھا۔ اپنے پدر بزرگوار حضرت خلیل کے اتباع میں ربیع الاول میں سات دن تک محفل میلاد کا قیام ان کے عہد میں بھی جاری رہا۔ اس کے اخراجات کے لیے ہزاروں روپیہ اپنی جیب خاص سے عطا کرتے تھے۔ روزانہ بلا امتیاز مذہب و ملت شیرینی تقسیم ہوتی تھی اور آپ کے محل نذر باغ میں چراغاں ہوتا تھا۔ ٹونک کی محفلوں کے بارے میں مولانا منظور الحسن برکاتی کا لکھا ہوا کتاچہ ”ٹونک کے جشن میلاد البنی“ خاصے کی چیز ہے۔ مولانا برکاتی ہی کا مرتب کردہ تاج مرحوم کے نعتیہ کلام کا انتخاب بھی ”تاجدارِ مدینہ“ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (ٹونک ۶۷ ۱۹۶۷) اس کے شروع میں انھوں نے وقیع اور جامع مقدمے کا اضافہ کیا ہے۔ اس پر نواب صاحب مرحوم نے انھیں خطاب اور خلعت سے نوازا تھا۔

انھوں نے اپنے محل ”نذر باغ“ میں پندرہ روزہ مشاعرے کا التزام کیا تھا۔ یہ مشاعرے طرچی ہوتے، اور مصرع خود نواب صاحب مرحوم تجویز کرتے تھے۔ ٹونک کے ممتاز شعرا کے وظائف مقرر تھے۔ باہر سے بھی مشاہیر دعوت پر بلائے جاتے اور ان کے اعزاز و اکرام میں کوئی کمی نہیں کی جاتی تھی۔ اگست ۱۹۶۷ء میں ان کی سرپرستی میں ”تاج اکیڈمی“ قائم ہوئی تھی جس کا مقصد ٹونک کی علمی اور ادبی تاریخ کی ترتیب اور ریاست کے جلیل القدر شعرا و ادبا کی تخلیقات کا تعارف تھا۔ یہ اکیڈمی آج بھی موجود ہے، غرض ان کی وفات سے ایک صاحب علم اور قدردان شعر و ادب شخص ہم سے جدا ہو گیا۔

اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو :

تضمین

ترے اخلاق سے قائم ہوا دنیا کا نظام ایک ہی صف میں کھڑے کر دے آقا و غلام

تلخی بخت کے شاکی ہوئے سب شیریں کلام بحر الطاف و عنایات، محیط اکرام!
 تجھ سے سرسبز و تر و تازہ ریاض اسلام دشت پر خار جہاں، بن گیا گلزار تمام
 تخیل بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام
 زان شدہ شہرہ آفاق بہ شیریں طبعی

تضمین

جگر تھامے ہوئے کوئی، کوئی مضطر، کوئی بیدم
 کسی کے لب پہ آہیں، کوئی محو گریہ پیہم
 غرض میں کیا کہوں پیشِ نظر تھا کو نساء عالم
 ”نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم“
 بہر سو رقصِ لعل بود شب جائے کہ من بودم“

جمالِ حسن پر جس کی فدا جنت کے نظارے سے
 جو دیکھے اک نظر، قدموں پہ اس کے جان و دل وارے
 مجسمِ نو بہارے، گلزارے، کلبک رفتارے
 ”پری پیکر نگارے، سرو قدِ لالہ رخسارے“
 سراپا آفتِ دل بود شب جائے کہ من بودم“

عجب اک کشمکش میں مبتلا تھی، تاج! میری جاں
 زمین و آسمان حیراں، درو دیوار تھے لرزاں
 مجھے لینا تھے خلوت میں کسی سے آج کچھ پیمیاں
 ”رقیبیاں گوش بر آواز، اودرناز، من ترساں“
 سخن گفتن چہ شکل بود شب جائے کہ من بودم“

مجالِ دم زدن ہے اور نہ بارے بیاں، خسرو!
 بیاں کیسے کروں، کیسے کھلے میری زباں، خسرو!

یہ شانِ تاجدارِ تاجدارانِ جہاں، خسرو!
”خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں، خسرو!“

محمد شمع محفل بود شبِ جاے کہ من بودم

اب غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

بھر ہرے ہونے لگے زخمِ جگر، اے ہمنشین! ان کے ہونٹوں پر منہ سی بے اختیار آنے لگی
آج ہی ہم نے کیا تھا عزمِ ترکِ میکشی میکدے پر آج ہی کالی گھٹا چھانے لگی
گاہِ آدابِ محبت کی قسم کھاتا ہوں میں گاہِ آدابِ محبت سے گذر جاتا ہوں میں
تاجِ میری شاعری کیا، بر سرِ محفل کبھی شعر کے پہرے میں دردِ دل سنا جاتا ہوں میں

ہیں قائم بے ستوں لاکھوں تو اہت اور تیارے
کشش کا عشق کی، ادنیٰ سایہ فیضان ہے شاید
گریباں چاک آنکھیں سرخ، چہرہ خاک آلودہ
یہی، اے تاج! اربابِ جنوں کی شان ہے شاید

دل پہ اب اختیار ہے میرا اب بھیں انتظار ہے میرا
ان کے آنے کا کچھ یقین سا ہے آج دل بقیہ راز ہے میرا
جگر میں سوز، دل میں درد، آغشتہ بخوں آنسو
فراہم ہو گئے سامانِ تکمیلِ محبت کے

گذری ہیں میری عشق میں راتیں ہزار ہا طے میں نے کی ہیں عشق کی راہیں ہزار ہا
اتنا ہی لکھ دیا کہ سراپا ہوں شوقِ دید لکھنے کے واسطے تو ہیں باتیں ہزار ہا
تو اس کے التفات سے غافل نہ رہ کبھی اے تاج! حسن کی ہیں ادائیں ہزار ہا

یہ خالی اہلِ دل سے تاج! وہ فرہاد و مجنوں سے

یہ سب آبادیاں جھوٹی، یہ سب ویرانے جھوٹے ہیں

ہوشِ ہستی، نہ تابِ نظارہ اب کی کیسی بہار آتی ہے

رہِ عشق میں شوقِ ہوسمہ سفر تو دشواریاں سب ہوں آسانیاں

پوچھتے رہتے ہیں، مرے حالات میں سناتا ہوں، تو جگتے ہیں
 جس کو ہونر لطف پریشیاں سے کسی کا نسبت
 اس کا جتنا کبھی پریشان ہو حال، اچھا ہے
 تاجِ اے عشق کی دنیا کا نرالا دستور
 حال جس کا ہو بُرا، اس کا مال اچھا ہے
 یہ کلتاں تھے جہاں اب ہیں ڈھیر خاروں کے
 یہاں اترتے تھے سوکارواں بہاروں کے
 جھپیں ڈبو یا سخا طوفاں نے، وہ انجبر کے رہے
 نہ انجبرے ڈوبنے والے کبھی کناروں کے

دل بہت بقرار ہے میرا
 دل پہ کیا اختیار ہے میرا

ثمر چھپروی، عبد الحفیظ صدیقی

ان کے خاندان میں ایک طرف عربی علوم اور اسلامیت کی روایت تھی، تو دوسری طرف شاعری اور کالت کا پیشہ۔ ان کے والد مولوی عبد الما جد چھپرہ کے کامیاب وکیل تھے اور اردو فارسی میں شعر بھی کہتے تھے؛ نہرت تخلص تھا۔ انھیں "تاریخ لوی" میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ تاریخی نام سے اپنا مجموعہ کلام "بیان الغرائب" کے نام سے مرتب کیا تھا، جو غیر مطبوعہ رہ گیا۔ ان کے والد (یعنی ثمر کے دادا) مولوی بخش علی عربی اور فارسی کے عالم، دینیات کے فاضل اور فارسی کے شاعر تھے۔ انھیں بھی "تاریخ گوئی" میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ان کا غیر مطبوعہ دیوان بھی خاندان میں موجود ہے۔

ایسے ماحول میں ثمر (عبد الحفیظ) کی یکم فروری ۱۹۱۳ء کو چھپرہ (محلہ دھیانوال) میں پیدائش ہوئی۔ وہ آٹھ سبھائی بہن تھے۔ دو سبھائی ان سے بڑے تھے، چاہ چھوٹے، بہن بھی چھوٹی تھیں۔ یہ سات آٹھ برس کے تھے کہ ۱۹۲۰ء میں ان کے دادا مرحوم نے ان کے بڑے سبھائی عبد الحکیم کے ساتھ تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیج دیا۔ یہاں وہ دو برس تک رہے۔ لیکن سیاسی ہنگاموں، بالخصوص خلافت تحریک کے باعث یکمونی نصیب نہ ہو سکی، آخر ان کے والد کے مشورے سے انھیں انگریزی تعلیم دلانے کا فیصلہ ہوا اور یہ پٹنہ واپس آ گئے۔ یہاں چھپرہ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس سے فارغ

ہو کر پٹنہ کالج میں پہنچے۔ درجہ بدرجہ ترقی کر کے بالآخر ۱۹۳۴ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ اس کے بعد وکالت کا امتحان (ایل ایل، بی) بھی پاس کر لیا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد کسبِ معاش کا مرحلہ آیا، تو اپنی سادگی پسند طبیعت کے اقتضا سے شروع میں معلمی کا پیشہ اختیار کیا اور پرسا ہائی اسکول، سارن (بہار) میں ملازم ہو گئے۔ لیکن سبکی حالات کی مجبوری کے باعث یہاں زیادہ دن تک نہیں رہ سکے اور والد کے توسط سے پٹنہ ہائی کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ آدمی محنتی تھے اور اخلاص و ایمانداری سے کام کرنے والے، محکمے میں ترقی ہوتی گئی۔ پہلے ناظم دارالترجمہ مقرر ہوئے اور اخیر میں اوتھو کمشنر۔ اسی عہد سے ۱۹۴۱ء میں سبکدوش ہو کر پھلواری شریف میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

صحت بظاہر حال ہمیشہ اچھی رہی۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں دل کا دورہ پڑا۔ علاج کے لیے اسپتال چلے گئے۔ مہینہ بھر بعد ۲۶ نومبر (۱۹۴۴ء) کو معالجوں نے کہا کہ آپ ٹھیک ہو گئے ہیں، چاہیں، تو مکان پر واپس جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اسی شام پھلواری شریف پہنچے۔ دوست احباب، رشتہ دار سب خوش و خرم تھے، مہنس مہنس کر ان سے باتیں کرتے رہے۔ اچانک دس بجے شب میں طبیعت بگڑ گئی اور اللہ اللہ کرتے جاں بحق ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ درگاہِ مخدوم منہاج الدین رستی میں سپردِ خاک ہوئے۔

ابتدائی ماحول اور تعلیم کے زیر اثر شروع سے ورع و اتقا کی طرف مائل تھے۔ ہمیشہ پابنِ صلوٰۃ و صوم اور عاملِ اوراد و وظائف رہے۔ ان کی نیکی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوا ہے، تو سب نے اتفاق رائے سے نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے انھیں امام بنا دیا۔

ان کی شادی کوئلور (آرہ) میں داروغہ عبدالجلیل کی صاحبزادی (نسیم خانم) سے ہوئی۔

سے ہوئی تھی۔ ان کے لطن سے چار بچے ہوئے: ایک لڑکا (جاوید اقبال) اور تین لڑکیاں۔ ماشاء اللہ سب موجود ہیں۔

جس زمانے میں لکھنؤ میں زیرِ تعلیم تھے، وہاں دارالعلوم میں ایک بزمِ سخن تھی، جس کے اہتمام میں مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ ان کی آٹھ نو برس کی عمر تھی، یہ بھی ان مشاعروں میں جاتے اور وہاں اپنے سے بڑے طلبہ سے شعر لے کر اپنے نام سے پڑھ دیتے۔ یہی تفتن ان کی شعر گوئی سے شوق کی بنیاد بن گیا۔ چھپرہ اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں خود کچھ تک بندی کرنے لگے۔ اور اصلاح کے لیے اسے اپنے دارالعلوم لکھنؤ کے رفیق سید ابراہیم ندوی نجم سابق سپرنٹنڈنٹ اسلامک اسٹڈیز، پٹنہ کے پاس بھیجے گئے۔ اس کا اعتراف ایک شعر میں بھی کیا ہے:-

شاعری آتی نہ تھی دراصل مجھ کو، لے ثمر!

صحبتِ نجم سخنور نے سخنداں کر دیا

چندے بعد نجم نے انہیں اپنے استاد حضرت تمنا عاوی مجیبی (ف: نومبر ۱۹۷۲ء) کے سپرد کر دیا۔ یہ سلسلہ بھی جلد ہی منقطع ہو گیا اور ۱۹۳۳ء میں یہ سیما ب اکبر آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے؛ آخر تک انہیں کے دامن سے وابستہ رہے۔ ان کے بارے میں کہتے ہیں:

کہنے کو بکثرت ہیں سخنور، لیکن

سیما ب کو استادِ یگانہ دیکھا

انہیں شر سے بھی دلچسپی تھی۔ کسی زمانے میں شہرِ فرانسہ میں ناول نویس اور مصنف ہیوگو کے ناول کا ترجمہ ”بد نصیب“ کے عنوان سے کیا تھا۔ ابتدا میں کچھ نظمیں انگریزی میں بھی لکھی تھیں، جو انگریزی ماہنامے ”ریٹر چپٹ“ میں شائع ہوئی تھیں۔ افسوس کہ ان کا کوئی اردو مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ کلام بہت سختہ اور بے عیب ہے۔ فلسفیانہ طبیعت پائی تھی، اسی کی

جھلک ان کے کلام میں بھی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

سبب کیا جو سفر میں ہر قدم پر ساتھ ہے میرے
یہ گردِ راہ میری رازِ داں معلوم ہوتی ہے
سو فی پڑی ہے بیش کی منزلِ ترے بغیر
پیمانہ بن کے ٹوٹ گیا دل تم سے بغیر
مقصدِ ہوانہ سعی کا حاصل تم سے بغیر
منزل پہ بھی ہے حسرتِ منزلِ تم سے بغیر

بستمِ نگہِ منتہ کار، کیا کہنا! بدل دیا ہے رخِ روزگار، کیا کہنا!
مالِ یکِ نگہِ حسنِ یار، کیا کہنا! بنا ہے حرمِ دل پر شرار، کیا کہنا!
فریبِ وعدہ و حسنِ یار، کیا کہنا! پھر اس پہ بھی ہے ترا اعتبار، کیا کہنا!
جمالِ یار نے تجدیدِ عشق کا پیمانہ بیکِ نگاہ کیا استوار، کیا کہنا!

خاموشی میں بھی کوئی کرتا ہے، کیا سرگوشیاں
سُن رہا ہوں آپ اپنی داستانِ دل کے قریب
نشاطِ انگیز حبِ انسان کی تقدیر ہوتی ہے
تو خود بیٹھے بچھائے غیب سے تدبیر ہوتی ہے

ببِ دل ہی نہیں پاک، تو کیا سمجھو گے! ہے عقل نہیں خاک، تو کیا سمجھو گے!
دنیا کے ہوں یا عالمِ بالا کے رموز پیدا نہیں ادراک، تو کیا سمجھو گے!
دشوار ہے انسان کا انسان ہونا ہاں سہل نہیں، صاحبِ عرفاں ہونا
پھر بھی، مگر! انسان جو آمادہ ہو مشکل نہیں، مشکل کا بھی آساں ہونا
دانا بہ قدرت کسی کو معلوم نہیں اہلی فطرت کسی کو معلوم نہیں
تدبیرِ براعتا د ہے سب کو شرا اپنی قسمت کسی کو معلوم نہیں

انور کا مٹوی، حافظ یار محمد انصاری

۱۸۵۷ء کی افتاد کے بعد انگریزی سیاست کی سخت گیری کے باعث شمالی ہند کے معاشرے میں ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ یہاں کی گھریلو صنعتیں رو بہ زوال ہونے لگیں۔ اس زمانے میں کئی دستکار اور پیشہ ور خاندان تلاشِ معاش میں ترک وطن پر مجبور ہو گئے۔ انھیں میں یوپی کے دیہات کے پارچہ باف بھی تھے، جو عرف عام میں انصاری کہلاتے ہیں۔ اسی برادری کا ایک خاندان نواہی (ضلع فیض آباد) سے ۱۹۰۷ء میں ہجرت کر کے ناگپور سے ۱۶ کلومیٹر کی دوری پر کامٹی میں جا بسا، جو اس زمانے میں تجارت کا مرکز تھا۔ اس خاندان کے بزرگ حاجی شیخ امیر تھے۔ موصوف کے چار بیٹے ہوئے جن میں سے دو نے خاصا نام پایا۔ بڑے اصوفی مولوی لعل محمد، عالم اور درس و تدریس سے شغف رکھنے والے بزرگ تھے۔ انھوں نے سید غلام کبریٰ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، خود بھی صاحبِ اجازت تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ مارچ ۱۹۵۵ء میں رحلت کی۔

شیخ امیر کے دوسرے بیٹے ہی حافظ یار محمد انور تھے۔ کہا کرتے تھے کہ جب ناندان نواہی سے مٹوی آیا ہے، تو میری عمر کوئی سات برس کی ہوگی۔ اس طرح ان کا سال ولادت ۱۹۰۰ء کے قریب ہونا چاہیے۔ کامٹی پہنچ کر شیخ نے بیٹے کو تعلیم کے لیے یہاں کے مشہور استاد حافظ حاجی صفی اللہ کے حوالے

کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے حاجی صاحب موصوف کی نگرانی میں قرآنِ ناظرہ ختم کیا اور اسے حفظ بھی کر لیا۔ اس کے بعد فارسی ایک دوسرے استاد منشی محمد اسحاق صاحب سے پڑھی۔ کسبِ معاش کے لیے اپنے آبائی پیشے کو درویش بنا دیا۔

یوپی کے اکثر خزانوں کے کامی میں بس جانے کے باعث یہاں اردو کا غور و ادب کا خصوصاً اچھا خاصہ چرچا تھا۔ سال بھر مشاعرے ہوتے رہتے، اور عشرہ محرم کی مجالس تو بڑے اہتمام سے ہوا کرتی تھیں۔ انور کی شعر گوئی شروع ہو چکی تھی۔ وہ بھی ان مجالسوں میں شریک ہوتے اور وہاں سلام وغیرہ پڑھتے۔ اس کے بعد طبیعت غزل کی طرف راغب ہوئی، تو انھوں نے مشہور مقامی شاعر سعید کامٹوی (ف: مئی ۱۹۳۰ء) سے اصلاح لینا شروع کی۔

سعید خود صاحبِ فن اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ایک زمانہ ہوا، ان کا ایک مجموعہ کلام ”ارمغانِ جاوید“ کے تاریخی نام (۱۳۱۱ھ) سے شائع ہوا تھا۔ سعید نے ابتدا میں چندے منشی غوث محمد سے اصلاح لی؛ بعد کو حاجی تھمل حسین تھمل جلالپوری (ف: ۱۹۳۳ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ تھمل کا سلسلہ تین چار واسطوں سے ناسخ سے جا ملتا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ اگرچہ سعید کے کلام میں لکھنوی رنگ نمایاں ہے، مگر انور کے ہاں اس کا اثر بالکل برائے نام ہے۔ رفتہ رفتہ انور نے خود استاد کی درجہ حاصل کر لیا۔ اس نواح میں ان کے شاگردوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔

نیو کامٹی کلب نے ان کے کلام کا انتخاب ”تجلیاتِ انور“ کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ ہنوز بہت کلام غیر مطبوعہ موجود ہے۔ کلام کا جو انداز اور معیار ہے اس کے پیش نظر یہ اس لائق ہے کہ اسے ضائع ہونے سے بچایا جائے۔ اپنے گھر کے ماحول اور تعلیم کے زیر اثر ساری عمر صوم و صلوة کے پابند ہے۔

۱۹۶۱ء میں حج بھی کیا تھا۔ اخیر تک ایام رمضان میں مساجد میں تراویح پڑھاتے رہے۔ غرض منتقی، پرہیزگار، پابندِ وضع و صنع بزرگ تھے۔ وہ اختلاجِ قلب کے مریض تھے۔ بدھ ۲۷ نومبر ۱۹۷۷ء (۱۲ ذی قعدہ ۱۳۹۷ھ) دن کے گیارہ بجے مرغن کا شدید حملہ ہوا، جس سے جانبر نہ ہو سکے۔ اسی دن مغرب کے قریب مسلم قبرستان، کامٹی میں تدفین عمل میں آئی۔ حکیم عزیز قدوسی کامٹی نے قطعۃ تاریخ و فوات کہا:

اٹھ گئے، بزمِ جہاں سے افسوس ناز تھا اہل سخن کو، جن پر
از سر آہ، کہا دل نے، عزیز! حیف جاتے رہے حافظ انور

(۱۳ + ۱۹۷۳ = ۱۹۷۴ء)

صلبی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ انور مرحوم بسیار گونہیں تھے، لیکن جو بھی کہا، خوب کہا۔ تعجب ہوتا ہے کہ کامٹی کے غیر شاعرانہ ماحول میں وہ اتنے کامیاب شاعر کیونکر ہو گئے، واقعی یہ خدائے بخشنده کی دین ہے۔ تجلیاتِ انور سے چند شعر ملاحظہ ہوں:

جانا بھی چاہتا ہوں تری بزمِ ناز سے
کچھ یہ بھی سوچتا ہوں کہ جایا نہ جائیگا
دیوانگی شوق کا عالم جو ہے، یہی
انور سے ان کے سامنے جایا نہ جائیگا

شب غم، شام سے گھبرا رہا ہوں الہی! خیر، کیا انجام ہوگا!
کفن کیا باندھ لوں میں سر سے، انور! سنا ہے، آج قبلِ عام ہوگا!

آیا وہ، اور دل کو لیا، لے کے چل دیا ہم سوچتے ہی رہ گئے، یہ ماجرا ہے کیا!
کھا کر بھی سو فریبِ محبت ہوں مطمئن یہ سحر کاری بتِ رنگیں ادا ہے کیا!

اس کو تری محفل میں، تری دیکھے کام کون آیا، گیا کون، یہ انور کو خبر کیا!
 عبث گھرار ہے ہو، قصہ غم کی درازی سے
 جہاں تک سن سکو گئے تم، وہیں تک ہییاں اپنا
 تم مہربان تھے، تو زمانہ تھا مہربان تم مہربان نہیں، تو کوئی مہربان نہیں
 آتی بھی بہارِ انور! رخصت بھی ہوئی کب کی
 اب تک گریباں سے الجھا ہوا سودا فی
 دو دن کی زندگی بھی بڑی چیز ہے، مگر جینا ہی جب نہ آئے، تو سچر کیا کرے کوئی!
 گتھیاں سلجھائیں سب نے، کچھ بنا لیکن نہ کام
 راز تھی پہلے بھی دنیا، اور اب بھی راز ہے
 وہی میں ہوں، جو تھا نا کام شرحِ آرزو اک دن
 وہی میں ہوں، جسے کہتا تھا ہر اک بیڑیاں پہلے
 یہ سوچتے ہی سوچتے، انور گزر گئے اس زندگی میں کیجیے کیا، کیا نہ کیجیے
 ہر درد کی، ہر غم کی دوا میرے لیے ہے کیا نام ترا نام خدا میرے لیے ہے
 تھوڑی سی پیش رفت بھی الفت میں ہے بہت
 دل سے ملے نہ دل، تو نظر سے نظر ملے

شاہ معین الدین احمد ندوی

یوپی کے ضلع بارہ بنکی میں ایک مہتمم خیر قصبہ ردولی ہے۔ یہاں سے بعض ایسی ہستیاں اٹھیں جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیاز حاصل کیا اور آج تک ان کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ انہیں میں صابر یہ چشتیہ سلسلے کے بزرگ حضرت شیخ عبدالحق (ف: ۸۳۶ھ) بھی تھے۔ جن کے نام سے اہل دل کے سینے روشن اور ان کی محفلیں آج بھی گرم ہیں۔ ردولی میں ان کا مزار مرجع الناس ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی انہیں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ یہ خاندان نسباً فاروقی ہے۔

شاہ صاحب ۱۹۰۳ء میں ردولی میں پیدا ہوئے۔ گھر کی زمینداری تھی۔ ان کے والد شاہ حسنا ت احمد مرحوم مجذوب و عفت بزرگ تھے۔ اسی لیے شاہ معین الدین اپنے نانا کی کفالت میں آ گئے۔ نانا شاہ شرف الدین تعلیم یافتہ اور قادر و دان علم ہونے کے باوجود یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ مزید تعلیم کے لیے گھر سے باہر جائیں۔ لیکن معین الدین احمد کی قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔ انہوں نے دستور زمانہ کے مطابق اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھیں اور مزید دینی تعلیم کے لیے لکھنؤ پہنچ گئے۔ یہاں متوسطات تک کی مدرسہ نظامیہ، فرنگی محل میں تحصیل کی اور انش کے بعد تکمیل کے لیے ۱۹۲۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لے لیا۔ اس عہد میں یہاں دارالعلوم میں ہر مضمون کا استادا اپنے

فن کا ماہر، تقریر و تحریر کے میدان کا شہسوار، طلبہ کا دلی ہمدرد تھا۔ نوجوان طالب علم نے اسی علمی ماحول سے اور اپنے اساتذہ سے بھرپور استفادہ کیا۔ اس زمانے میں مولانا عبدالرحمن نگر امی (ف: مارچ ۱۹۲۶ء) دارالعلوم میں تفسیر کے استاد تھے۔ عجیب و غریب آدمی تھے، یہ مولانا نگر امی۔ علم و فضل کا شعلہ جوالہ! افسوس کہ یہ آئینہ جلد ہی تندی صہیا سے پگھل کر صرف ۲۷ برس کی عمر میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ شاہ معین الدین احمد ان کے چہیتے شاگرد تھے۔ نگر امی مرحوم نے ان میں جوہر قابل دیکھا، تو ۱۹۲۴ء میں ان کے دارالعلوم سے فارغ ہونے پر انھیں اپنے استاد مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۵۳ء) ناظم دارالمصنفین کے پاس بوائے گئے۔ کیا شبھ گھڑی تھی وہ جب ۲۱ سالہ نوجوان شاہ معین الدین احمد نے دارالمصنفین کے احاطے میں قدم رکھا تھا۔ جو رشتہ اس دن سے قائم ہوا، وہ پچاس سال کے بعد موت کے ساتھ ٹوٹا۔

مولانا سید سلیمان نے انھیں تربیت کے لیے (۲۵ روپے مشاہرے پر) نیت مقرر کر دیا۔ آہستہ آہستہ انھیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ دارالمصنفین نے سیرۃ النبوی کی تالیف کے بعد صحابہ کے حالات کی تدوین شروع کی تھی۔ اس کی ابتداء دو جلدیں ”غلفاۃ راشدین“ اور ”مہاجرین“ (حصہ اول) مولانا حاجی معین الدین ندوی (ف: ۱۹۴۱ء) نے مرتب کی تھیں۔ اب انھیں کے ہمنام شاہ معین الدین احمد جو ان کے ہاتھ لگے، تو سید سلیمان ندوی مرحوم نے اسے فال نیک خیال کیا اور اس سلسلے کی تکمیل ان کے سپرد کر دی۔ شاہ صاحب مرحوم نے اس سلسلے میں ”مہاجرین“ (جلد دوم) لکھی، پھر ”العبیدین“ لکھی، پھر صحابہ غیر مہاجر و انصاری کی سیرت لکھی۔ اسی زمانے میں وسعت مطالعہ سے انھیں تاریخ اسلام لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے آغانے سے خلافت بنو عباس کے اختتام تک چار جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل کیا۔ یہ

کتاب بہت مقبول ہوئی۔ متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

ان کے علاوہ ان کی بعض کتابیں یہ ہیں: "اسلام اور عربی تمدن" (عربی سے ترجمہ) "عرب کی موجودہ حکومتیں"، "دینِ رحمت"، "حیاتِ سلیمان (مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی سوانح عمری)"، "ادبی نقوش" (مجموعہ مضامین)۔ انھوں نے ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں "اقبال کی شاعری" کے موضوع پر توسیعی خطبات بھی دیے تھے؛ یہ شاید سنوز کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔

معارف کے شذرات وہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے بھوپال چلے جانے کے بعد ہی سے مستقلاً لکھنے لگے تھے۔ ان کی تحریر کی سلاست اور متانت، پختگی اور اصابت رائے کے سب قائل تھے۔ سخت سے سخت بات بھی ایسی نرمی اور سادگی سے کہہ جاتے تھے کہ بڑے سے بڑا مخالف بھی اس پر انگلی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ تمام تصنیفی کاموں میں سید سلیمان ندوی مرحوم کے دستِ راست رہے۔ ۱۹۴۵ء میں مولانا ندوی مرحوم بعض مقامی حالات سے دل برداشتہ ہو گئے۔ انھیں آیام میں نواب محمد حمید الدخان والی بھوپال (ف: فروری ۱۹۶۰ء) نے انھیں اصرار سے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ اس پر مولانا سید سلیمان کو اعظم گڑھ چھوڑ کر بھوپال جانا پڑا۔ وہ وہاں فضائے اعلیٰ کے منصب پر نیز دینی اور مذہبی امور کے منصرم بن کر گئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں شاہ صاحب مرحوم نے دارالمصنفین کا نظم و نسق اور معارف کی ادارت کی ذمہ داری جس خوش اسلوبی سے سرانجام دی، اس پر استاد نے خوشنودی کی سند دی، اور تحییمین کا اظہار کیا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں جب سید صاحب مستقل طور پر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے، تو اب اس تاریخی ادارے کا سارا باران

کے اور ان کے رفیق کار سید صباح الدین عبدالرحمن کے کندھوں پر آ پڑا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ وہ اس سے بوجہ احسن عہدہ برآ ہوئے۔ اسی کا شاندار نتیجہ دارالمصنفین کا جشن زترین تھا، جو فروری ۱۹۶۴ء میں نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (ف: مئی ۱۹۶۹ء) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اور جس میں ملک بھر کے علماء اور اہل علم نے شرکت کی تھی۔

سیرچشمی، اقربا پروری، استغنا، توکل ان کے کردار کے اجزائے ترکیبی تھے۔ ۱۹۶۴ء میں مشاہرہ محض ۲۵ روپے مقرر ہوا، تو وہ اسی میں خوش تھے۔ آخر میں بڑھتے بڑھتے یہ ۴۰۰ سوئیک پہنچا، تو بھی انھوں نے کسی طمطراق اور نمائش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس اثنا میں بڑے بڑے مشاہرے پر باہر سے بلاؤ آئے۔ مدرسۂ عالیہ، کلکتہ نے بلایا، جامعۃ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ لیکن اس مردِ خدا نے یک درگیر و حکم گیر کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اپنے استاد اور دادا استاد کی یادگار کو سینے سے لگائے رکھا، اور سب کو جواب دے دیا۔ ہر مہینے اپنی آمدنی کا ایک حصہ اپنے اعزہ اور دوسرے مستحق اصحاب کے لیے الگ کر دیتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے عربی کی سند اعزاز ملی جس کے ساتھ تین ہزار سالانہ کا وظیفہ بھی ملتا ہے، تو اس کا بیشتر حصہ بھی اسی طرح تقسیم ہوتا رہا۔ ان کے والد بہت زرعی زمین چھوڑے تھے۔ شاہ صاحب مرحوم نے اپنے حصے کی زمین چھوڑے بھائی شاہ امام احمد کو مہبہ کر دی کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں، اور تمھارے پاس کوئی اور ذریعہ معاش نہیں ہے۔ عمر کے ساتھ استغنا کا یہ رنگ اور گہرا ہو گیا تھا۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی (سہارنپور) امیر تبلیغی جماعت سے بیعت تھے اور اس جماعت کا جو رنگ ہے، اسے جاننے والے جانتے ہیں۔ دو مرتبہ (۱۹۶۶ء و ۱۹۷۳ء) حج بیت اللہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

ان کی پہلی شادی رُودلی کی مشہور شخصیت شاہ مصطفیٰ احمد کی چھوٹی صاحبزادی عشرت النساء بیگم سے (جو کسی زمانے میں بھوپال میں اکاؤنٹنٹ جنرل تھے) عفو ان شباب میں ہو گئی تھی، لیکن جلد ہی یہ خاتون ایک لڑکا اپنی یادگار چھوڑ کر ۱۱ دسمبر ۱۹۲۵ء (۲۵ جمادی الاول ۱۳۴۴ھ) کو انھیں داغ مفارقت دے گئیں۔ چندے بعد دوسری شادی شیخ منظور الحق نعمانی کی صاحبزادی وحی النساء سے ہوئی۔ لیکن یہی حادثہ پھر پیش آیا۔ ان کا ۳۰ دسمبر ۱۹۳۴ء کو انتقال ہوا۔ گھر والوں نے بہت کوشش کی کہ وہ پھر تامل کا جوا کھلے میں ڈال لیں۔ اس وقت عمر یہی ۳۵ برس کی رہی ہوگی۔ لیکن اس التذکرے بندے نے کسی کی ایک نہ سنی، اور پھر نکاح نہیں کیا۔ ان بیویوں سے دو بچے (ایک لڑکا اور ایک لڑکی) تھے۔ انھیں پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ لڑکا شاہ و در احمد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آج کل کراچی میں ہے، اور لڑکی (دادھیالی نام، غوثیہ؛ ناسخیاالی، ثمر فاطمہ) اپنے گھر بار والی رُودلی میں۔ اس کی شادی اپنے خاندان ہی میں ایک جوان صالح چودھری اویس احمد سے کر دی تھی۔

صحت ہمیشہ ٹھیک رہی۔ ہاں کبھی کبھی تنفس کی شکایت کرتے تھے۔ ۱۹۷۲ء میں جب دارالمصطفین کا اجلاس بمبئی میں ہوا ہے، تو اچانک وہاں پہلی مرتبہ دل کی شکایت محسوس کی۔ لیکن اس پر کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ آخری وقت بہت ہی دے پالٹ آیا۔ جمعہ کے دن ۱۳ دسمبر ۱۹۷۷ء کو حسب عادت تمام معمولات سے فارغ ہوئے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد آنکھ لگ گئی۔ جاگے تو عصر کی نماز کے لیے وضو کا پانی طلب کیا۔ کرسی سے اٹھنے لگے، تو گر گئے، اور پھر نہیں اٹھے۔ ڈاکٹر صاحب فوراً بلوائے گئے۔ انھوں نے دیکھ کر اعلان کیا کہ شاہ صاحب اپنے رفیقِ اعلیٰ کے حضور حاضر ہو چلے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

ان کی وصیت کے مطابق میت اگلے دن ان کے وطن راولی گئی اور وہاں
چودھری خلیل احمد کی مسجد کے احاطے میں آخری خوابگاہ نصیب ہوئی۔
آسمان تربت پہ تیری عنبر افشانی کرے۔

شیر محمد اختر گجراتی

میرے ہم عمر اور دوست اور ہم وطن تھے۔ یعنی وہ بھی گجرات (موجودہ پاکستان) کے رہنے والے تھے، اگرچہ ۱۹۰۷ء میں پیدا لاہور میں ہوئے جہاں ان کے والد میاں محمد یوسف غالباً اور سیر تھے، اور سرگنگارام مرحوم (ف: جولائی ۱۹۲۷ء) کے دوستوں میں تھے۔ شیر محمد نے دسویں درجہ تک کی تعلیم زمینداروہائی اسکول (موجودہ زمیندار کالج)، گجرات میں پائی۔ اس کے بعد انھوں نے پولیس ٹریننگ اسکول، پشاور میں داخلہ لے لیا، اور وہاں سے تربیت کی تکمیل کے بعد پولیس کے محکمے میں بھرتی ہو گئے۔

لیکن ان کا مذاق ادبی، بلکہ تعلیمی تھا، پولیس کی نوکری کب تک چلتی! تین چار سال تو گھر والوں کے مجبور کرنے پر کسی نہ کسی طرح کاٹے؛ بالآخر ۱۹۳۶ء میں استعفیٰ دے دیا، اور سال بھر بعد لاہور چلے آئے۔

وہ عقیدے کے لحاظ سے جماعت احمدیہ کی لاہوری شاخ سے متعلق تھے۔ چنانچہ لاہور آنے پر وہ اس انجمن کے دونوں پرچوں، ہفتہ وار ”پیغام صلح“ (اردو) اور ہفتہ وار ”لائٹ“ (انگریزی) میں کام کرتے رہے۔ یہاں سے نکل کر کچھ دن تک ماہنامہ ”تہذیب نسوان“ کے ادارہ تحریر سے بھی رسمی طور پر وابستہ رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک سلسلہ مضامین بچوں کی نفسیات پر قلمبند کیا تھا، جو بہت مقبول ہوا تھا۔

انہوں نے نفسیات کا مطالعہ بطور خاص کیا تھا۔ لاہور میں انہوں نے ایک ادارہ قائم کیا تھا، جہاں وہ نفسیات کے موضوع پر طلبہ کو تعلیم دیتے تھے۔ اردو میں اس مضمون کی نصیابی کتنا ہیں ہی کتنی ہیں! چنانچہ یہ کمی پورا کرنے کو انہوں نے اسی زمانے میں چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے، جنہیں وہ نصیب کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

لاہور کے مسلسل قیام سے وہ وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں اچھے خاصے متعارف ہو گئے، اور ان کے احباب کا حلقہ بھی وسیع ہو گیا۔

نظم و نثر دونوں میں درک تو حاصل تھا ہی، اب وہ رسالوں میں مضمون بھی لکھنے لگے۔ ان دنوں مولانا حسن الدخان تاجور نجیب آبادی کا ماہنامہ ”شاہکار“ بڑے ٹھسے سے نکلتا تھا۔ آخر ایک دن اس کے دفتر گئے۔ مولانا تاجور ابھرتے ہوئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور انہیں آگے بڑھانے میں بڑی مشاعرے محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے آخر کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے انہیں ”شاہکار“ کا نائب مدیر مقرر کر دیا۔ مولانا تاجور کا جب جنوری ۱۹۵۱ء میں انتقال ہو گیا، اور شاہکار بھی بند ہو گیا، تو اس کے بعد اختر پنجاب کے مشہور ماہنامے ”ہمایون“ کے ادارے سے منسلک ہو گئے۔ یہاں وہ ۱۹۴۸ء تک رہے۔

اس دوران میں بھی ان کا مطالعہ نفسیات بدستور جاری رہا۔ ۱۹۴۴ء میں انہوں نے اس موضوع پر اپنے دو ماہانہ رسالے شروع کیے: (۱) ”نفسیات“ اور (۲) ”نفسیاتی جائزے“ یہ دونوں پرچے مدتوں باقاعدگی سے چھپتے رہے۔ اب ان کی ادبی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں وہ ہفتہ وار ”قندیل“ (لاہور) کے مدیر مقرر ہو گئے۔ اور ۱۹۷۰ء تک اس رسالے کو مرتب کرتے رہے۔ اس میں وہ ہر ہفتے ”میں دیکھتا چلا گیا“ کے عنوان سے ایک کالم ”تماشائی“ کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ یہ سب حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس میں لاہور

اور صوبے کی ہفتہ بھر کی ادبی، سماجی، سیاسی سرگرمیوں پر ہلکے سچلکے انداز میں تبصرہ کرتے۔ ان کی زبان سلیس، سادہ اور بڑی جاندار تھی۔ مولوی عبدالنقی مرحوم تنک ان کی زبان کے معترف اور مداح تھے۔

وہ حلقہ ارباب ذوق اور راسخ نگار کے بنیادی اراکین میں سے تھے، اور حلقے کے جلسوں میں خاص طور پر مستعدی سے شریک ہوتے تھے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ حلقے میں حاضری دیے والے ادیبوں کا کلام نظم و نثر انھیں بآسانی "قندیل" میں اشاعت کے مل جاتا۔ یوں اس عہد کے بیشتر قابل ذکر ادیبوں کے مضامین اور منظومات تبدیل میں چھپتی رہیں اور پریچ کا معیار اپنے معاصرین کے مقابلے میں بہت بلند ہو گیا۔ وہ اپنے مستقل کالم (میں دیکھنا چلا گیا) کے علاوہ بھی افسانے، ڈرامے اور مضامین لکھتے رہتے تھے۔ ان کی تقریریں ریڈیو سے بھی نشر ہوتی رہتی تھیں۔

۱۹۷۱ء میں ان پر پہلی مرتبہ فالج کا شدید حملہ ہوا، اور وہ بہت دن تنگ نقل و حرکت سے معذور رہے۔ بارے، باقاعدہ علاج سے کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے، لیکن اس سے کمزوری اتنی ہو گئی کہ پھر انھیں کامل عیشت کا ایک دن بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء کے اواخر میں ان پر پھر فالج گرا۔ اب کے علاج کے لیے یونائیٹڈ کرسچین اسپتال چلے گئے۔ دو مہینے بعد وہیں اسپتال میں ۳۰ دسمبر ۱۹۷۴ء علی الصبح رہ کر عالم جاودانی ہو گئے۔ جازہ اسی دن اٹھا اور قبرستان میانی صاحب میں سپرد خاک ہوئے۔ *إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ*۔ بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور چھ بیٹیاں اپنے سوگواروں میں چھوڑے۔

مرحوم اپنی سخن فہمی اور بذلہ سنجی، سیرچشمی اور وسعت داری کے لیے مشہور تھے۔ جن ایام میں "قندیل" کے مدیر تھے، کئی جگہ سے زیادہ تنخواہ پر ملازمت کی پیشکش ہوئی، لیکن انھوں نے ہمیشہ انکار کیا۔ پروفیسر محمد سرور (جامعی) جنھوں نے

مولانا عبید اللہ سندھی پر خاصا کام کیا ہے، اختر مرحوم کے ماموں ہیں۔ محمد سرور صاحب نے کسی زمانے میں حمید نظامی مرحوم کے "نوائے وقت" کے جواب میں اپنا روزنامہ "آفاق" جاری کیا تھا۔ انھوں نے معقول تنخواہ پر اختر کو بھی اس کے ادارہ تحریر میں شمولیت کی دعوت دی۔ محمد سرور صاحب نے خیال کیا کہ اختر میرا بھانجا ہے اور تنخواہ بھی معقول؛ سبھلا اسے قبول کرنے میں کیا عذر ہوگا! لیکن انھیں بھی مایوسی ہوئی۔ اختر نے اپنی وضع داری بنا ہی اور "من بستم حناے قناعت پیاے خویش" کہتے ہوئے قندیل میں جمے رہے۔

ایک اور بات! اختر ان کا تخلص نہیں تھا، نہ وہ شعر کہتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا: "اختر صاحب! آپ شعر نہیں کہتے، تو نام کے ساتھ یہ تخلص کیوں لگا رکھا ہے؟" کہنے لگے: "اختر تخلص نہیں ہے، بلکہ سید امتیاز علی تاج قسم کی چیز ہے، انھوں نے بھی تو کبھی شعر نہیں کہا۔ بات دراصل یہ ہے کہ شیر محمد قسم کے نام کچھ فوجی اور جنگجو حضرات ہی کو زیرِ یاد دیتے ہیں۔ میں نے التباس سے بچنے کی خاطر اپنے نام کے ساتھ اختر کا اضافہ کر لیا۔"

انھوں نے کوئی پچاس کے قریب کتابیں چھوڑی ہیں۔ ان میں نفسیاتی موضوعات ہیں، تراجم ہیں، افسانے ہیں، ڈرامے (اردو اور پنجابی) ہیں، تاریخ اسلام ہے۔ لیکن ادیب اور مصنف سے بھی وہ بلند تر انسان تھے۔ با اصول، مرتجان مریخ، دوستوں کے ہمدرد اور کنبہ پرور۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ان سے عفو و کرم کا سکوک کرے! آمین!

چغتائی، عبدالرحمن (خان بہادر)

کون ہے جس نے جامع مسجد اور لال قلعہ یا تاج محل، آگرہ کا نام نہ سنا ہوگا! لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان عالیشان اور شہرہ آفاق عمارتوں کے نقشے لاہور کے دو فنکاروں نے تیار کیے تھے، ان کے نام تھے: احمد اور حامد۔ یہ دونوں سگے بھائی تھے۔ عہد شاہجہانی کے مورخوں نے ان کے نام استاد العصر احمد اور نادر العصر حامد لکھے ہیں۔ ان کے نام سے منسوب ”کوچہ استا حامد“ آج بھی ان کی یاد تازہ کرنے کو موجود ہے۔ فن عمارت اس خاندان میں نسلاً بعد نسل قائم رہا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے میر عمارت بابا صدر الدین چغتائی خاندان کے نام لبوا تھے۔ ان کے بیٹے میاں رحیم بخش تھے اور میاں رحیم بخش کے میاں کریم بخش چغتائی۔ یہ دونوں باپ بیٹے بھی میر عمارت اور معمار تھے۔ میاں کریم بخش کا ۱۹۱۳ء میں انتقال ہوا۔ ۶۰ سال سے زیادہ عمر پائی۔ میاں کریم بخش چغتائی کے تین بیٹے: عبدالرحمن، عبداللہ اور عبدالرحیم ہوئے۔ یہی عبدالرحمن، ہمارے مشہور مصوّر اور فنکار عبدالرحمن چغتائی ہیں، جن کا ۱۹۷۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ عبداللہ علمی حلقوں میں ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے نام سے معروف ہیں، اور ان کا نام سوانح اقبال میں متعدد مقام پر آتا ہے۔ انھوں نے سوربون یونیورسٹی (پیرس) سے تاج محل کے موضوع پر اپنے مقالے سے ڈاکٹریٹ کی سند لی تھی۔ عبدالرحیم سب سے

چھوٹے ہیں۔ انھوں سے ساری عمر بڑے سبھائی عبدالرحمن چغتائی کی معیت ۱۹۱۱ء
خدمت میں گزار دی۔

عبدالرحمن چغتائی لاہور میں ۲۱ ستمبر ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی لیسیم الہ مسجد میں
پڑائی۔ یہاں انھوں نے قرآن ناظرہ ختم کیا۔ بعض سورتیں جو انھیں آخر تک حفظ
تھیں، وہ اسی ابتدائی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ مسجد کی مکتبی تعلیم کے ساتھ ہی ان
کے والد نے انھیں اپنے بہنوئی میاں میران بخش نقاش (بن بابا عمر الدین
نقاش) سے نقاشی اور مصوری کے اسباق لینے کی ہدایت کی تھی۔ میاں میران
بخش نقاش اپنے فن کے ماہر اور اس حیثیت سے سرکاری حلقوں میں بھی
معروف تھے۔ حکومت نے ان کی عظمت فن کے اعتراف میں انھیں مسجد
ذریعہ خان (لاہور) میں حجرے عطا کیے تھے۔ اس زمانے میں یہ حجرے مصوروں
نقاشوں، خطاطوں کو حکومت کی طرف سے اعزاز و اکرام کے طور پر دیے جاتے
تھے۔ بابا میران بخش نے عمر ۱۱ سال ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔ وہ لاہور کے
قبرستان بی بی پارک دامن میں دفن ہوئے۔ عبدالرحمن چغتائی میو اسکول جانے
تک ان سے مستفیض ہوتے رہے تھے۔

مسجد سے فارغ ہو کر ان کا ریلوے ٹکنیکل اسکول، لاہور میں داخلہ ہوا۔ چھٹے
درجے کے بعد تعلیم کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ چندے پتنگ بازی اور آواہ گردی
کرنے کے بعد انھوں نے پھر اسی اسکول سے ۱۹۱۱ء میں پرائیوٹ طور پر
مڈل (آٹھویں درجے) کا امتحان پاس کیا۔

خاندانی روایت کے پیش نظر، فن اور آرٹ ان کے خون میں تھے۔ مڈل اسکول
امتحان کے بعد انھوں نے خود بخود میو اسکول آف آرٹ، لاہور میں داخلہ لے
لیا۔ اس زمانے میں یہاں ڈرائنگ، نقاشا سازی (ڈرافٹ مینی)، لوہاری
اور لکڑی کے کام کی تعلیم کا خاصا انتظام تھا۔ عبدالرحمن چغتائی آخری
درجے کے امتحان (۱۹۱۴ء) میں صوبے بھر میں اول آئے تھے۔

میو اسکول کے امتحان میں کامیابی کے بعد اولاً اسخوں نے کرچین ہائی اسکول گوجرانوالہ میں ڈرائنگ ماسٹر کی نوکری اختیار کر لی۔ لیکن یہاں ان کا دل نہیں لگا۔ گوجرانوالہ میں وہ صرف چند مہینے رہے، اور استعفیٰ داخل کر کے واپس لاہور چلے آئے۔ ان کی مادر علمی (میو اسکول) نے محسوس کیا کہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے، چنانچہ اسکول میں نوٹولیتھوگرافی کا درجہ کھولا گیا، جس کے انچارج چغتائی صاحب مقرر ہوئے۔ وہ اس عہدے پر ۱۹۲۲ء تک رہے اور پھر مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد عمر سچیر کہیں ملازمت نہیں کی۔

یہ میاں میر ان بخش نقاش کی تربیت ہی کا اثر تھا کہ اسخوں نے عنفوان شباب میں مصوری شروع کر دی۔ چنانچہ پنجاب فائن آرٹ سوسائٹی، لاہور کی نمائش منعقدہ ۱۹۱۹ء میں چغتائی کی آب رنگی تصاویر کا بھی سراغ ملتا ہے۔ لیکن ابھی تک ان کی مصوری کی شہرت ان کے احباب ہی تک محدود تھی، اور عوام سے متعارف نہیں ہوئے تھے۔ ان کی شہرت کے عام کرنے میں پروفیسر (ڈاکٹر) محمد دین تاثیر (ف: نومبر ۱۹۵۸ء) اور ماہنامہ نیرنگ خیال کا بہت ہاتھ ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ نیرنگ خیال کے شروع کرنے والے ہی تاثیر اور چغتائی تھے۔ اس کی داغ بیل تاثیر کے مکان ہی پر پڑی، اور اسخوں نے حکیم یوسف حسن کو یہ پرچہ جاری کرنے کا مشورہ دیا، چونکہ ان کے پاس سرمایہ تھا، جسے وہ اس کے اخراجات کے لیے لگا سکتے تھے۔ ہاں، بعد کو دوسرے احباب (نیاز مند ان لاہور) سے بھی مشورہ کیا گیا تھا اور سب نے دستِ تعاون بڑھانے کا وعدہ کیا۔ نیرنگ خیال وسط ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا اور اس کے پہلے ہی شمارے میں چغتائی کی بنائی ہوئی ایک تصویر شامل تھی۔ اس کے بعد بھی وہ باقاعدگی سے اپنی تخلیقات نیرنگ خیال میں شائع کرتے رہے۔ غرض کہ یہ حقیقت ہے کہ اگرچہ چغتائی پہلے سے مصوری کر رہے تھے، لیکن وہ عوام سے نیرنگ خیال ہی کے ذریعے سے متعارف ہوئے۔ تاثیر نے ان کے فن اور تکنیک کے بارے میں اور ان کی

نویسوں اور خصوصیتوں کی وضاحت کے لیے متعدد مضامین لکھے۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ تاثیر نے محض چغتائی کے آرٹ پر لکھنے اور اس کی باریکیوں کو اجاگر کرنے کی خاطر یورپ کے بڑے بڑے مصوروں اور فنون لطیفہ کے ماہروں کی تخلیقات اور تصنیفات کا غائر مطالعہ کیا تھا، تاکہ وہ چغتائی کے فن پر کماحقہ لکھ سکیں اور دوسرے عالمی مصوروں کے ساتھ ان کا مقابلہ کر کے ان کے مابہ الامتیاز پہلو دکھا سکیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگرچہ چغتائی نے اصول کی حد تک تو اپنے بزرگ میاں میران بخش سے ضرور استفادہ کیا، لیکن اس کے بعد اس میدان میں انھوں نے جو فتوحات حاصل کیں اور دنیا کے تصویر و فن کے خزانے میں جو میث بہا اضافہ کیا، وہ سراسر ان کا ذاتی کارنامہ اور ان کے اپنے زور بازو کا ثمرہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک میں عالمی شاہکاروں کا قریبی اور غائر مطالعہ، اور معاصر مصوروں اور فنکاروں اور نقادوں سے بالمشافہہ تبادلہ خیال نہیں کرتا، میرے فن میں وسعت اور عالمگیریت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۶ء میں دو مرتبہ یورپ کا سفر کیا۔ پہلے سفر میں ان کے چھوٹے بھائی محمد عبداللہ چغتائی بھی ان کے ساتھ گئے تھے۔ اسی زمانے میں علامہ اقبال بھی گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں مقیم تھے۔ اقبال نے اپنے مشوروں سے مستفیض کیا اور مختلف اکابر سے ان کی ملاقات میں بھی راہنمائی کی۔

ان سفروں میں انھوں نے یورپ کے تمام بڑے بڑے شہروں اور وہاں کے عجائب گھروں اور تصویر خانوں کی سیر کی اور ان کے مہتمموں سے ملے۔ نیز مختلف مقامات کے وہ حسین مناظر منظر غائر دیکھے، جو اکثر مصور اپنی تخلیق کے لیے پس منظر کے طور پر استعمال کرتے رہے ہیں۔ انھیں سفروں میں وہ یورپ کے مشاہیر علم و فن اور مقتدر مصوروں سے بھی ملے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ

ان سفروں اور ملاقاتوں کا ان کے فن کی بالیدگی اور سختگی، اور شخصیت کی تشکیل اور رچاؤ میں کتنا ہاتھ رہا ہوگا۔

یورپ سے واپسی کے بعد انھوں نے اپنے فن میں تانے کی پلیٹ پر لوہے کے قلم سے تصویر بنانے (یعنی ایچنگ: Etching) کا اضافہ کیا۔ اب تک ان کی توجہ زیادہ تر خطوط پر مبذول رہی تھی۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ محض خطوط کے پیچ و خم سے جیتی جاگتی تصویر بنا دینے میں ان کا کوئی حریف نہیں اور اس کا راز ان کی ڈرائنگ کے فن پر غیر معمولی قدرت میں پوشیدہ ہے۔ یہی کام انھوں نے ایچنگ سے لیا۔ یاد رہے کہ ان سے قبل کسی ہندوستانی مصور نے فن کی اس شاخ کا ایسا بھرپور نمونہ پیش نہیں کیا تھا؛ اس کا سہرا صحیح معنوں میں چغتائی کے سر ہے۔

اب ان کا سجا طور پر ہندستان کے صفِ اول کے مصوروں اور فنکاروں میں شمار ہونے لگا۔ ۱۹۳۴ء میں حکومتِ وقت نے ان کی خدمات کا اعتراف ”خان بہادر“ کے خطاب سے کیا۔ یہاں غالباً ایک بات کا ذکر سبیل نہیں ہوگا۔ انگریزی عہد میں یہ خطاب بالکل سیاسی نوعیت کے تھے۔ اور بالعموم حکومت کے چیلے چانٹوں اور جی حضوریوں تک محدود ”خان صاحب“ البتہ ایک آدمی مرتبہ غیر سیاسی اور علمی و ادبی افراد کے حصے میں بھی آچکا ہے۔ لیکن چغتائی کو یہ خطاب محض اپنی فنی اور ادبی خدمات کی وجہ سے ملا۔ ان سے پہلے جن چند غیر سیاسی اشخاص کو اس طرح کا خطاب ملا تھا، ان میں علامہ اقبال اور رابندر ناتھ ٹیگور کے نام نمایاں ہیں۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ۱۹۴۰ء میں وہاں کی حکومت نے انھیں ”ہلال امتیاز“ کے اعزاز سے نوازا۔ ۱۹۴۴ء میں مغربی جرمنی کے سابق صدر ڈاکٹر ہنرک لیکے پاکستان کے دورے پر آئے تھے۔ انھوں نے چغتائی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ لہذا اگلے دن جب موصوف علامہ اقبال کا مزار دیکھنے گئے،

توان کی خواہش کے مطابق وہاں ان سے چغتائی کا تعارف کرایا گیا۔ ڈاکٹر بیکے، چغتائی کے فن کے بڑے مداح تھے۔ چنانچہ انھوں نے خاص طور پر اپنے وزیر والٹر شیل کو (جو بعد کو صدر مغربی جرمنی بنے) چغتائی کے مسکن (راوی روڈ) پر ان کی خدمت میں سونے کا تمغہ پیش کرنے کو بھیجا، جو گویا مغربی جرمنی کی طرف سے ان کی فنی میدان میں خدمات کا اعتراف تھا۔

ان کی چھ کتابیں فن اور تصویر کے موضوع پر شائع ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے ۱۹۲۸ء میں مرتع چغتائی "منقہ شہود پر آئی، جس میں غالب کے کلام کو تصویروں کے پیکر میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ان کی شہرت کا سنگ بنیاد ثابت ہوئی۔ اس کا مقدمہ علامہ اقبال نے لکھا تھا۔ اس میں ۲۲ رنگین اور دس سادہ تصویریں ہیں۔ اس کا ایک خاص ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ جس کی قیمت ۱۲۵ روپے فی نسخہ تھی اور ایک عام جوسترہ روپے میں بکا تھا۔ دونوں میں کاغذ کے تفاوت کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں تھا۔ اس سلسلے میں لطیفہ یہ ہے کہ اعلان کیا گیا تھا کہ اعلیٰ ایڈیشن جرمنی میں چھپا ہے، حال آنکہ یہ لاہور ہی میں چغتائی صاحب کے مکان (واقعہ کوچہ چاکس سواراں، لاہور) میں خاص مشین سے طبع ہوا تھا۔ اس کی دیدہ زیب کتابت اور اعلیٰ معیار طباعت اور تجلید وغیرہ سے سب لوگ دھوکا کھا گئے۔ اس کام میں ان کے سب سے چھوٹے بھائی عبدالرحیم چغتائی ان کے دست راست اور ہر طرح مدد و معاون رہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ عبدالرحیم صاحب نے اپنی پوری زندگی بڑے بھائی کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ عبدالرحمن چغتائی کو اپنے تخلیقی کام کے سواے اور کسی کام سے کام نہیں تھا۔ اس کے بعد نصاب ویر پر چوکھے لگوانا، اسفین نمائشوں میں بھیجنا اور واپس منگوانا، کتابوں کا شائع کرنا، ان کی تقسیم اور کاسی کی نگرانی۔ غرض سب کام عبدالرحیم صاحب کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ گھر بار کے سب اخراجات بھی انھیں کے ہاتھوں

سرا انجام ہوتے تھے۔

”مرقع چغتائی“ کے سلسلے میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی، تو اس کی تمام اصلی تصاویر سر اکر حیدری نے نظام پبلش (حیدرآباد ہاوس) نئی دہلی میں لگانے کے لیے لے لی تھیں۔ لیکن جب شہزادی دردانہ (نظام عثمان علی خان مرحوم کی بڑی بہو اور نواب اعظم جاہ ولی عہد کی بیگم) نے انھیں دیکھا، تو فرمایا کہ تصاویر نئی دہلی نہ بھیجی جائیں، میں انھیں اپنے محل میں دگاؤں گی۔ خدا معلوم، اب وہ کہاں ہیں!

”نقش چغتائی“، ان کا دوسرا کارنامہ تھا۔ یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں غالب کے کچھ اور اشعار کو مصور کیا گیا ہے۔ یہ بھی بڑے اہتمام سے نکلی، بحرم کی لچکدار جلد اور بڑھیا کاغذ، ہر صفحے کی جدول کی تزیین اور دو رنگی چھپائی۔ اس میں کل ۱۹ تصویریں ہیں، جن میں سے صرف ایک رنگین ہے، بقیہ سب سادہ، سپید و سیاہ ہیں۔

اسی ”نقش چغتائی“ کا دوسرا ایڈیشن (نقش ثانی) غالباً ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ (تاریخ درج نہیں) یہ پہلے ایڈیشن سے بہت مختلف ہے، تصویروں میں بھی تفاوت ہے اور ان کی تعداد میں بھی۔ اس میں چھ رنگین تصویریں ہیں اور سولہ سادہ، سپید و سیاہ۔ اسی دوسرے ایڈیشن کا موہو چر بہ تیسری مرتبہ ۱۹۴۵ء میں چھپا۔

اس کے بعد ان کی یہ کتابیں شائع ہوتیں:

- ۱۔ تصاویر چغتائی: ۱۹۳۴ء
- ۲۔ ہندی تصاویر چغتائی: ۱۹۵۲ء (اس کا ایک مختصر ایڈیشن بہت پہلے دہلی کی ایک فرم نے شائع کیا تھا)۔
- ۳۔ عمل چغتائی: ۱۹۴۸ء
- ۴۔ تیمور کا گھرانہ: ۱۹۷۲ء

عمل چغتائی میں کلام اقبال کو مصوّر کیا ہے جس طرح پہلی دو کتابیں مصوّر کلام غالب ہے۔ کلام اقبال کو مصوّر کرنے کی خواہش خود علامہ اقبال نے ”مرقع چغتائی کی اشاعت کے بعد ظاہر کی تھی۔ چغتائی نے ۱۹۶۱ء میں اس پر کام شروع کیا تھا؛ اس کی تکمیل کہیں ۲۵ برس بعد ہوتی۔ یہ بڑے سائز (۵x۱۴) کے ۲۵۰ صفحات کی کتاب ہے؛ اس میں ۴۰ چار رنگی تصاویر ہیں اور ۲۲ رنگی؛ شروع میں جسٹس سر عبدالرحمن کا دیباچہ ہے۔ کتاب بہت اہتمام سے شائع ہوئی ہے اور ہر طرح سے اقبال اور چغتائی دونوں کے نمایان شان ہے۔ مرحوم کہتے تھے کہ اس کی تیاری اور طباعت پر میراثین لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔ ابتداء میں اس کا ۲۵۰ جلدوں کا ایک خاص ایڈیشن بھی شائع ہوا تھا جس کی قیمت پندرہ سو روپیہ فی نسخہ تھی۔ اس کا اجراء سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے ہاتھوں لاہور آرٹ کونسل میں ہوا تھا اور حکومت پاکستان نے اس خدمت کے اعتراف میں چغتائی مرحوم کو دو لاکھ روپے کا انعام عطا کیا تھا۔

مندرجہ ذیل کتابیں غیر مطبوعہ رہ گئیں :

۱۔ عمر خیام (مصوّر) : اس پر انھوں نے ۳۰-۴۰ برس کام کیا تھا۔ کتاب مکمل ہو چکی تھی۔ اس میں کوئی ۴۰-۵۰ تصویریں ہیں۔ تمام تصویروں کی لوحیں اور بلاک وغیرہ بن چکے تھے؛ اور وہ اسے شائع کرنے کا انتظام کر رہے تھے کہ موت کا بلاوا آگیا۔ خدا معلوم، اب اس کی اشاعت کا کیا انتظام ہوگا! چغتائی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ یہ کتاب اس فرض کی ادائی ہے، جو مغرب عمر خیام کی قدر و منزلت کر کے اور اس کے متعدد مصوّر ایڈیشن شائع کر کے ہم اہل مشرق سے وصول کرنے کا حقدار ہے۔

۲۔ چغتائی آرٹ : یہ کتاب تقسیم ملک سے قبل زیر طباعت تھی کہ فسادات کے باعث کام درمیان میں رہ گیا۔ اس کے بعد وہ عمل چغتائی کی تکمیل میں

لگ گئے اور اس پر توجہ نہ دے سکے۔ بہر حال اس کا پورا سامان موجود ہے۔
 ۳۔ کارِ چغتائی : یہ دراصل غالب کے سلسلے کی تیسری کتاب ہے یعنی ”مربعِ چغتائی“ اور ”نقشِ چغتائی“ کے بعد انھوں نے غالب کے جن مزید اشعار کو مصور کیا تھا، یہ ان کا مجموعہ ہے۔ اس میں ۳۰۔۴۰ نئی تصویریں ہیں۔ یہ کتاب بھی تقسیم ملک کے وقت زیرِ طبع تھی۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر ایک تصویر کے ساتھ اردو میں کچھ اشارے لکھے ہیں۔ ”عملِ چغتائی“ میں بھی ہر ایک تصویر کے ساتھ تقریباً دو دو صفحے کے اشارات ہیں یہ سب محرم کے اپنے لکھے ہوئے ہیں۔

۴۔ ماڈرن آرٹ میں چغتائی کا حصہ (انگریزی)

۵۔ چغتائی اور اس کے نقاد ()

۶۔ نعمۂ لذت ()

۷۔ چغتائی کی عریاں تصویریں (NUDES) ()

وہ اردو میں افسانہ بھی لکھتے تھے، اور فنی موضوعات پر مضامین بھی۔ ۱۹۴۷ء میں ان کے افسانوں کے دو مجموعے ”کاجل“ اور ”لگان“ شائع ہوئے تھے۔ اپنی وفات سے پہلے ایک اور مجموعہ ”ستاؤن“ کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ اس میں تین طویل افسانے ہیں؛ (۱) ستاؤن (۲) ہانجن؛ (۳) لندن سے ایک خط۔ ستاؤن میں دوسری جنگِ عظیم کے اس زمانے کی داستان ہے، جب حسنِ اتفاق سے اردو کے بعض مشہور ادیب (تاثر، مجید ملک، پطرس بخاری وغیرہ) دلی میں جمع ہو گئے تھے۔ ہانجن کشمیر سے متعلق ہے۔ ۱۹۲۹ء کے موسمِ گرما میں وہ کشمیر گئے تھے۔ اس افسانے میں اسی زمانے کے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ تیسرا افسانہ ظاہر ہے کہ سفرِ لندن کی یادگار ہے۔ سنا ہے کہ ان کے غیر مطبوعہ افسانوں کی بھی خاصی بڑی تعداد موجود ہے۔

انھوں نے اپنے شوق سے مختلف ممالک کے مشہور مصوروں کی تخلیقات کا اچھا

خاصاً ذخیرہ جمع کیا تھا۔ آرٹ سے متعلق مطبوعہ کتابیں بھی بہت سی تھیں۔ خوشی کا مقام ہے کہ ان کی وفات کے بعد حکومت پاکستان کی سرپرستی میں "چغتائی عجائب گھر" قائم کر دیا گیا ہے، جس میں ان کی سب چیزیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ وہ خود بھی یہی جانتے تھے؛ اس طرح ان کی وصیت بھی پوری ہو گئی۔

وہ شخصی زندگی میں بہت سادہ تھے۔ دن رات اپنے فن کی دھن میں رہتے، گھر سے بھی کم نکلتے تھے۔ کسی قسم کی علت نہیں تھی؛ نہ سگریٹ پیتے تھے، نہ شراب، حال آں کہ ان کے بیشتر دوست اور ملنے والے سگریٹ پیتے تھے اور ان میں سے کسی فنکار قسم کے حضرات تو شراب کے بھی رسیا تھے۔ چغتائی صاحب تاش کے پتوں تک کو نہیں پہچانتے تھے۔ مصوری کے علاوہ ان کا دوسرا سب سے بڑا شوق پتنگ بازی تھا۔ اپنے پتنگ خود ہی بناتے تھے۔ ان کی ساخت اور شکل و صورت میں طرح طرح کی اختراعات کی تھیں جو انی میں کھیل کود کا شوق بھی رہا، بلکہ شروع میں تو اسی کت کے مارے چندے تعلیم کا سلسلہ ہی ٹوٹ گیا تھا۔ کرکٹ، ہندو کا نشانہ، مچھلی کا شکار ان کے دل پسند مشغلے تھے۔ کرکٹ میں گیند اتنی تیزی اور قوت سے پھینکتے تھے کہ وکٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی تھی تیراک بھی اچھے تھے۔

بزرگ جمعہ ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء کو اپنے خالق کے حضور حاضر ہو گئے۔ جنازہ اگلے دن اٹھا اور انھیں امانٹا اپنے بزرگوں کے نزدیک لاہور کے مشہور قبرستان بیانی صاحب میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے اعزہ چاہتے ہیں کہ انھیں ایک خاص مقبرے میں دفن کیا جائے۔ اسی لیے جب تک اس کے انتظامات مکمل نہ ہو جائیں، فی الحال انھیں بیانی صاحب میں امانتاً دفنایا گیا ہے۔ بلکہ خود ان کی خواہش تو یہ تھی کہ "چغتائی عجائب گھر" ہی میں ان کا مدفن بھی بنے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

انھوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی (وزیر النساء بیگم) اپنے خاندان ہی سے تھیں۔ ان کے والد کا نام میاں محمد بخش چغتائی تھا۔ اس بیوی سے کوئی

اولاد نہیں ہوئی، ان کا ۲۳ مارچ ۱۹۶۶ء کو انتقال ہوا۔ دوسرا نکاح انھوں نے
 ۱۳ دسمبر ۱۹۴۲ء کو کیا تھا۔ یہ بیگم (کشور باثوم) امرتسر کے ایک کشمیری خاندان سے
 ہیں۔ ان کے بطن سے دو بچے ہوئے۔ بڑی بیٹی (مسرت) نے فلاسفی میں ایم اے
 کیا اور پنجاب بھر میں اول رہیں۔ وہ شادی شدہ اور اپنے گھر بار والی ہیں۔ ان
 سے چھوٹا ایک بیٹا عارف الرحمن چغتائی (ولادت: ۲۰ اگست ۱۹۴۹ء) ہے
 عارف میاں نے برنس ایڈمنسٹریشن میں ایم اے تک تعلیم پائی ہے۔ وہ انگریزی
 میں شاعری بھی کرتے ہیں اور ان کے دو مختصر مجموعے شائع کر چکے ہیں۔

دیوان سنگھ مفتون، سردار

پنجاب (پاکستان) کے ضلع گوجرانوالہ میں ایک خاصا بڑا قصبہ حافظ آباد ہے۔ یہ تحصیل کا صدر مقام بھی ہے تقسیم ملک (۱۹۴۷ء) تک کھتری قوم کی کھتہ برادری کا یہاں کے عہد میں شمار ہوتا تھا۔ اسی برادری کے ایک سکھ گھرانے کے ایک فرد ڈاکٹر ندھان سنگھ تھے۔ وہ سرکاری ملازمت میں تھے اور ڈاکٹر کی حیثیت سے پنجاب کے مختلف مقامات (میا نوالی، جہلم وغیرہ) میں تعینات رہے تھے۔ جب وہ جہلم کے سرکاری اسپتال کے انچارج تھے، تو یہاں ۱۴ اگست ۱۸۹۰ء کو ان کے گھر دوسرا لڑکا (اور چوتھا بچہ) پیدا ہوا۔ اس سے پہلے ان کی اولاد میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا کرتار سنگھ موجود تھے۔ اس نومولود کا نام انھوں نے دیوان سنگھ رکھا۔ یہی بچہ آگے چل کر سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر ریاست ہوا، اور اس نے تاریخ صحافت اردو میں لافانی مقام حاصل کیا۔

دیوان سنگھ مفتون صرف ۴۰ دن کے تھے کہ ان کے والد ڈاکٹر ندھان سنگھ کا جہلم ہی میں انتقال ہو گیا۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی، خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ ڈاکٹر ندھان سنگھ نے اپنی طویل ملازمت کے دوران میں بہت کچھ کمایا اور پس انداز کیا تھا۔ اس کے علاوہ غیر منقولہ جاداد بھی کم نہیں تھی۔ اگر حالات معمول کے موافق رہتے، تو ان کے پسماندگان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونا چاہیے تھی۔ لیکن ہندو سماج میں (اور وہ بھی آج سے ایک صدی قبل کے سماج میں) بیوہ کی حالت بہت

زندہ تھی۔ رشتے دار اور عزیز قریب اس غریب کے اور اس کے یتیم بے سہارا بچوں کے سر پر ہاتھ رکھنا اور ان کی حمایت کرنا تو درکنار، اس تاک میں رہتے کہ جو کچھ ان کے پاس ہے، اسے بھی ہتیا لیں۔ ڈاکٹر ندھان سنگھ کی وفات کے وقت بڑی لڑکی ۱۸ برس کی تھیں، کرتار سنگھ دس برس کے تھے۔ اور ان سے چھوٹی (دوسری) لڑکی پانچ برس کی تھی۔ اور دیوان سنگھ تو جیسا کہ ابھی ذکر ہوا، صرف ۴۴ دن ہی کے تھے۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی بیوہ بالکل بے یار و مددگار رہ گئی تھیں۔ اراضی اور مکانات پر مرحوم کے ایک بھائی نے قبضہ کر لیا اور ان بچوں کے جوان ہونے پر بھی یہ جاداد واپس دینے سے انکار کر دیا۔ گھر میں جو اندوختہ تھا، وہ آہستہ آہستہ بچوں کی پرورش اور دو لڑکیوں اور بڑے بیٹے کی شادی کے مصارف میں ختم ہو گیا۔ جب نقد اور زیورات ٹھکانے لگ گئے، تو اثاثہ البیت تک فروخت کرنے کی نوبت آ گئی۔ قصہ کوتاہ، جب دیوان سنگھ کی دس بارہ برس کی عمر ہوئی ہے تو افلاس اور ادبار نے گھر میں ڈیرا ڈال رکھا تھا۔

ایسے حالات میں بالعموم سب سے چھوٹا بچہ سب سے زیادہ گھائے میں رہتا ہے؛ اس کی تعلیم و تربیت نہیں ہو سکتی۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ دیوان سنگھ لاشتم لاشتم پانچویں تک تو بڑھ سکے، اس کے بعد ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ گھر میں روزمرہ کے اخراجات تک پورا کرنے کے لالے پڑے ہوئے تھے، ان کی فیس اور کتابوں وغیرہ کے لیے کہاں سے آتا! چنانچہ یہ خالصہ ہائی اسکول، گوجرانوالہ سے جہاں انھوں نے داخلہ لیا تھا، تین چار دن بعد واپس آ گئے۔

حالات سے مجبور ہو کر دیوان سنگھ اب وہیں حافظ آباد میں پانچ روپے ماہانہ پر ایک کپڑے کی دکان پر نوکر ہو گئے۔ یہ ملازمت دو تین برس رہی۔ اس کے بعد انھوں نے کوشش کر کے فیروز پور کے سول اسپتال میں کمپاؤنڈر کی نوکری حاصل کر لی۔ چھ روپے مشاہرہ ملنے لگا۔ کچھ مدت بعد اسی حیثیت سے منڈی ابوہر (ضلع فیروز پور) کے اسپتال میں تبادلہ ہو گیا۔ لیکن یہاں وہ زیادہ دن

نہیں رہے؛ فیروزپور واپس چلے آئے۔ فیروزپور میں مشکل سے چھ مہینے گزرے ہونگے کہ پھر تبادلہ ہوا۔ اور اب کے وہ موگا (ضلع فیروزپور) پہنچ گئے۔ موگا کی یہ خصوصیت ہے اور اس شہر کے لیے باعثِ فخر بھی کہ آنکھوں کے مشہور معالج راجہ بہادر ڈاکٹر منٹھرا داس (ف: ۱۶ مارچ ۱۹۷۲ء) یہاں رہتے تھے۔ وہ بھی اصل میں حافظ آباد ہی کے رہنے والے تھے، لیکن موگا میں بس گئے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک اسپتال قائم کیا تھا، جس میں موتیابند کے علاج کے منلاشی مرلین آکر رہتے تھے۔ ڈاکٹر منٹھرا داس کی دیوان سنگھ کے خاندان سے دُور نزدیکی کی کچھ عزیز داری بھی تھی۔ انھوں نے ڈاکٹر منٹھرا داس سے درخواست کی کہ مجھے اپنے اسپتال میں کام سیکھنے کا موقع دیجیے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان کا شوق دیکھتے ہوئے خوشی سے اجازت دے دی۔

وہ اس اسپتال میں کمپاؤنڈر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ شروع میں نور علی شاہرہ تھا؛ بعد کو ترقی ہوئی، تو بارہ ملنے لگے۔ ساتھ ہی موتیابند کا آپریشن کرنے کی تعلیم پاتے اور اس کی مشق بھی کرتے تھے۔ یہاں وہ تین برس رہے۔ جب ہاتھ جم گیا اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی، تو انھوں نے ملازمت سے استعفا دے دیا اور مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں آزادانہ نجی طبی پریکٹس شروع کر دی۔ خدا نے ان کی محنت اور خلوص میں برکت دی، کام چل نکلا۔ یہاں انھوں نے اپنا ایک چھوٹا موٹا اسپتال بھی قائم کر لیا، جہاں وہ موتیابند کے آپریشن کرتے تھے، اور باہر کے مریضوں کو ٹھہراتے تھے۔ غرض اب زندگی کا مہیاب کہی جاسکتی تھی۔ شہرت بھی حاصل تھی اور تین چار سو روپے مہینے کی آمدنی بھی۔

یہیں مانسہ میں وہ واقعہ پیش آیا، جس نے انھیں ”ڈاکٹر دیوان سنگھ“ کی جگہ ”دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر مہنتہ وار ریاست“ بننے کی راہ پر ڈال دیا۔

فیروزپور اسپتال میں تھے، ”جب انھیں اردو رسائل پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں وہ ماہنامہ ”زمانہ“ (کاپنور) کے خربدار بن گئے۔ ”مخزن“ (لاہور) ان

کے ملنے والے ایک صاحب کے پاس آتا تھا، یہ اس سے مستعار لے کر پڑھنے لگے۔ یہ سلسلہ شوق ابوہر اور موگا میں بھی نہ صرف جاری رہا، بلکہ اس میں ترقی ہوتی گئی۔ اب اور ماہنامے بھی آنے لگے، بلکہ یہ روزنامہ ”انبار عام“ (لاہور) کے بھی باقاعدہ خریدار بن گئے۔ جہاں گئے، وہاں کے بعض علم دوست اصحاب سے بھی روابط پیدا ہو جاتے۔ ان سے نہ صرف پڑھنے کو وسائل و جرائد ملتے، بلکہ ان کی صحبت میں دل و دماغ کی صلاحیتوں پر حلا بھی ہوتی چلی گئی۔ یہ صورت حال تھی، جب وہ مالنسہ میں بلا شرکت غیرے ایک اسپتال اور تین چار سو روپے ماہانہ آمدنی کے مالک تھے۔

ایک دن اسخوں نے ایک مضمون لکھا اور اسے شیر سنگھ فیروز پوری کے فرغی نام سے لاہور کے ہفتہ وار ”خالصہ اخبار“ کو بھیج دیا۔ مضمون چھپ گیا۔ اسی نام سے دو تین اور مضمون بھی اسے پرچے میں شائع ہوئے۔ سٹوڈنٹس دن بعد اخبار کے منیجر سجائی مول سنگھ کا خط آیا کہ کیا آپ مستقل طور پر ”خالصہ اخبار“ کی ایڈیٹری کی ذمہ داری لینے کو تیار ہیں؟ اور اگر جواب اثبات ہو تو، کیا تنخواہ قبول کریں گے؟ اسخوں نے جواب دیا کہ میں یہاں ڈاکٹری کرتا ہوں اور اس سے تین چار سو ماہانہ پیدا کر لیتا ہوں۔ میری تعلیم معمولی ہے، لیکن مطالعہ کافی ہے، اور مجھے لکھنے کا شوق بھی ہے۔ سجائی مول سنگھ نے اس پر لکھا کہ ہم تو ایڈیٹر کو ۶۰ روپے سے زیادہ مشاہرہ نہیں دے سکتے! آپ کی موجودہ آمدنی کے پیش نظر آپ کو خالصہ اخبار کی ایڈیٹری پیش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بظاہر معاملہ یہیں پر ختم ہو جانا چاہیے تھا کہ ۶۰ اور ۳۰۰۔۴۰۰ میں جو بین فرق ہے، اسے کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے! لیکن دیوان سنگھ کی بیجان پسند طبیعت کو چین کہاں! اسخوں نے ایک بزرگ ہربان سے مشورہ کیا کہ صورت حال یہ ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ان صاحب نے لکھا کہ اس میں شک نہیں کہ تمہارے

قلم میں غیر معمولی زور ہے اور کامیاب صحافی بننے کی صلاحیت بھی، تجربہ کر لینے میں کیا مضائقہ ہے! اس رے نے دیوانہ راہوں سے بس است، کام کام کیا۔ انھوں نے سجائی مول سنگھ کو لکھا کہ میں ۴ روپے ماہانہ ہی پر خالصہ اخبار کی ادارت قبول کرتا ہوں۔ اور مالنسہ میں اپنا جما جمایا، چلتا کاروبار چھوڑ کر لاہور پہنچ گئے۔

وہ اس اخبار میں مشکل سے چار مہینے رہے ہو گئے۔ بیشک، ان کے زوردار اداریوں سے پرچہ بہت مقبول ہو گیا، لیکن ان کی تحریریں حکومت کی نظر میں خلاف قانون ٹھہریں، اور پرچے کے مالک اور طابع اور ناشر پر متعدد مقدمے قائم ہو گئے۔ ایک بمبصر (شیر پنجاب) کے ایڈیٹر سردار امر سنگھ (ف: جولائی ۱۹۴۸ء) نے بھی ازالہ حیثیت عرفی اور ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ کونسا اخبار اتنے "لائق" مدیر کا خرچ برداشت کر سکتا ہے! ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو! قدرتنا دیوان سنگھ ملازمت سے برخاست کر دیے گئے۔

اب وہ بیکار تھے، لیکن مایوس نہیں ہوئے۔ چندے ادھر ادھر کچھ اخباروں میں کام کیا، تاہم حالات تسلی بخش نہیں تھے۔ بہر حال انھوں نے محسوس کر لیا کہ اب صحافت ترک کر کے کوئی اور پیشہ اختیار کرنا ممکن نہیں۔ اور صحافت میں ان کی تعلیم و تربیت بمنزلہ صفر تھی۔ فیصلہ کیا کہ اگر صحافت ہی کو بقیہ عمر کے لیے ذریعہ معاش بنانا ہے، تو لازم ہے کہ اسے کسی کامل استاد سے سیکھا جائے۔ مشہور صحافی رام رچھپال سنگھ شیدا (ایڈیٹر ہندوستان) ان دنوں لاہور میں تھے۔ اور دیوان سنگھ مفتون کے ان سے مراسم تھے۔ انھوں نے شیدا صاحب سے پوچھا کہ اردو صحافت میں سب سے لائق اور تجربہ کار کون صاحب ہیں؟ شیدا نے سید بشارت علی جالب دہلوی (ف: جولائی ۱۹۳۰ء) کا نام لیا، جو اس زمانے میں روزنامہ مہدم، لکھنؤ کے مدیر تھے۔ اس پر دیوان سنگھ نے جالب صاحب کو لکھا کہ میں آپ سے صحافت سیکھنا چاہتا ہوں! اگر آپ اجازت

دیں، اور میرے لکھنؤ میں بسر اوقات کے لیے کچھ مقرر فرمادیں، تو میں حاضر خدمت ہو جاؤں۔ جالب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یاد دہانی کرائی، تو اب کے بھی عداے برنخواست۔ دیوان سنگھ بھلا یوں کہاں ٹلنے والی اسامی تھے! انھوں نے ریل کا ٹکٹ خریدا اور لکھنؤ پہنچ گئے۔ ساتھ کا مختصر سامان ایک گوردوارے میں رکھا اور مہدم کے دفتر جا دھکے۔ جالب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فرمایا کہ چونکہ ہمارے دفتر میں کوئی جگہ خالی نہیں تھی، اس لیے کوئی جواب نہیں دے سکا۔ دیوان سنگھ نے کہا کہ اگر صرف ۳۰ روپے ماہانہ کا انتظام ہو جائے، تو میں یہاں رہ کر آپ سے کچھ حاصل کروں۔ جالب نے پھر نفی میں جواب دیا اور کہا کہ کوئی خالی جگہ ہے ہی نہیں، نتخواہ کا کیا سوال ہے! اب دیوان سنگھ نے کہا کہ میں چیر اسی کے طور پر بھی رہنے کو تیار ہوں، کیونکہ میرا مقصد تو آپ کے دفتر میں، آپ کے نزدیک رہنا ہے، تاکہ میں آپ سے کچھ حاصل کر سکوں۔ اس پر بھی جالب نے وہی جواب دیا کہ چیر اسی کی بھی جگہ خالی نہیں ہے۔ اس پر اسی مردِ قلندر نے کہا کہ اچھا فرمائیے کہ کیا آپ کو میرے بغیر کچھ نتخواہ لینے، مفت کام کرنے پر بھی کچھ اعتراض ہوگا؟ جالب نے کہا کہ بھلا کسی کے مفت کام کرنے پر بھی اعتراض ہو سکتا ہے! اس پر انھوں نے شہر میں ایک کیمسٹ کی دکان پر پندرہ روپے ماہانہ کی نوکری تلاش کر لی۔ دن بھر مہدم کے دفتر میں مفت کام کرتے، چھ بجے شام سے آدھی رات تک اس کیمسٹ کے ہاں رہتے، اور جب وہاں سے چھٹی ملتی، تو گوردوارے آکر پڑ رہتے۔ وہ لکھنؤ میں غالباً چھ مہینے رہے؛ شاید اور رہتے، لیکن سخت بیمار پڑ گئے۔ جب علاج معالجے سے اچھے ہو گئے، تو لاہور واپس چلے آئے؛ اور شیدا صاحب کے اخبار ”ہندوستان“ میں نوکری کر لی۔

اس واقعے سے دیوان سنگھ کے کردار اور ان کی کامیابی کا راز کھلتا ہے۔ اگر ان کے سامنے کوئی مقصد ہوتا، تو اس کے حصول کی خاطر وہ راہ کی مشکلات سے

گھر اگر اس سے دست بردار نہیں ہو جاتے تھے منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے وہ
 سی ادنیٰ سے ادنیٰ کام سے بھی جی نہیں چراتے تھے۔ ان کی تمام کامیابیوں کا راز
 انھیں دو باتوں میں پنہاں ہے؛ مشکل سے نہ گھبرانا اور محنت سے جی نہ چرانا۔
 یہ ”ہندستان“ میں کام کرتے تھے کہ مشہور سکھ لیڈر ماسٹر موٹا سنگھ نے ان سے کہا
 کہ مہاراجا پٹیلہ کے آدمی بھسور (ریاست پٹیلہ) کے قومی کارکن بابو تیجا سنگھ کو
 بہت تنگ کر رہے ہیں کیونکہ بابو صاحب نے مہاراجا کی بعض ناجائز خواہش پوری
 کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس پر دیوان سنگھ بھسور پہنچے، ماسٹر موٹا سنگھ اور
 بابو تیجا سنگھ سے ملے، سارے حالات سنئے۔ مشورہ ہوا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر طے
 پایا کہ مہاراجا بہادر کی کارگزاریوں کا سجانڈا اچھوڑا جائے، اخباروں میں مضمون
 لکھے جائیں اور دیوان سنگھ خود حالات متقیاب کرنے کے لیے اردو میں ایک
 پمفلٹ بھی لکھ کر شائع کرے۔

قرار داد کے مطابق دیوان سنگھ نے پمفلٹ بعنوان ”خونِ شہادت کا تازہ قطرہ“
 لکھا اور چھپوا دیا۔ وہ اس کے دو سو نسخے جلدی سے تیار کر دے دفتر کی ہاں
 سے اٹھا لائے اور انھیں دوستوں میں تقسیم کر دیا۔ شدہ شدہ اس کی خبر مہاراجا
 کے آدمیوں کو بھی ہو گئی۔ انھوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا، جس پر حکومت
 ہند نے پمفلٹ بحق سرکار ضبط کر لیا اور پولیس نے دفتری کے ہاں سے بقیہ ۱۸۰۰
 نسخے اپنے قبضے میں لے لیے۔ جب دیوان سنگھ کو حالات کی خبر ملی، تو انھیں
 افسوس ہوا کہ کی کرائی محنت ضائع گئی۔ لیکن انھوں نے ہتھیار ڈالنے سے
 انکار کر دیا۔ بھسور پہنچ کر پھر ماسٹر موٹا سنگھ اور بابو تیجا سنگھ سے مشورہ کیا۔
 دونوں نے کہا کہ کچھ ہو، پمفلٹ دوبارہ شائع ہونا چاہیے۔ اس پر یہ دلی گئے،
 یہیں اس کی کتابت کرائی اور ایک دن میں اسے طبع کر کے اور دو ہزار
 نسخے کے کرواپس روانہ ہو گئے۔ رشتے میں لدھیانہ، جالندھر، امرتسر کے ڈاکخانوں
 سے مختلف دوستوں کے نام پارسل بھیجتے ہوئے لاہور پہنچے، اور بقیہ نسخے وہاں

سے ارسال کر دیے۔

پولیس نے تفتیش کی، تو انھیں پتا چل گیا کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔ اس پر یہ دو ہفتے بعد گرفتار کر لیے گئے۔ اب ایک لطیفہ ہوا !

جس دن پولیس نے انھیں پکڑا ہے، اتفاق سے اس دن اتوار تھا۔ سٹھانے والوں نے انھیں ہتکڑی لگا کر انگریز ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر بھیجا کہ ان سے ریمانڈ پر دستخط کرائے جائیں، مقدمہ تحقیقات مکمل ہونے پر بعد کو دائر ہو تا رہیگا۔ ان کی خوش قسمتی کہ جب سٹھانیدار انھیں ہتکڑی لگاتے ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر پہنچا ہے، تو صاحب بہادر نشے میں چور تھے۔ سٹھانیدار نے ان سے کوالف بیان کر کے ریمانڈ پر دستخط کرنے کی درخواست کی، تو خدا معلوم، وہ پوری بات سمجھ بھی یا نہیں؛ انھوں نے دیوان سنگھ سے پوچھا: ویل، تم کل ہماری عدالت میں حاضر ہو گا؟ دیوان سنگھ نے کہا: اگر آپ کہتے ہیں، تو میں ضرور آؤں گا۔ اس پر ڈپٹی کمشنر نے سٹھانیدار کو حکم دیا کہ ملزم کی ہتکڑی کھول دو اور اسے رہا کر دو؛ یہ کل عدالت میں حاضر ہو جائیگا۔ وہ تو یہ کہہ کر بنگلے کے اندر چلے گئے، ادھر سٹھانیدار غریب حیران، پریشان کہ ڈیفنس آف انڈیا کا مقدمہ، دو ہفتے کی دن رات کی تنگ و دوکے بعد ملزم گرفتار ہوا؛ اور صاحب نے یوں اس کی رہائی کا حکم دے دیا! لیکن حکم حاکم، مرگِ مفاجات، کرتا تو کیا کرتا؛ اس نے انھیں رہا کر دیا۔

اگلے دن پیر تھا، یہ حسبِ قرار داد عدالت میں حاضر ہو گئے۔ اب صاحب کا نشہ اتر چکا تھا اور وہ اپنی پہلے دن کی کارگزاری پر کچھ متعجب اور پریشان بھی تھا۔ لیکن جو تیرکمان سے نکل چکا تھا، وہ اب واپس کیونکر آ سکتا تھا! اس نے دیوان سنگھ سے کہا کہ اگر تم معافی چاہو، اور وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی ایسا پمفلٹ نہیں لکھو گے، تو ہم تم کو چھوڑ دیتا ہے۔ انھوں نے جوانی کی نرنگ میں جواب دیا کہ میں نہ معذرت کرتا ہوں، نہ کوئی وعدہ؛ آپ کو مقدمہ چلانا ہے، تو خوشی سے چلائیے۔ اس پر صاحب کھسیا نے ہوئے چہرے پر اسی کو حکم دیا کہ اس رٹر کے کور

عدالت سے نکال دو؛ یہ نہیں جانتا کہ مقدمہ کیا ہوتا ہے ! وہاں کیا دیر تھی چیرا سی نے انہیں گردن پکڑ کر باہر ڈھکیں دیا۔ جان بچی، لاکھوں پائے صاحب نے سیل پر لکھ دیا، ملزم نا تجربہ کار نوجوان چھو کر لے، اسے تنبیہ کر دی گئی ہے۔ سیل داخل دفتر کر دی جاتے۔

یہ ان کی زندگی کی پہلی تصنیف تھی؛ اور پہلی گرفتاری بھی۔

اب یہ پھر بیکار تھے۔ بسر اوقات کے لیے چند سے لاہور کے مختلف پریچوں (گورڈ گھنٹال، ہندو، اکالی وغیرہ) میں جزوقتی کام کرتے رہے۔ لیکن کب تک؟ آخر ۱۹۲۰ء میں دلی پہنچے۔ ان دنوں یہاں اخباری دنیا میں خواجہ حسن نظامی مرحوم (ف: جولائی ۱۹۵۵ء) کا ڈنکا بجتا تھا۔ انہیں نئے نئے اخبار جاری کرنے کی گویا دھن تھی۔ دیوان سنگھ ان سے ملے اور طے پایا کہ ایک روزنامہ ”رعیت“ کے نام سے جاری کیا جائے۔ اس میں دیوان سنگھ نے ۲۵۰ روپے لگائے، بقیہ سرمایہ خواجہ صاحب مرحوم کا تھا۔ شرط یہ تھی کہ دیوان سنگھ صرف تیس روپے ماہانہ اپنے ذاتی خرچ کے لیے لینگے، روزانہ خواجہ صاحب کی کتابوں کا ایک صفحہ کا اشتہار اخبار میں مفت شائع ہوگا۔ اگر اخبار میں منافع ہوا، تو دونوں شریک برابر کے حصے دار؛ اگر نقصان ہوا تو اسے خواجہ صاحب پورا کر نیچے۔ لیکن پوری کوشش کے باوجود اخبار گھٹاٹے میں رہا۔ چند مہینے کے بعد خواجہ صاحب نے کہا کہ بھائی، اب زیادہ نقصان برداشت نہیں کیا جاسکتا، ہمیں اخبار بند کر دینا چاہیے۔ قدرنا دیوان سنگھ کو اس فیصلے سے بہت افسوس ہوا۔ ابتدائی ڈھائی سو توڑو بے ہی تھے، اب پھر مستقبل کا سوال سامنے آگیا۔

خواجہ صاحب موصوف کے عزیز دوستوں میں ملا واحدی (ف: اگست ۱۹۷۷ء) بہت مشہور شخصیت تھی۔ یہاں دلی میں ان کی بڑی ساکھ تھی، وہ مینوسپل کمیٹی کے رکن بھی تھے۔ اس زمانے میں وہ ماہنامہ ”نظام المشائخ“ نکالتے تھے۔ انہوں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ آپ ”رعیت“ مجھے دے دیجیے، میں اسے چلاؤنگا۔ غرض، ”رعیت“ کا دفتر واحدی صاحب کے مکان کو چہ چیلان میں اکٹھا کیا۔ بھوپال سے

نیاز فتحپوری اس کی ادارت کے لیے بلائے گئے۔ حکومت کو اخبار کی پالیسی پسند نہ آئی؛ وہ اس کی متواتر نکتہ چینیوں سے چیں بچیں تھی۔ اتنے میں نیاز کے مصرعے متعلق دو ادارے گویا روایتی اونٹ کی پشت پر آخری تنکا ثابت ہوئے۔ حکومت نے ملا واحدی سے ضمانت طلب کر لی، اور مطبع ضبط کر لیا۔ پرچے نے دم توڑ دیا۔ یہ کہ آج تک بھی یہ ملا واحدی کی ضد سے چل رہا تھا، ورنہ اس میں منافع کی صورت تو کبھی ایک دن بھی پیدا نہیں ہوتی تھی۔

دیوان سنگھ پھر بیکار ہو گئے، اور حسب معمول جیب بالکل خالی۔ ”رعیت“ میں کام کرنے کے زمانے میں ان سے دیوبند کے ایک تاجر لالہ اوگر سین کی ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ دیوان سنگھ کی محنت کی عادت اور فرض شناسی سے بہت متاثر تھے۔ لالہ جی نے انھیں پیشکش کی کہ آئیے، ہمیں چل کر آرٹھت کا کاروبار کریں۔ مرتا کیا نہ کرتا! مجبوراً دیوان سنگھ نے ۱۵۰ روپے مشاہرے پر ان کی ملازمت قبول کر لی اور کبھی چلے گئے۔ لیکن تجارت ان کے بس کی بات نہیں تھی، نہ کوئی اس کا تجربہ ہی تھا۔ مشکل سے انھوں نے چار مہینے سیٹھ صاحب کے ساتھ کاٹے اور سجاگ نکلے۔ اس کے بعد مہاراجا رپوڈ من سنگھ دانی نا بھ کے جن سے سردار سردول سنگھ کو پیشہ کے ذریعے سے تعارف ہو چکا تھا، ملازم ہو کر نا بھ چلے گئے۔ وہ نا بھ میں کوئی ڈھائی تین سال رہے۔ یہاں وہ دوسروں پرے ماہانہ پاتے تھے۔

مہاراجا رپوڈ من سنگھ اپنی قوم پرستی اور انگریز دشمنی کے لیے مشہور تھے۔ اسی لیے سکونت مہند کا پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ ان کے خلاف ہو گیا اور حکومت انھیں گدی سے اتارنے کے لیے بہانے ڈھونڈنے لگی۔ بالآخر حکومت نے ۱۹۲۳ء میں مہاراجا کو اختیارات سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا، جس کے بعد وہ ڈیرہ دون میں مقیم ہو گئے۔ لیکن حکومت ان کی سرگرمیوں سے مطمئن نہیں تھی۔ مہاراجا نے بھی کچھ بے احتیاطی سے کام لیا۔ آخر کار ۱۹۲۸ء میں انھیں الہ آباد کے ریوے اسٹیشن پر گرفتار کر کے کوڈائی کنال میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہیں ۱۹۴۲ء میں ان کا انتقال

ہوا۔ اس جلا وطنی کے زمانے میں ان کی بیوی سررجینی دیوی بھی ان کے ساتھ نظر بند رہی تھیں؛ ان کی ۳۴ دسمبر ۱۹۷۷ء کو نئی دہلی میں رحلت ہوئی۔

جب مہاراجا نا بھ کو گدی سے اتارا گیا، تو دیوان سنگھ نے بھی وہاں سے روانہ ہونے کی تیاری کی کہ اب وہاں ان کا کون تھا جس کے بھروسے پر یہنا پھے میں رہ سکتے تھے! انھوں نے انگریز منظم اعلیٰ (ایڈمنسٹریٹر) مسٹر اوگلوی کی خدمت میں استعفیٰ پیش کر دیا۔ اوگلوی نے اول تو ان سے استعفیٰ واپس لینے کو کہا اور ملازمت جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ لیکن اصرار کرنے پر انہی رعایت کی کہ اچھا پندرہ دن تک میں اسے منظور نہیں کرتا؛ یہ وقفہ آپ کی رخصت میں محسوب کر لیا جائیگا۔ اس دوران میں غور کر لیجیے۔ اگر اس کے بعد بھی آپ اس فیصلے پر بضد رہے، تو استعفیٰ منظور کر لیا جائیگا۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ یہنا بھ سے فوراً مہاراجا سے ملاقات کے لیے ڈیرہ دون پہنچے۔ وہاں مہاراجا نے انھیں ایک نجی خط دے کر حیدرآباد بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ حکومت ہند کی خفیہ پولیس ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہی تھی، اور انھیں معلوم تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں! چنانچہ جب وہ حیدرآباد سے واپس نا بھ پہنچے کہ اپنا سامان وغیرہ لے کر اس شہر کو خیر باد کہہ دیں، تو پولیس نے انھیں گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ قصور یا الزام کچھ نہیں بتایا، بس نظر بند کر دیا۔

ان کے دوستوں کی بھی کسی نہیں تھی۔ خود مہاراجا نے مجلسِ وضع قوانین کے اراکین دوستوں کو لکھا۔ خدا خدا کر کے معاملہ لارڈ ریڈنگک والیسر سے ہند کے سامنے پیش ہوا اور انھوں نے ان کی رہائی کا حکم صادر فرما دیا۔ یہ تین مہینے نظر بند رہے تھے۔

نا بھ کی ملازمت کے دوران میں انھوں نے وہاں ظلم و ستم کے کئی واقعات اپنی نگہوں دیکھے تھے۔ قرب و جوار کی دوسری ریاستوں کے حالات بھی کچھ بہتر نہیں تھے، وہاں کی بعنوانیوں کی کہا بنیاں بھی آنے والے سناتے رہتے تھے۔ دیوان سنگھ جب یہ باتیں سنتے، تو ان کا خون کھولتا اور چاہتے کہ کسی طرح ان مظلوموں کی روداد حکومت

ہند اور عوام تک پہنچائی جائے، تاکہ ان کی داورسی ہو سکے۔ اسی زمانے میں انھوں نے دیر سویر ایک اخبار جاری کرنے کا عزم کر لیا جس کے ذریعے سے دالبان ریاست کے مظالم طشت از بام کیے جائیں اور ان کی مصیبت زدہ رعایا کی دردناک کہانی ملک و قوم کو سنائی جائے۔

جب یہ نا بھہ کی نظر بندی سے چھوٹے، نو سیدھے دلی پہنچے۔ اب انھوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا اقدام کیا۔ دوستوں سے مشورہ ہوا کسی نے حوصلہ افزائی کی؛ کسی نے اس خازنار سے دامن بچانے کی صلاح دی۔ روپے کا سوال الگ تھا۔ وہ ہمیشہ فضول خرچ رہے۔ نا بھہ کی پوری ملازمت کے دوران میں بھی کچھ پس انداز نہیں کیا تھا کہ اب اخبار شروع کرتے وقت کام آتا۔ قصہ کوتاہ، کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ ایک ہفتہ وار جاری کیا جائے اور موضوع کی مناسبت سے اس کا نام "ریاست" ہو۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ ایک بنیے سے فرض لیا اور یوں ۱۹۲۲ء میں اس کا آغاز ہوا۔

"ریاست" کا اجرا کئی پہلوؤں سے عہد آفریں تھا۔ یہ پہلا پرچہ ہے جس میں خاص طور پر دیسی ریاستوں کے حالات اور معاملات پر بخوبی اور صراحت سے تنقید کی گئی۔ اس سے پہلے اگر کوئی ریاستوں کے بارے میں کچھ لکھتا بھی تھا، تو صرف والی ریاست کی مدح میں قصیدہ، تاکہ اس سے کچھ فتوح حاصل ہو سکے؛ لکھنے والے کو ریاست کی رعایا سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ پھر یہ پرچہ جس آب و تاب سے چھپنا شروع ہوا، وہ بھی اردو صحافت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سے پہلے صرف مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم (ف: فروری ۱۹۵۸ء) کا الہلال (البلاغ) اس شان سے نکلا تھا۔ لیکن وہ خوش و خاشد، ولے دولت مستعجل بود کا مصداق ثابت ہوا۔ اور صرف چار برس زندہ رہ کر بند ہو گیا۔ "ریاست" کے سلسلے میں اس کے مدیر اعلیٰ (دیوان سنگھ) کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا، وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ چونکہ اس پرچے میں مختلف ریاستوں کی بی زبان اور مظلوم رعایا کی حمایت میں

وہاں کے حکمرانوں کے کرتوتوں کا کچا چھٹا چھپتا تھا، اس لیے تمام والیان ریاست نے گویا دیوان سنگھ کے خلاف متحدہ محاذ بنالیا۔ کئی مقدمے دائر ہوئے جن میں فریقین کون تھے، ایک طرف راجا ہمارا جابا نواب کی بے پایاں دولت اور اثر و رسوخ، اور دوسری طرف ایک ہفتہ وار اخبار کا بیچہ و تنہا ایڈیٹر اور اس کے محدود وسائل۔ لیکن آفریں ہے دیوان سنگھ کو کہ انھوں نے جو قدم پہلے دن اٹھایا تھا، اس سے ذرہ برابر پسپائی قبول نہیں کی اور میدان میں ڈٹے رہے۔ ان پر بعض اوقات مختلف ریاستوں کی طرف سے بیک وقت چار چار مقدمے چلائے گئے، ایک شمال میں، دوسرا جنوب میں، تیسرا مغرب میں، چوتھا یہاں دلی میں۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس سے کتنی جسمانی تکلیف اور ذہنی کوفت ہوتی ہوگی! پھر مالی زیر باری اپنی جگہ۔ ان پر اپنی زندگی میں پندرہ مقدمے چلے۔ ان میں سب سے مشہور نواب بھوپال کا مقدمہ ہے، جو ہوشنگ آباد میں چھ برس تک جاری رہا۔ اور جس میں آخر کار دیوان سنگھ کو تین مہینے قید کی سزا ہوئی۔ مرحوم کہتے تھے کہ اس میں میرا ستی ہزار روپیہ خرچ ہوا تھا۔ اس کے باوجود یہ کبھی نہیں ہوا کہ ان مادی اور معنوی تکالیف سے پریشان ہو کر نا انصافی یا ظلم و ستم سے سمجھوتا کر لینے کا خیال بھی ان کے دماغ میں آیا ہو۔

ریاست کی ایک اور خدمت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

ہماری سیاسی جنگ کا اصلی محاذ تو انگریزی حکومت کے خلاف تھا، جس نے ہماری آزادی سلب کر کے پوری قوم کو غلام بنا رکھا تھا۔ لیکن ایک ذیلی محاذ اور بھی تھا اور اس پر بہت کم توجہ ہوئی۔ ہندوستان میں کوئی ۶۰۰ دہلی ریاستیں تھیں۔ ان کے حکمران مطلق العنان تھے، ان کا فرمودہ ریاست کا قانون تھا۔ جس کے خلاف کوئی داد سنتی نہ فریاد۔ ان ریاستوں کی ہستی اور بقا انگریز کے رحم و کرم پر تھی۔ اس لیے یہ والیان ریاست ہمیشہ انگریز کی حمایت کرتے اور حیب بس چلتا، رہنمایان قوم اور سیاسی لیڈروں کے خلاف اقدام کرتے رہتے تاکہ

اس طرح ولی نعمت انگریزی حکومت کی نظروں میں اپنی خیر خواہی اور فرمانبرداری کا نقش اور گہرا کر سکیں۔ غرض کہ یہ ریاستیں ہماری آزادی کے حصول میں ہمیشہ سید راہ ثابت ہوتیں۔ ”ریاست“ نے اسفہر، بیتقاب کر کے بہت بڑی خدمت سرانجام دی۔ اس سے جہاں ریاستوں کی رعایا میں بیداری اور اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا، وہیں اس سے انگریز کا وقار بھی ملیا میٹ ہو گیا، جو ان کا کارہ اور ننگ ملت و قوم راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کا پشت پناہ اور حامی تھا۔

”ریاست“ ۱۹۶۰ء تک جاری رہا۔ ملک آزاد ہوا، تو ریاستوں کی اہمیت بھی ختم ہو گئی۔ جلد ہی نہ ریاستیں رہیں، نہ ان کے حکمران، نہ ریاستوں کے مسائل۔ اس لیے حقیقت میں اب اس پرچے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ انھوں نے ایک مقامی دوست کے ساتھ اس کے جاری رکھنے کے لیے کچھ معاملہ کیا تھا، لیکن وہ بھی دیر پا ثابت نہ ہوا۔

دیوان سنگھ جنم کے فضول خرچ تھے۔ لاکھوں کما تے اور اڑا دیے، کبھی کل کی فکر نہ کی۔ ان کے ہاتھ میں چھید تھا، بڑا سا چھید، روپیہ اس میں ٹکتا نہیں تھا؛ ایسے میں کچھ پس انداز کرنے یا اڑے وقت کے لیے بچا رکھنے کا امکان ہی کیا تھا۔ ساری عمر صحافت کا کاروبار کرنے سے وہ کسی اور گون کے رہے بھی نہیں تھے۔ اس پر کبر سنی اور اعتدال قواء کا فقدان۔ واقعی پریشانی کا عالم تھا۔ بارے، مولانا ابوالکلام آزاد کی سفارش پر حکومت ہند نے ڈھائی سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا، اور پھر انھیں کے ایما پر حکومت پنجاب نے بھی غالباً پانسو ماہانہ دینا منظور کیے؛ یوں جان و تن کا رشتہ قائم رکھنے کا سامان ہو گیا۔

”ریاست“ بند کرنے کے بعد ۱۹۶۰ء میں دلی سے ہجرت کر کے راجپورہ (ڈیرہ دون) چلے گئے تھے۔ وہاں اکیلے رہتے تھے، بیوی بچے یہاں دلی ہی میں رہے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء کو غسٹخانے سے نکلنے ہوئے پانچ روپے لپٹ گیا اور گر گئے۔ سر میں چوٹ آئی۔ جس سے بہت خون خارج ہوا، علاج کے لیے وہاں اسپتال میں داخل ہو گئے۔

جب دلی میں گھر والوں کو اطلاع ہوئی، تو جا کر انھیں بوالائے۔ لیکن وقتِ اخیر آگیا تھا، ساری دوا دوش کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اتوار ۲۶ جنوری ۱۹۷۵ء آدھی رات سے کچھ پہلے روحِ نفسِ غصہ سے پرواز کر گئی۔ یوں وہ مردِ میدان بھی جس نے ساری عمر لڑتے بھگڑتے اور مخالفوں کا مقابلہ کرتے گزار دی تھی، فرشتہ موت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے!

تین بیٹے ان کی جسمانی یادگار ہیں: مہندر سنگھ، اونکار سنگھ، نندکار سنگھ سب یہیں دلی میں کاروبار کرتے ہیں۔

ان سے دو کتابیں یادگار ہیں: ناقابلِ فراموش اور جذباتِ مشرق۔ ناقابلِ فراموش انھوں نے جیل میں لکھنا شروع کی تھی۔ ۱۹۴۲ء کی ”ہندوستان چھوڑ دو“ تحریک میں وہ بھی قید کر دیے گئے تھے۔ ۱۸ اگست ۱۹۴۲ء کو گرفتار ہوئے اور تقریباً سال بھر بعد ستمبر ۱۹۴۳ء میں رہا کر دیے گئے۔ جیل خانے میں انھوں نے اپنی زندگی کے وہ واقعات قلمبند کرنا شروع کیے جو ان کی نظر میں اہم اور سبق آموز تھے۔ ان کی غیر حاضری کے زمانے میں ”ریاست“ بند رہا۔ ان کی رہائی کے بعد جب یہ ۳ اپریل ۱۹۴۴ء کو دوبارہ جاری ہوا، تو پہلے ہی شمارے میں یہ یادداشتیں ”ناقابلِ فراموش“ کے عنوان سے شائع ہونا شروع ہوئیں۔ ہند کو ان کا ایک مختصر مجموعہ کتابی شکل میں چھپا، تو بہت مقبول ہوا۔ اس سلسلے کی ہر دلعزیزی سے انھیں خیال پیدا ہوا کہ اسے مفصل کر دیا جائے۔ چنانچہ دوسری بار یہ کتاب نومبر ۱۹۵۵ء میں بڑے سائز کے ۴۱۵ صفحات پر شائع ہوئی۔ راجپوت کے قیام کے زمانے میں انھوں نے اس کا دوسرا حصہ ”سیف و قلم“ کے نام سے لکھا تھا۔ اور اس کی کٹنا بننا بھی موچکی تھی۔ یہ بھی خاصی ضخیم کتاب ہے۔ چھپ جاتے، تو اس سے ہمارے سوانحی ادب میں مفید اور دلچسپ اضافہ ہوگا۔

تعلیم کی کمی کے باوجود انھوں نے ساری عمر کی مشق سے، اردو سے اچھی خاصی واقفیت

حاصل کر لی تھی۔ اگرچہ ان کی زبان اغلاط سے پاک نہیں، لیکن ان کی تحریر میں بلا کی کشش ہے۔ ناقابل فراموش "میں تسلسل مفقود ہے؛ جستہ جستہ واقعات ہیں۔ ہر ایک واقعے کے آخر میں کوئی اخلاقی سبق دینے کی کوشش بھی موجود ہے، جو طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ ان سب نقائص کے باوجود، اس کی دلچسپی اور کشش کا یہ عالم ہے کہ انسان اس سے اکتاتا نہیں اور چاہتا ہے کہ اسے آخر تک پڑھ جائے۔ اس کتاب کا ہندی ترجمہ بھی "ترویینی" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ میں جب ۱۹۶۶ء میں افغانستان سے واپس آیا، اور انھیں معلوم ہوا، تو خواہش ظاہر کی کہ اس کا فارسی ترجمہ چھاپنے میں ان کی مدد کروں۔ میں نے عرض کیا کہ اصلی مسئلہ اس کے فارسی ترجمہ کرنے کا ہے۔ جب تک یہ نہ ہو، طباعت و اشاعت کے مرحلے کا کیونکر سوچا جاسکتا ہے! بہر حال وہ پہل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

ان کی دوسری کتاب "جذبات مشرق" بھی جیل کی دین ہے۔ مقدمہ بھوپال کے بعد وہ تین مہینے ناگپور جیل میں رہے تھے۔ یہیں انھوں نے ہندی، پنجابی، فارسی وغیرہ کے منتخب اشعار کا تشریحی ترجمہ شروع کیا۔ رہائی کے بعد مدتوں بیہر اجم بھی ریاست میں چھپتے رہے۔ انھیں کا مجموعہ بالآخر ۱۹۶۰ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔

ان کے نام کے ساتھ مفتون کا جزو تخلص نہیں تھا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم اپنے دوست احباب کو مختلف لقب اور خطاب دیا کرتے تھے۔ جس زمانے میں سردار دیوان سنگھ سے ان کے تعلقات خوشگوار تھے، انھوں نے انھیں "مفتون" کا لقب عطا کیا۔ اور یہ کچھ ایسا ان کے نام کے ساتھ لگا کہ جب تک آپ پورا نام "دیوان سنگھ مفتون" نہ کہیں، ان کی طرف کسی کا خیال جا ہی نہیں سکتا۔

مرحوم کی پوری زندگی سبق آموز ہے۔ مادی وسائل یکسر ندارد، تعلیم نہ ہونے کے برابر، ہر طرح کے ہنریافن سے کورے، حوصلہ افزائی کرنے والے یا بڑھاوا دینے والے مفتود۔ لیکن ان کی محنت و مشقت سے جی نہ چرانے کی عادت، اور بے پایاں

خود اعتمادی کا یہ ثمرہ تھا کہ انھوں نے بڑے بڑے پہاڑوں سے ٹکرائی۔ اور انھیں
اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ وہ آزادانہ جیے اور آزادانہ مرے۔

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے
یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

مسح الزماں، ڈاکٹر سید

ان کا خاندان جالس رنلج رلے بریلی، یوپی (کارہنے والا تھا۔ ان کے والد سید مہدی الزماں پیشے کے لحاظ سے بہت کامیاب وکیل، اور سماجی پہلو سے عمائد شہر میں سے تھے۔

مسح الزماں ۱۸ مارچ ۱۹۲۵ء کو جالس ہی میں پیدا ہوئے تعلیمی دور بہت کامیاب رہا۔ ۱۹۴۱ء میں بی، اے کے امتحان میں الہ آباد یونیورسٹی کے تمام اردو کے ابدواروں میں اول آئے، تو چنتا منی گھوش کا یادگاری سونے کا تمغا انعام میں ملا۔ دو برس بعد وہیں سے ایم اے (اردو) کی سند پائی، جس میں پھر تمام طلباء میں اول رہے پروکٹوریہ جو ملی تمغہ عطا ہوا، اس کے بعد پیر چاہتے تھے کہ وہیں سے ڈاکٹریٹ کی سند بھی حاصل کریں، لیکن اس وقت صدر شعبہ اردو ضامن علی ضامن (ف: ۲۵ اپریل ۱۹۵۵ء) تھے۔ اور وہی ان کے تحقیقی کام کے نگران بھی تھے۔ ان سے موضوع کے مسئلے پر اتفاق نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باٹ ٹالٹی رہی، اور بہت دن بعد کہیں ۱۹۴۸ء میں وہ ڈی لیٹ کے مرتبے تک پہنچے۔ صرف ۱۸ برس کی عمر تھی کہ ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں وہیں اپنی یونیورسٹی میں اردو کے مدرس (لیکچرر) مقرر ہو گئے؛ پہلے کچھ دن عارضی جگہوں پر رہے، بعد کو مستقل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ۱۹۴۶ء میں ریڈر کا مقام ملا۔ اس دوران میں دو برس کے لیے انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبہ اردو، فارسی و عربی کے صدر کی حیثیت سے

بھی کام کیا (نومبر ۱۹۶۹ء تا نومبر ۱۹۷۱ء) چونکہ وہاں تو بیع نہ ملی، اس لیے واپس الہ آباد چلے آتے۔

اگرچہ جسم کے لاغر اور قواء کے کمزور تھے، لیکن عام صحت کم و بیش ہمیشہ سٹھیک رہی۔ آخری وقت بہت دیر پائو آیا۔ ۹ فروری ۱۹۷۵ء کو اچانک دل کا دورہ پڑا، اور جان بحق ہو گئے۔ خدا مغفرت فرمائے۔ کربلا، الہ آباد (ہمت گنج) میں دفن ہوئے۔

جائس کے سادات امام دہم حضرت علی نقی علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ علم و فضل کے ساتھ شعر و ادب بھی ان کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ سید مسیح الزماں کے خاندان میں بھی پرانے مسلمان گھرانوں کی طرح عربی، فارسی کا بہت چرچا تھا۔ ان کے والد سید مہدی الزماں صاحب علمی ذوق اور شاعرانہ مزاج کے آدمی تھے۔ انھیں لکھنے پڑھنے کا شوق تھا؛ بلکہ عروض پر چند رسالے بھی ان سے یادگار ہیں۔ مسیح الزماں مرحوم نے بھی فارسی انھیں کی نگرانی میں پڑھی، اور اس میں اچھی استعداد پیدا کر لی۔

ان کی دلچسپی کے دو خاص موضوع تھے: ڈراما اور مرثیہ۔ ڈراما کے فن کے مالہ، اور ما علیہ سے خوف واقف تھے۔ یونیورسٹی میں ڈراماٹک ایسوسی ایشن بھی قائم کی تھی، جس کی سرپرستی میں (خود مسیح الزماں صاحب کی نگرانی میں) ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ یہ امر واقع ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی، بلکہ باہر شہر کے حلقوں میں بھی، ڈرامے کو جو فروغ ہوا، اس میں مسیح الزماں مرحوم کی مساعی کو بہت دخل ہے۔

جس ماحول میں ان کی تربیت ہوئی تھی، اس میں تصنیف و تالیف کی چاٹ لگ جانا بالکل قدرتی بات تھی۔ اس پر پیشہ اُردو پڑھانے کا! اعتقاداً چونکہ شیعہ تھے، اس لیے مرثیہ سے شغف بھی فطری بات تھی۔ ان کی پہلی کتاب ”مرثیہ میر“ تھی، جو ۱۹۵۲ء میں چھپی۔ عام خیال تھا کہ میر تقی میر کے مرثیہ مفقود ہو چکے ہیں، مرحوم نے انھیں کو ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بقیہ کتابیں یہ ہیں: (۲) اردو تنقید کی تاریخ؛ جلد اول (۱۹۵۲ء)؛ (۳) تعبیر، تشریح، تنقید (۱۹۵۵ء)؛ یہ بعض مضامین اور منفرق تقریروں کا مجموعہ ہے؛ (۴) ”حرف غزل“ (۱۹۵۷ء)؛ اس

میں اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ اور انیسویں صدی کے مشہور غزل گو یوں کا جائزہ لیا ہے؛ (۵) "امانت کی اندر سبھا" (۱۹۶۲ء)؛ متن کی تصحیح کی گئی ہے، اور ایک مبسوط مقدمے میں، ابتدائی اسٹیج، رہس اور اندر سبھا کی تدوین اور اس کی خوبوں اور غامیوں پر بحث کی ہے؛ (۶) معیار و میزان (۱۹۶۸ء)؛ اردو کے نثری اسالیب پر تبصرہ ہے؛ (۷) اردو مرثیہ کا ارتقا (۱۹۶۸ء)؛ ڈی لٹا کی سنا کا مقالہ؛ (۸) اردو مرثیہ کی روایت (۱۹۶۹ء) یہ گویا اردو مرثیہ کی تین صدیوں کی تاریخ ہے؛ (۹) موازنہ انیس و دیر از شبلی (۱۹۷۰ء) مقدمہ اور حواشی کا اضافہ کیا ہے؛ (۱۰) کلیات مومن (۱۹۷۰ء) مقدمہ اور مومن کے مقام کے تعین کی کوشش؛ (۱۱) کلیات میر: جلد دوم (۱۹۷۱ء)؛ غزلیات کے علاوہ میر کے کلام کی تدوین، اس کے مقدمے میں میر کی شاعری اور اسلوب پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے؛ (۱۲) داغ کی شاعری (ہندی)؛ (۱۳) خورشید (۱۹۷۳ء)؛ پارسی سٹیمپر بمبئی کا پہلا اردو ڈراما جو کسی زمانے میں گجراتی میں چھپا تھا؛ اسی کو حیاتِ نو بخشی ہے۔ انھوں نے دو کتابیں انگریزی سے ترجمہ بھی کی تھیں (۱۴) ٹیلیفون کی کہانی (۱۹۷۰ء)؛ (۱۵) بیاسنہا متحدہ کی مختصر تاریخ (۱۹۷۴ء) کچھ چیزیں غیر مطبوعہ بھی رہ گئیں۔ مختلف مجلات میں مطبوعہ مضامین بھی خاصی تعداد میں ہیں۔

ان کی شادی پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑے۔

حیرت بدایونی، سید حسن

یوپی کے مردم خیز خطے بدایوں میں پیر کے دن ۲۴ اگست ۱۸۹۶ء ۱۵۱۶۱۸ ریح الاول
۱۳۱۴ھ کو پیدا ہوئے۔ دادھیال اور ناخیال دونوں طرف سے حضرت ابو بکر صدیقؓ
کی اولاد میں تھے۔ پشتوں سے ان کے بزرگ حکومت وقت کی ملازمت کرتے آئے
تھے، اور گھر میں علم و فضل کا بھی دور دورہ تھا۔

ان کے جد اعلیٰ قاضی محمد جلیس، بہار اور رنگ زیب میں قوادے عالمگیری کی ترتیب
و تدوین شریک رہے تھے۔ اسی باعث ان کے بعد یہ خاندان ”قاضی زادے“ کے
لقب سے مشہور ہو گیا۔ چنانچہ بدایوں کے جس محلے میں یہ لوگ مقیم تھے، وہ آج
”مک“ قاضی ٹولہ“ کہلاتا ہے۔

ان کے دادا قاضی عظمت علی منصف اور صدیق اعلیٰ کے عہدے پر فائز تھے، زمینداری
بھی تھی۔ غرض دینی عزت اور آرام و آسائش کے تمام وسائل مہیا تھے لیکن
یہ خوشحالی ان کے والد قاضی محمد حسن کے ساتھ ختم ہو گئی۔ انگریزی حکومت کا
زمانہ تھا۔ انہیں کوئی معقول ملازمت ملی نہیں، اور معمولی اور چھوٹی نوکری انہوں
نے اپنے شایان شان نہ خیال کی۔ بیکاری اور مزاج میں ریاست کی ہوا رفتہ
رفتہ ساری املاک بک گئیں، جہاں عیش کے نقارے بجتے تھے، وہاں افلاس
نے چھاؤنی چھالی۔

بدایوں کا ماحول کچھ عجیب دین و دنیا اور شعر و حکمت کے امتزاج کا نام تھا۔

سید حسن کچھ حالات سے مجبور کچھ اپنی افتاد طبع کا تقاضا، ان کی تعلیم کا آغاز بھی عربی اور دینیات سے ہوا۔ اور بالآخر مدرسہ قادریہ اور مدرسہ شمس العلوم سے عربی اور علوم قرآنی میں سند فراغ حاصل کی۔ پھر الہ آباد یونیورسٹی سے منشی فاضل (فارسی) اور مولوی فاضل (عربی) کے اعلیٰ امتحانات امتیاز سے پاس کیے۔

تعلیم جس نہج پر ہوئی تھی، اس میں معلمی کے پیشے کے علاوہ اور کوئی سبیل رہ ہی نہیں گئی تھی۔ چنانچہ اوائل میں چندے انبالہ، بدایون، کانپور کے باقی اسکولوں میں مدرس رہے۔

۱۹۲۲ء میں ہماری سیاسی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ پوری فضا کانگریس اور خلافت کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ نوجوان طبیعتوں میں جوش اور ہیجان تھا۔ جوان سید حسن بھی اس لپیٹ میں آ گئے، جوش و خروش سے میدانِ عمل میں کود پڑے اور جلسوں میں تقریریں کرنے لگے۔ لیکن جب گرفتاری کا وارنٹ کٹ گیا، تو اب عاقبت اسی میں دیکھی کہ انگریزی علاقے سے ہجرت کر جائیں۔ روپوش ہو کر دسمبر ۱۹۲۲ء میں ریاست حیدر آباد دکن پہنچے، جو اس دور میں شمالی ہند کے شرفا کا واحد ملجا و املا تھا۔ مہینا بھر بعد جنوری ۱۹۲۳ء میں ریاست کے قانون کے مطابق حلف نامہ داخل کر کے ملکی صداقت نامہ ریاست کی رعایا ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا۔ انگریزوں نے بھی یہ خیال کر کے کہ چلو، بلا ٹلی، مزید سچپا نہ کیا اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

حیدر آباد میں بھی معلمی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ اولاً چندے مدرسہ آصفیہ میں پڑھتے رہے، بعد کو شاہی خاندان کے نونہالوں کی درسگاہ ”مدرسہ اعزہ“ میں تبادلو ہو گیا۔ یہیں تھے کہ نوجوان نواب کلیانی کے اتالیق مقرر ہو کر پایگاہ پر چلے گئے۔ دو تین برس بعد مہاراجا سرکشن پرشاد پیمین السلطنت سے ملاقات ہوئی، تو ان کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ مہاراجا مرحوم کی مردم شناسی اور اپنے وابستگان کی ترقی پر توجہ ضرب المثل ہے۔ انھوں نے جاگیردار کالج میں ان کی ملازمت کا انتظام کر دیا۔

یہی زمانہ ہے جب حیدر آباد میں ملکی اور غیر ملکی تحریک چلی تھی۔ جب تک مہاراجا ان کی پشت پر تھے، سید حسن کی ملازمت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے استعفا دے دیا، تاکہ کسی کا احسان نہ رہے۔ اس کے بعد چھ مہاراجا ہی کی وساطت سے انہیں محکمہ اوقاف میں جگہ مل گئی۔ ۳۶ برس کی طویل ملازمت کے بعد اسی محکمے سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ عمر بھر کے قیام نے حیدر آباد کو ان کا وطن ثانی بنا دیا تھا۔ اس لیے اب وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اور بدایون واپس نہیں گئے۔

ان کا گھر بھر شاعر تھا۔ داد اعظمت علی ضیا، والد محمد حسن اثر، چچا محمد حسین سحر، بڑے بھائی محمد محسن، محسن تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی سلطان حسن کا تخلص ابر تھا۔ ایسی شعرزدہ فضا سے یہ کیونکر بچ سکتے تھے! غرض بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ پہلے حسن تخلص کیا، بعد کو اسے حیرت سے بدل لیا۔ شعر پر کسی سے اصلاح نہیں لی، جو کہا، خود ہی دیکھ لیا اور حسب ضرورت اس میں ترمیم کر لی۔ اردو اور فارسی دونوں میں کہتے تھے! اردو میں آبینہ (حیدر آباد ۱۹۷۳ء) اور فارسی میں ابریق (حیدر آباد ۱۹۷۴ء) مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔ بچوں کے لیے بھی کچھ چیزیں لکھی تھیں؛ یہ بھی شائع ہو چکی ہیں۔

۱۵ فروری ۱۹۷۵ء ہفتے کے دن نمازِ مغرب کے بعد سوا سات بجے راہی ملک بقا ہوئے۔ اگلے دن (۱۶ فروری) جنازے میں شہر کے تمام طبقات کے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ درگاہِ یوسفین (نام پٹی) کے احاطے میں پائین کی طرف سپرد خاک ہوئے۔ امیر مینائی اور داغ بھی اسی درگاہ میں محو خواب ابدی ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔

۱۹۲۵ء میں ان کی شادی جناب اعجاز حسین فرشوری کی صاحبزادی شکیلہ خاتون سے ہوئی تھی۔ وہ مجددِ تعالیٰ حیات ہیں، اردو فارسی کی اچھی لیاقت کی مالک ہیں اور شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتی ہیں۔

اولاد جسمانی میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑے۔ بیٹوں میں سب سے بڑے مویّد حسن ایم۔ کام، ریجنل لیسرچ لیبارٹری میں آئیں رے کے شعبے کے مدیر ہیں۔ ان سے چھوٹے ڈاکٹر افضل محمد عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ میں ریڈر ہیں۔ اور سنبھلے احمد جلیس ایم، اے، انوار العلوم کالج میں اردو کے لیکچرر۔ سب سے چھوٹے محی الدین حسن حکومت ہند میں ہیں۔ مشہور افسانہ نگار جیلانی بانوان کی بیٹی ہیں۔

کلام بہت پختہ اور بے عیب ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں غلط العام فصیح اور غلط العوام فصیح دونوں کو دھوکا سمجھتا ہوں؛ عام اور عوام میں کوئی فرق نہیں؛ غلطی عوام کی ہو یا خواص کی، وہ غلطی ہی رہیگی اور غلطی ہی کہلائیگی۔ اس لحاظ سے ان کا کلام دیکھا جائے، تو آپ کو اس میں کہیں کوئی سقم نظر نہیں آئیگا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

وہ شباب، وہ جوش، وہ دل نہ رہا؛ وہ تڑپ نہ رہی، وہ مزانہ رہا
تری آنکھ میں قدرِ وفانہ رہی، مرے دل میں مذاقِ جفانہ رہا
تری دھن میں گیا ہوں وہاں کہ جہاں نہ غمِ دل و جاں، نہ غمِ دو جہاں
کوئی دھن تری دھن کے سوانہ رہی، کوئی غم ترے غم کے سوانہ رہا
دل ہی کی زندگی سے ہے دنیا کی زندگی دنیا نہیں رہیگی، اگر دل نہیں رہا
حیرت! وہ میکشی نہ ہوئی، خود کشی ہوئی قابو میں جب زباں نہ رہی، دل نہیں رہا
رنج میں ہنسنا، عیش میں رونا، موت کی شادی، زلیست کا غم
سارے زمانے سے الٹی دنیا، محبت، کیا کہنا!
دورِ شراب و نغمہ و گلشن، ابرِ سیاہ و موسمِ گل
آج کسی کی بزمِ طرب ہے غیرتِ جنت، کیا کہنا!
آج یہ کون انجمن میں جلوہ فرما ہو گیا بزم کا عالم، ابھی کیا تھا، ابھی کیا ہو گیا
میکدہ آباد، ساقی شاد، میکش زندہ باد آج ہم جیسے فقیروں کا بھی پھیرا ہو گیا

غیر دل کی وفا سے تو فراغت ہوئی حاصل
دنیا فریب محض ہے، لیکن مفر نہیں
اپنوں کی جفا کا ہے ابھی بارِ گراں اور
دنیا میں مہنوائی دنیا کیے بغیر
پھر ہوش میں آجائیں جنوں چھوڑ کے حیرت!
اب دل کو نیا روگ لگانے کے نہیں ہم
تم نہیں ہو، تو برسات کس کام کی!
آگ برسا رہے ہیں، یہ پانی کے دن
اپنی سی نہ کی کوئی کمی ہم نے دوا میں
چلتی نہیں انساں کی مگر، حکم خدا میں
ہے رحم کا وعدہ، تو کبھی قہر کی دھمکی
ڈالا مجھے کشمکش بیم و رحبا میں
پیتے ہیں محتسب بھی، اکیلے ہمیں نہیں
لیکن وہ پی کے گھر سے نکلنے کہیں نہیں
منزل وہی قدم ہے جہاں ٹوٹ جاتے دم
سچ پوچھیے تو عشق کی منزل کہیں نہیں

تم پہ میرا کوئی حق بھی نہیں، دعویٰ بھی نہیں
آج تک میں نے اس انداز سے سوچا بھی نہیں
دل ہے نادان کہ کرتا ہے بھروسا تم پر
تم تو تم ہو، مجھے اب دل کا بھروسا بھی نہیں
اب یہ لگتا ہے کہ برسوں کی محبت ہے، مگر
اس سے پہلے تمہیں میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں

تم مہربان تھے، تو سبھی مہربان تھے
خبر سنی جو قفس میں بہار آنے کی
تم مہربان نہیں تو کوئی مہربان نہیں
نظر میں پھر گئی تصویرِ آشیانے کی
شام سے صبح ہو گئی، صبح سے شام ہو گئی
آپ کے انتظار میں عمر تمام ہو گئی
ترکِ بادہ کی باتیں، پاکباز! رہنے دے
بادہ خوار باز آئے ایسے خیر خواہوں سے
دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا
دل تم سے لگا کر یہ دعا مانگ رہا ہوں
انسان کا انسان سے خدا کام نہ ڈالے
موسیٰ کو صدا طور پہ آئی، تو یہ آئی
جاؤ بھی، بڑے آئے ہمیں دیکھنے والے!

موت ہے انسان کا آغا ز بھی، انجام بھی
زندگی در حقیقت موت کی تاخیر ہے

مانا کہ دوسروں سے مخاطب ہیں وہ، مگر ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم سے خطاب ہے
تم نے کیا کر دیا، خدا جانے _____ دل ہمارا رہا، نہ ہم دل کے

دورانِ سفر میں ہیں رہرو، پایاں سفر معلوم نہیں

رہبر کو رخ منزل تو کجا، خود راہگزر معلوم نہیں

یہ چاند کا رنگیں دھوکا ہے، یا سچ مچ نور کا نثر کا ہے

افسوس، ابھی آنا بھی تھیں، مرغانِ سحر معلوم نہیں

طوفانِ فضا میں چھا تو گیا، موجوں میں تلاطم آ تو گیا

اب دیکھیے، ٹکرا جائے کہاں، طربائے کدھر معلوم نہیں

اک ٹپس سی تڑپا جاتی ہے، اک برق سی لہرا جاتی ہے

کیا کہیے کہ سیلے میں زخمی دل ہے کہ جگر، معلوم نہیں

لاریب کہ صلیح صادق کا دنیا میں تو برحق ہے آنا

البتہ ہمارے جیتے جی آئیگی سحر، معلوم نہیں

ہر چند کہ ہو تم ہم سے خفا، اوروں کی طرف رخ ہے بھی تو کیا!

کیا ہم کو تمھاری آنکھوں کی افتادِ نظر معلوم نہیں؟

اٹھتے نہیں دل کی سمت قدم، کرتے ہو طوافِ دیر و حرم

اللہ کے بندو! تم کو بھی اللہ کا گھر معلوم نہیں

مانا کہ افق پہ پہنچو ٹی کرن، دنیا سے چمن بیابان ہوتی

آغازِ سحر معلوم سہی، انجامِ سحر معلوم نہیں

حیرت! اٹھنیں انساں کیوں سمجھا! اب میں وہ پری، اب کیا شکوہ

جب حسنِ جوان ہو جاتا ہے، لگ جاتے ہیں پیر، معلوم نہیں؟

شمس مینری، حافظ شمس الدین احمد

ریاست بہار میں مینر بہت مشہور قصبہ ہے۔ یہ حضرت شرف الدین بھٹی کی سکونت
اور رکھروہیں تدفین کی وجہ سے مینر شریف کہلاتا ہے۔ یہی مینر شمس کے نزرگوں
کا وطن تھا۔ ان کے والد ضمیر الدین صاحب معمولی کاشتکار تھے، محنتی، دیانتدار
خیراترس اور تعلیم یافتہ۔ اسی لیے وہ لوگوں میں مولوی ضمیر الدین کے نام سے
مشہور ہوئے۔ انھیں گاؤں کے زمیندار کے ظلم و ستم سے عاجز آکر ترک وطن
کرنا پڑا۔ اس پر انھوں نے گوالیار میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں انھوں
نے بسا اوقات کے لیے ٹھیکیداری کا کام شروع کیا۔ اور رفتہ رفتہ فن تعمیر
میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ انجینئر کہلانے لگے، اور پھر اسی حیثیت سے ریاست
میں ملازم ہو گئے۔ ان کی بقیہ زندگی گوالیار ہی میں گزری۔ یہاں عزت بھی
حاصل ہوئی، اور روپیہ بھی خوب کمایا، یہ خدا نے ان کی نیک نیتی کا پھل دیا۔
ایک زمانے بعد وطن مالوف واپس آئے۔ اب دیکھیے قسمت کا کرشمہ! وہی
زمیندار جس کی چہرہ دہشتوں سے تنگ آکر انھوں نے ہجرت کی تھی، اپنے
لچھنوں کے طفیل، ان حالوں پہنچ چکا تھا کہ اس کی جا داؤد فروخت ہو رہی
تھی۔ مولوی ضمیر الدین نے یہ جا داؤد خرید لی۔ تاکہ الایام ہند اولہا بین الناس
فرمان الہی ہے۔

شمس الدین احمد ۱۸۹۶ء میں ضلع ٹنہ کے گاؤں بلجھوری، اپنی ناخیاں میں پیدا
۲۱

پیدا ہوئے۔ تعلیمی اور بہت شاندار دور رہا۔ دسویں کا امتحان ۱۹۱۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے درجہ اول میں پاس کیا، اور فارسی میں پوری یونیورسٹی میں اول آئے۔ انٹر کا امتحان بھی پٹنہ کالج کے طالب علم کی حیثیت سے کلکتہ یونیورسٹی سے درجہ اول میں پاس کیا، اور اب کے صوبہ بہار میں اول رہے۔ بی اے کے زمانے میں ان کے والد مولوی ضمیر الدین گوالیار میں مقیم تھے۔ یہ امتحان انھوں نے وکٹوریہ کالج، گوالیار سے، والد آباد یونیورسٹی سے دیا، جس کے ساتھ یہ کالج ملحق تھا؛ انے کالج میں اول آئے اور ریاست گوالیار سے وظیفہ ملا۔ اس زمانے میں مولوی احسن اللہ خان ثاقب وکٹوریہ کالج میں عربی اور فارسی پڑھاتے تھے؛ شمس الدین احمد ان کے چہیتے شاگرد تھے۔ اس کے بعد انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، اور وہاں سے ایم اے (فارسی) کی سند درجہ اول میں حاصل کی، یونیورسٹی بھر میں اول آئے، اور طلائی تمغہ ملا۔ اسی دوران میں قانون کی سند (ایل ایل بی) بھی حاصل کر لی۔

اتنے شاندار تعلیمی دور کے بعد ملازمت میں کیا دشواری پیش آسکتی تھی؛ منظرِ ہد میں گریجویٹ ہاربر میں کالج تھا۔ شمس کا ۱۹۲۱ء میں وہاں اردو فارسی کے مدرس کی اسامی پر تقرر ہو گیا۔ سال بھر بعد از انشا کالج، کنگ (اڈیسہ) میں قانون کی تدریسی مل گئی اور یہ وہاں چلے گئے۔ پانچ برس وہاں رہنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں پٹنہ کالج میں اردو فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ بقیہ زمانہ ملازمت اسی کالج میں بسر ہوا؛ ۱۹۵۱ء میں ان کو اکرام سے دیہی سے سکدش ہوئے۔

ماخذ: پروفیسر سید حسن پٹنہ؛ جناب قسم الحق گیاوی، پٹنہ
 یہ کالج ایک مالدار اور محسن بھومی ہارباؤ سنگٹ سنگھ نے قائم کیا تھا۔ گریسر (Gresser) اس وقت حاکم ضلع تھا جس کا نام انھوں نے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ آزادی کے بعد حکومت وقت نے کالج کا نام صرف بانی سے منسوب کر کے سنگٹ سنگھ کالج رکھ دیا (Gresser College)۔ چنانچہ اس وقت یہی نام ہے۔

ملازمت سے فارغ ہو کر اولاً انھوں نے وکالت شروع کی، لیکن اس میں دل نہیں لگا۔ ساری عمر مدرسے میں گزری تھی، قانون کے ساتھ زیادہ مس بھی نہیں رہا تھا۔ لہذا اس میں کچھ ایسی کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی زمانے میں سینے میں شبینہ کا بوجھ کھل گیا اور یہ تعلیم و تدریس کے لیے وہاں مقرر ہو گئے۔ لیکن اب صحت بہت گر گئی تھی، اور اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ آخر میں اس ٹیٹ کی شکایت ہو گئی۔ اسی عارضے میں ۱۸ فروری ۱۹۷۵ء کو انتقال کیا۔ درگاہ شاہ اڈاں میں دفن ہوئے۔

شعرونی کالج کے زمانے سے شروع کی، اور اس میں اپنے کالج کے استاد شاقب مرحوم کے مشورہ رہا۔ بعد کو جب شاقب کا کلام نظم و نثر ”گوہرین نامہ“ کے عنوان سے چھپا (پکھنٹو ۱۴۱۳ھ)، تو شمس نے اس کے شروع میں اردو میں تقریباً بھی لگان ہے کہ انھوں نے شاقب کے علاوہ اور کسی کو اپنا کلام نہیں دکھایا۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ ”گلپانگ“ کے نام سے چھپ چکا ہے (پٹنہ ۱۹۷۰ء) اس کے علاوہ انھوں نے نظیر اکبر آبادی کا مختصر انتخاب ”اشعارِ نظیر“ کے عنوان سے کیا تھا۔ یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے (الہ آباد)

انھوں نے اپنی زندگی میں تین نکاح کیے۔ پہلی بیوی ان کی خالہ کی صاحبزادی تھیں۔ ان سے دو بیٹے ہوئے۔ ایک لڑکا عین عالم شباب میں بحالت جنون فوت ہو گیا؛ دوسرے حیات ہیں۔ اس بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی کی؛ اس کی اولاد موجود ہے۔ تیسری بیوی کی اولاد بھی ماشاء اللہ خوش و خرم موجود ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں:

اللہ! یہ صنم کدہ کیسا بنا دیا! اس خاکراں کو حسن کی دنیا بنا دیا
صد جلوہ آئے بوقلموں سے جہان کو آشوب گاہِ طور تجلی بنا دیا
دشتِ وحشت میں دہ اب پہلی سی زلف ہی نہیں

موت نے مجنوں کی، دیرانے کو دیراں کر دیا

کیا بسکہ وشی ہوئی شمس! میری عشق میں

جان دی اللہ کو، دل نذر جاناں کر دیا

خزاں سے پامال ہو رہا ہے، جن جو تھا اپنی آرزو کا

جو گل بظاہر شکستہ ہیں بھی، نہیں ہے نام ان میں لگد بوکا

بھلا کر دے بھلا لیگا، بُرا کر دے، بُرا لیگا

اسی نے کاٹا ہے جس نے بویا، اسی نے چاٹا ہے جس نے تھوکا

اللہ ان کی یاد اب اتنی سی رہ گئی۔ گویا کبھی ملے تھے کسی میںہاں سے ہم

منزل بھی ایک، راہ بھی ایک، اختلاف کیو؟ بس یہ کہڑھ گئے ہیں ذرا کا دال سے ہم

کبھی ہم سے قول و قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی چاہ تھی، کبھی پیار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی وقت گرمی خوں بھی تھا، کبھی عہد زورِ جنوں بھی تھا

کبھی خوش عہد بہار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی جنگلوں میں قرار تھا، کبھی شغلِ سیر و شرکا تھا

یہیں لطفِ لیل و نہار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تھے بہت تمہارے بھی مری دم امتحانِ ریا کوئی

یہی ایک شمس نزار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بہت کم ہیں جمالِ روئے یلی دیکھنے والے زیادہ ہیں فقط محل کا پردہ دیکھنے والے

نہ چل اوست جام کا مرانی اس قدر تن کے

بہت دیکھی ہیں تقدیریں بگڑتی ہم نے بن بن کے

مزا ہے آپ روٹھیں اور منائیں مٹتوں سے ہم

قیامت ہے، مگر پھر روٹھ جانا آپ کا من کے

کوئی چھٹیا پڑے تو شمس جنگل کو کل جائیں

مشالِ داغ ہم بھی منتظرِ میٹھے ہیں ساون کے

ہونٹوں پہ تسم کیوں کا، گالوں میں لالی پھولوں کی
 کچھ پھول اذھر بھی دیتی جا، اویجنے والی پھولوں کی!
 پھاگن کی ہوا میں چلتی ہیں، شاخوں میں کلیاں کھلتی ہیں
 اس فصل میں جو بن دکھلاتی ہے ڈالی ڈالی پھولوں کی

گنوں کے اندھیرے میں روشن پھولوں کے دیے کڑانے میں
 باغوں میں منائی فطرت نے کیا خوب دوالی پھولوں کی
 اپنے بیگانے ہوئے، اے جانِ جاں تیرے لیے
 بن گئے دشمن زمین و آسمان تیرے لیے
 ساتھیوں نے ساتھ چھوڑا، دوستوں نے دوستی

ہو گئے اپنے پرالیے بدگماں تیرے لیے
 کیسے ہم بیفکر تھے جب تک نہ تھا تیرا خیال
 ایک آفت ہم پہ آئی ناگہاں تیرے لیے
 سختیاں ساری سہیں تیرے لیے، اے دلربا!

کھوئے سب آرام، اے آرامِ جاں تیرے لیے
 جان تک اس نے لگا دی چاہ کی بازی میں
 کچھ نہ دیکھا شمس نے سود و زیاں تیرے لیے

یاد سے دُور بد و نظر نہ ہوئی لاکھ جا ہا کہ ہو، مگر نہ ہوئی
 شبِ فرقت گری جاے گی کون سی شب ہے، جو سحر نہ ہوئی؟
 وہ طلب کیا، جو در پہ ٹھہر گئی! وہ نظر کیا، جو پردہ در نہ ہوئی؟
 وہ دے دے جس کے تیرے آتشِ شوق تیرے نہ ہوئی

چاندنی کھل رہی ہے صحرا میں
 شمسِ وحشی کو کیا خبر نہ ہوئی!

اعجاز حسین، ڈاکٹر سید

ان کے والد کا نام سید محمد شفیع تھا۔ وہ پولیس میں ملازم تھے۔ آدمی شریف اور مسکین طبع تھے لیکن تعلیم زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے کوئی ترقی نہ کر سکے۔ ان کے خسر سید حسین امیر اور رئیس آدمی تھے۔ الہ آباد کے مضافات کے محلہ راجا پور میں خاصی جاداد کے مالک تھے۔ ان کے صرف چار بیٹیاں تھیں، زینہ اولاد نہیں تھی۔ اسی لیے انھوں نے بیٹیوں کی شادیاں شریف، لیکن غریب نوجوانوں سے کیں اور سب کو خانہ داماد کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ سید اعجاز حسین کی ولادت اپنی نا اہلیاں میں ہوئی۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ سال کا یقین نہیں، ۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۹ء تھا، لیکن مہینہ یقیناً اگست کا تھا، اور جمعہ کا دن، وقت صبح صادق تھا۔ بعد کو انھوں نے یوم آزادی کی مناسبت سے اسے ۱۵ اگست بنالیا تھا؛ ظاہر ہے، کہ یہ فرضی تاریخ ہے۔ اور لطیفہ یہ ہے کہ ۱۵ اگست ۱۸۹۸ء کو جمعہ تھا، نہ ۱۵ اگست ۱۸۹۹ء کو۔

سید حسین اپنے زمانے کے رئیسوں کی جملہ خوبیوں اور خامیوں سے متصف تھے۔ شر بھی کہتے تھے۔ فوق تختلص کرتے تھے۔ بیک واسطہ ان کا سلسلہ تلمذ آتش سے ملتا ہے۔ وہ فارسی اور عربی کے دلدادہ تھے؛ اور انگریزی کے مخالف کسی

قسم کا کام کاج کرنا دون مرتبہ سمجھتے تھے۔ آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا اندوختے سے سب شوقی پورے ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح تو فارون کا خزانہ بھی ساتھ نہیں دے سکتا۔ نتیجہ وہی ہوا، جس کی کوئی بھی عقلمند پیشگوئی کر سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ حالت انہی کمزور ہو گئی کہ گھر کا اُجلا خرچ تک چلانا دوسرے ہو گیا۔ کہاں کبھی روپے کی وہ ریل پیل تھی، اور کہاں اب آمدنی گھٹنے گھٹتے ۲۰-۲۵ روپے ماہانہ رہ گئی۔

سیار اعجاز حسین کی تعلیمی رفتار بہت سُست رہی۔ گھر کے ماحول کے باعث انھیں اردو اور فارسی شعر سے تو ضرور دلچسپی پیدا ہو گئی، بلکہ جلد ہی خود بھی تنگ بندی کرنے لگے، لیکن ریاضی اور اقلیدس سے ان کی جان جاتی تھی؛ اور دسویں درجے کی سند کے امتحان کے لیے یہ لازمی مضمون تھے۔ چنانچہ دو مرتبہ کامی کے بعد انھوں نے کلکتہ کی راہ لی، جہاں یونیورسٹی میں ریاضیات کا معیار نسبتاً کم تھا اور اسی لیے یہاں سے وہ ۱۹۱۹ء میں دسویں درجے کی سند لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت عمر عزیز ۲۰ برس سے متجاوز ہو چکی تھی۔

اس کے بعد انھوں نے میونسٹرل کالج، الہ آباد میں داخلہ لے لیا۔ انٹر میں بھی ایک مرتبہ فیل ہوئے؛ لیکن لگے رہے۔ آخر کار مسلم یونیورسٹی سے انٹر اور ۱۹۲۲ء میں میونسٹرل کالج سے بی اے کی سند لی۔ اسی دوران میں انگریزوں کو اردو پڑھاتے اور اپنے خرچ کی کفالت کرتے رہے۔ چونکہ اب سرکاری ملازمت کے لیے عمر زیادہ ہو چکی تھی، اس لیے انھوں نے یونیورسٹی میں ایم اے (اردو) میں داخلہ لے لیا۔ اور ۱۹۲۸ء میں اس شان سے یہ امتحان پاس کیا کہ اول درجے میں یونیورسٹی بھر میں اول آئے۔ اور سو روپے ماہانہ کالسیرچ اسکالرشپ بھی ملا۔ جس سے مستقل آمدنی کی صورت پیدا ہو گئی اور تشویش کچھ کم ہوئی۔ پھر جب ۱۹۲۹ء میں وہیں اردو کے مدرس کی جگہ نکلی، تو اس پر ان کا تقرر ہو گیا۔

اب یہ ہر طرح مطمئن اور پرسکون زندگی گزارنے کی شاہراہ پر کھڑے تھے۔ اس میں اگر

افسوس کا کوئی پہلو تھا، تو یہ کہ ان کے وہ نانا (سید حسین) جنہوں نے انہیں پالا پوسا پروان چڑھایا، پڑھایا لکھایا، ان کے آرام کی خاطر خود ہر طرح کی تکلیفیں جھیلیں، ان کے ملازم ہونے (۱ اگست ۱۹۲۹ء) سے پانچ مہینے پہلے (۲۱ مارچ ۱۹۲۹ء) رحلت فرما چکے تھے۔ انہیں اپنے چہیتے نواسے کی کامیابی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

سید سجاد ظہیر مرحوم (ف: ستمبر ۱۹۷۳ء) نے اپنے بعض ہنجیال احباب کے تعاون سے ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی تھی۔ انہوں نے اس کے قیام اور اور استحکام کے لیے ملک کا دورہ کیا اور جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم کیں۔ ۱۹۳۸ء میں انہوں نے الہ آباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اسی زمانے میں ان کے بعض اور ادیب دوست بھی یہیں مقیم تھے۔ ان میں ڈاکٹر زیڈ، اے احمد (زمین العابدین احمد) موجودہ رکن راجیہ سبھا، کنور محمد اشرف اور پروفیسر احمد علی کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ اس اجتماع کا نتیجہ یہ نکلا کہ الہ آباد میں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم ہو گئی۔ جلسے ہونے لگے، جہاں بحث مباحثے ہوتے، ادبیوں شہر کے ادبی حلقوں میں گویا زندگی کی تازہ لہر دوڑ گئی سید اعجاز حسین بھی اسی بھنور میں پہنچ گئے، بلکہ انجمن کے سکتر بنا دیے گئے۔ ان کی کتاب ”نئے ادبی رجحانات“ اسی ماحول میں لکھی گئی تھی۔

۱۹۲۸ء میں ایم اے کی سند لینے کے بعد انہوں نے پی ایچ ڈی کے لیے لیٹریچ میں داخلہ لے لیا تھا۔ موضوع مقالہ تھا: ”اردو شاعری پر تصوف کا اثر“ لیکن خدا معلوم کیوں، مقالہ پیش نہیں کیا۔ بہر حال وہ ڈاکٹریٹ کی سند کے بغیر ہی کام کرتے رہے۔ دس بارہ برس بعد انہوں نے ڈی لٹ کی سند لینے کی کٹھانی اور مقالہ بعنوان ”مذہب و شاعری“ تیار کیا، ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اردو موضوع پر ڈی لٹ کی سند لینے والے وہ پہلے شخص تھے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر ۱۹۲۹ء میں آئے تھے۔ وہ مدتوں

اسی عہدے پر رہے، پھر ریڈر مقرر ہوئے اور بالآخر پانچ چھ برس پروفیسر رہنے کے بعد یکم مئی ۱۹۶۱ء کو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے انھیں پانسور و پیہ ہینیا کا تحقیقی وظیفہ عطا ہوا۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر، اسی وظیفے کا قیمتی نتیجہ ہے۔

اگرچہ صحت عام طور پر اچھی رہی، لیکن عمر کے ساتھ ضعف قواء قدرتی عمل ہے، جس سے مفر نہیں۔ ۱۸ فروری ۱۹۷۵ء کو ایک طالب علم کے پی ایچ، ڈی کے امتحان کے سلسلے میں منظر پر (بہار) گئے تھے، وہیں دل کا شدید دورہ پڑا۔ علاج معالجہ ہوا، لیکن بیسودہ یوں اپنے اعزہ اور خاندان سے دور پریس میں اتوار ۲۳ فروری ۱۹۷۵ء کو جان بحق ہو گئے۔ لاش الہ آباد آئی اور اشوک نگر کے نواح میں سرستی گھاٹ کے قریب، اپنے ناٹھیاں قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں: (۱) آئینہ معرفت؛ (۲) مختصر تاریخ ادب اردو؛ (۳) نئے ادبی رجحانات (۱۹۴۲ء)؛ (۴) مذہب و شاعری؛ (۵) ملک ادب کے شاہزادے؛ (۶) اردو ادب آزادی کے بعد؛ (۷) ادب و ادیب؛ (۸) حیات سیدنا حضرت سید طاہر سیف الدین مرحوم؛ (۹) ادبی ڈرائے؛ (۱۰) میری دنیا (۱۹۶۵ء)؛ (۱۱) اردو شاعری کا سماجی پس منظر وغیرہ۔ ان کے علاوہ کچھ کتابیں ہندی میں بھی ہیں۔

وہ ابھی طالب علم تھے، جب ان کے نانڈے انھیں روز افزوں آوارگی اور تماشہ بینی سے بچانے کی خاطر ۱۹۲۲ء میں ان کی شادی کر دی تھی۔ ان سے آٹھ بچے ہوئے: پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں۔ بچہ تعالیٰ سب خوش و خرم ہیں۔

جیسا کہ لکھ چکا ہوں، ان کے نانا مرحوم شعر کہتے تھے۔ گھر پر کتابوں کا معقول ذخیرہ تھا۔ آغاز میں ماحول بھی رنگین اور شعر انگیز تھا۔ اسی لیے وہ بہت اوائل عمر میں شعر کہنے لگے، تخلص اعجاز تھا۔ بہت دن تک نانا آباہی سے اصلاح لی، لیکن جب وہ بصارت سے محروم ہو گئے، تو انھوں نے اپنے میونسٹرل کالج کے

اسٹنٹ پروفیسر (عربی و فارسی) شیخ مہدی حسن ناصری کا دامن ستھاما۔ ان کی ادبی تربیت میں شیخ صاحب موصوف کا بہت ہاتھ تھا۔ دیوان آج تک شائع نہیں ہوا۔ بطور نمونہ چند شعر ملاحظہ ہوں، جو ان کی بیاض سے حاصل کیے گئے ہیں۔

جذبِ دل نے لشتِ غم کو رگِ جاں کر دیا
درد کو اس طرح اپنا یا کہ درماں کر دیا
پیکرِ مستی میں اک دھبہ سا تھا میرا وجود
فوقِ بینابی کے صدقے جس نے انساں کر دیا
موجِ غم سے داد کیا ملتی، دلِ برباد کی
میں نے خود، اعجاز! ہر قطرے کو طوفاں کر دیا

سفرِ حیات بھی ختم ہے، کہیں زندگی کا نشان نہیں
ابھی اور ختم کے میں دیکھتا، میرے بس ہیں عمر و مال نہیں
میرے دل کی ہیں یہ کہانیاں جو بھر گئی ہیں یہاں وہاں
یہ چین میں لالہ و گل نہیں، یہ فلک پہ کہکشاں نہیں
نہ وہ تنگدہ میں کہیں ملا، نہ حرم میں اس کا پتا چلا
یہ اب اعترافِ شکست ہے، یہ جرس نہیں، یہ اڑاں نہیں
دل و جاں کے بدلے میں کیا ملا، یہ سوال اہلِ ہوس سے کر
کہ میرا عشق عالمِ کیف ہے، یہ دیارِ سود و زیاں نہیں
میرے ٹوٹے دل کو نہ دیکھیے کہ یہ بگتے بگتے بنا ہے دل
میری عمر بھر کا ریاض ہے جو یہ آشناے فغاں نہیں

خدا ہی جانے، اب اس دل کا حال کیا ہوگا
کہ اس غریب کو مرنے کی بھی خوشی نہ رہی

بہا کیسی، کہاں کی خزاں، خدا جانے
 خیالِ دید میں کچھ فکر نہ نہ گی نہ رہی
 ہمیں سجد ملا تک نے یوں کیا برباد
 کہ بزمِ خاص میں کچھ قدر بندگی نہ رہی
 غمِ دوراں پہنچ آ یا غمِ جاناں کے قریب
 آخر آ ہی کیا ہاں لہ مہِ تاباں کے قریب
 یہ تیری یاد ہے، یا دردِ محبت کی خلش
 اک کسک ہوتی ہے رہ رہ کے رگِ جاںِ قریب
 اب جیواں نے کیا، ذوقِ فنا سے محروم
 ورنہ یہ خضر بھی ہوتے کہیں انساں کے قریب
 ابھی ہے زخم کا احساس، فکرِ مرہم ہے
 ہنوز منزلِ اول ہے، غم فقط غم ہے
 متاعِ غم بھی نہ لٹ جائے اس اندھیرے میں
 چراغِ راہِ محبت میں روشنی کم ہے
 نہ کوئی ربط، نہ ترتیب، بزمِ انجم کی
 مگر غزل کی طرح دلکش و منظم ہے
 نہ مل سکا، نہ ملیگا کسی کو روزِ ابد
 مگر صحیفۂ عالم کا اک ورق کم ہے
 خللِ دماغ کا ہو یا سکونِ دل، اعجاز!
 یہ عشق جو بھی ہو، وجہِ قیامِ عالم ہے

• نگاہوں کا ملنا تو پلِ سبھ سے کم سمجھا
 وہ مدت مگر جاوداں ہو گئی ہے

کمند زین تابیہ افلاک — پہنچی
 بلندی کی لپٹی عیاں ہو گئی ہے
 ہمہ نامرادی، ہمسہ زندگی
 محبت بھی اک داستان ہو گئی ہے

اپنی بیگم کی زینات پر جو مرثیہ کہا تھا، اس کا پہلا بند ہے :

یا دایا بے کہ جب سوداے بیش و کم نہ سٹھا
 وامن عہد جوانی آنسوؤں سے نم نہ سٹھا
 عالم شعر و شباب و مجمع احباب میں
 زندگی کا راستہ سیدھا سٹھا، پیچ و خم نہ سٹھا
 ذہن کی تکمیل ان ہاتھوں میں تھی، جن کے لیے
 کاسۂ علم و ہنر بھی جامِ جم سے کم نہ سٹھا
 گردشِ ایام کی اس چلیچلاتی دھوپ میں
 کاروانِ شوق لطفِ اندوز تھا، برہم نہ سٹھا
 تلخیِ حالات بن جاتی تھی، پیغامِ حیات
 راہ کا پتھر عصاے موسوی سے کم نہ سٹھا
 اس فضاے جانفزا میں ایک تبدیلی ہوتی
 چادرِ یکسانیت پر چڑھ گیا رنگِ دوتی

شفقت کاظمی، سید فضل الحسن

یہ خاندان اہل تشیع کے امام ثامن حضرت امام رضا علیہ السلام کا نام لیوا تھا۔ جب ۱۲۴۳ھ میں ۶۸۱ھ میں امام رضا کا انتقال ہو گیا، تو ان کے خلاف عراق سے نکل کھڑے ہوئے جسے جہاں جگہ ملی، اس نے وہاں پناہ لی۔ شفقت کے اسلاف بھی کابل، غزنی سے ہوتے ہوئے آکر شمال مغربی سرحدی صوبے میں بس گئے۔ یہاں ان کا قیام مدتوں مختلف مقامات پر رہا۔ ایک زمانہ بعد پھر ایک شاخ نے وہاں سے بھی نقل مکان کیا، اور آکر ڈیرہ غازی خان (قدیم) میں رخت سفر کھول دیا۔

جناب فضل الحسن شفقت نے اپنے نام کے ساتھ کاظمی کی نسبت حضرت امام رضا کے والد حضرت موسیٰ کاظم (امام ہفتم) کے باعث اضافہ کی تھی۔ بلکہ وہ کاظمی بھی کبھی بطور تخلص بھی استعمال کرتے رہے۔ ۱۳۵۵ھ فروری ۱۹۱۲ء کو ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید علی تھا۔ سید جزو علم ہے، وہ پولیس میں ملازم تھے اور آخر تک ہی محکمے سے منسلک رہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ بہت کم لوگوں کو معلوم

ہے قدیم اس لیے کہ موجودہ شہر نیا ہے۔ پرانا شہر دریائے سندھ کے ۱۹۰۸ء کے سیلاب عظیم کی نذر ہو گیا۔ یہ شہر اس کے بعد وجود میں آیا۔ پرانے شہر کی نشانی چھاؤنی رہ گئی تھی، دریائے رخ سے اندیشہ ہے کہ یہ بھی اب کچھ ہی دن کی جہان ہے۔

تھا کہ وہ پولیس میں ہیں۔ گھر سے اپنے روزمرہ کے معمولی کپڑوں میں سٹھانے جاتے اور وہاں پہنچ کر وردی پہن لیتے۔ کام کے بعد اسے وہیں چھوڑ آتے اور اپنے ذاتی لباس میں مکان پر آ جلتے۔ فیکر منٹش اور مرخان مریخ آدمی تھے۔ محرم کی مجلسوں میں بڑے ذوق و شوق سے شرکت کرتے، اور بعض اوقات اس کے لیے خاصی لمبی مسافت طے کر کے جاتے۔ ۱۹۴۵ء میں انتقال ہوا۔ اور کربلا سے قبرستان ٹالھی والا ڈیرہ غازی خان میں دفن ہوئے۔

شفقت صاحب نے سوچیں درجہ تک تعلیم پائی۔ اسکول میں جو کچھ پڑھا، وہ اپنی جگہ، لیکن اس کے علاوہ انھوں نے ذاتی طور پر اردو اور فارسی ادب کا اور اس میں بھی شعر کا مطالعہ خاص طور پر کیا۔ انھیں بیشتر شعریاد تھے، جن سے نہ صرف شعر گوئی میں مدد ملی، بلکہ وہ علمی اور ادبی مجلسوں کی بھی گویا جان بن گئے۔

ان کی کتابیں پر کسی اچھی ملازمت کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ بارے، گھر میں قناعت اور نوکل کا ماحول تھا۔ والد کی پنشن ۱۲-۱۳ روپے مہینہ تھی۔ ان کی والدہ کڑھائی کا کام بہت اچھا جانتی تھیں۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں کپڑے کڑھائی کے لیے دیتی رہتی تھیں۔ اس طرح بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ بہر حال تنگ دستی کا زمانہ تھا۔ اب شفقت نے مقامی ایئر سٹرل اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اور وہاں بڑھتی کام کا خاص کر فریج بننا اسے کھلایا اور اس طرح چینیے میں پندرہ بیس روپے کی یافت کا سامان ہو گیا۔

اسی زمانے میں وہ مرگی کے موزی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ مڈنوں اس کے دورے پڑتے رہے۔ مہر آزا دوا دوش سے کوئی بارہ برس بعد اس سے چھٹکارا ملا۔ لیکن اس کا اثر زبان کی خفیف سی لکنت کی شکل میں آخر تک رہا۔ وہ "ر" اور "ڑ" ٹھیک طرح سے نہیں ادا کر سکتے تھے۔

اب وہ مقامی میونسپل کمیٹی میں چیرا سی مقرر ہو گئے۔ سب افسران کے کام سے بہت مطمئن تھے۔ چونکہ یہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لیے انھیں ترقی دے کر محضرہ چنگی

بنادیا گیا۔ جب ملک تقسیم ہوا ہے تو اس کے بعد وہ ریکارڈ کیپر مقرر ہو گئے اور اسی جگہ سے سبکدوش ہوئے۔ اپنی معمولی تنخواہ کے علاوہ انھیں کمیٹی کے تمام اجلاسوں کی کارروائی قلمبند کرنے کا خاص وظیفہ نہیں روپے مہینہ الگ ملتا تھا۔ تنخواہ کے ساتھ اسے ملا کر شنگی ترشی سے بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ آخری ایام میں انھیں ایک افسوسناک تجربہ ہوا۔ کمیٹی کے نئے منتظم ایک ایسے شخص مقرر ہو کر آئے، جو ان سے کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ انھوں نے جاوید بچا انھیں دق کرنا شروع کیا۔ بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکی ان کا معمولی وظیرہ ہو گیا، اور بالآخر اس شخص نے ان کی تنخواہ میں سالانہ اضافہ بند کر دیا۔ شفقت نے محسوس کر لیا کہ اب خودداری کا خون کیے بغیر یہاں رہنا ممکن نہیں۔ اس پر انھوں نے مقررہ میعاد سے تین سال قبل پنشن کی درخواست دے دی اور نوکری سے الگ ہو گئے۔

شفقت نے شعر گوئی بعمر ۱۸ سال ۱۹۳۳ء میں شروع کی۔ ابتدائی مشتق کے بعد انھوں نے مولانا حسرت موہانی (ف: مئی ۱۹۵۱ء) سے درخواست کی کہ انھیں شاعر کی میں قبول کر لیں۔ بچانے کیوں، انھوں نے یہ درخواست منظور نہ کی۔ اس پر انھوں نے پہلے فیض احمد ندیم جعفری سے رجوع کیا۔ ندیم ڈیرہ غازی خان ہی کے رہنے والے ہیں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ عمر بھر کوآپریشن ٹھکے میں ملازم رہے۔ افسر صدیقی امرہوی کے شاگرد ہیں۔ ایک مجموعہ کلام ”خانہ زنجیر“ شائع ہو چکا ہے۔ بقیہ حیات ہیں۔

شفقت نے ندیم کے علاوہ صادق ایوبی (حاجی محمد) سے بھی مشورہ کیا تھا۔ صادق ۱۹۰۸ء میں ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ شعر خاصا کہہ لیتے تھے۔ لیکن ان کا اصلی کام افسانے کے میدان میں ہے۔ انھوں نے انگریزی سے یورپ کی مختلف زبانوں کے بلامبالغہ بیسیوں افسانوں پر ترجمہ کیا۔ میان بشیر احمد (مدیر ہمایوں) ان کے بڑے قدردان تھے، چنانچہ صادق کے دونوں افسانے ہمایوں میں شائع ہوئے۔ معلوم نہیں کیوں، انھوں نے ۱۹۳۲ء میں ادبی میدان ترک کر دیا۔ اور خزانہ

نویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ قانون کی پیچیدگیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اس پیشے میں بہت کمایا اور خوشحال زندگی بسر کی۔ ۱۹۷۳ء میں انتقال ہوا۔ شفقت نے چار برس کی مشق کے بعد ۱۹۴۰ء میں دوبارہ حسرت سے اصلاح کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے اکھیں کامیابی ہوئی، اور حسرت نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ حسرت کی وفات تک وہ ان سے مشورہ کرتے رہے، اس کے بعد ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ ”خاک پائے حسرت موہانی“ لکھتے رہے۔

شفقت شروع میں نظم اور غزل دونوں کہتے تھے۔ لیکن حسرت کی شاگردی کے بعد غزل کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔ ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ بالکل ابتدائی کلام ان کے دوستوں نے ”نغمہ ناسیہ“ کے نام سے چھاپا تھا۔ یہ نو دیکھنے کو نہیں ملا۔ بعد کے مجموعے، حسرتکدہ (منظر گر ٹھہ ۱۹۵۸ء)؛ نغمہ حسرت (منظر گر ٹھہ ۱۹۵۹ء)؛ داغ حسرت (لاہور ۱۹۷۰ء)؛ زخم حسرت ملتے ہیں۔ بہت پختہ کلام ہے۔ غزل کی تمام خصوصیات ان کے کلام میں بدرجہ وافر ملتی ہیں۔

ابتدائی عسیر الحالی کے باعث صحت ہمیشہ خراب رہی۔ ۱۹۴۱ء/۱۹۴۲ء میں ذیابیطس کا گھلا دینے والا عارضہ لاحق ہو گیا اور آخر تک وبالِ جاں رہا۔ جون ۱۹۴۳ء میں دل کے مرغن میں مبتلا ہو گئے۔ جیسے یہ تمام عوارض کافی نہ ہوں، اواخر ۱۹۷۳ء میں جسم کے بائیں حصے کو فالج نے بیکار کر دیا اور وہ مستقلاً صاحبِ فراش ہو گئے۔ حکومت نے توجہ کی اور اکھیں علاج کے لیے مقامی اسپتال میں لے گئے۔ وہیں ۱۹۷۵ء کو فالج کا دہنی طرف حملہ ہوا، جس سے یہ ہوش ہو گئے۔ اسی حالتِ غشی میں ۱۲ مارچ ۱۹۷۵ء کو ظہر کے وقت روحِ قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ چونکہ یہ ۲۸ رجب تھی، اس لیے اسے مبارک خیال کرتے ہوئے اسی شام اکھیں اپنے والد کے جوار میں (کربلائے معلیٰ والا میں) سپردِ خاک کر دیا گیا۔

کئی اصحاب نے قطعاتِ تاریخ کہے۔ سید فدا بخاری نے ”مرگِ دلخراش“ سے تاریخ نکالی (۱۳۹۵ھ) عیسوی تاریخ میں سید چراغ علی شاہ آزاد نے یہ قطعہ

لکھا :-

توڑی گردوں نے ہم پہ یہ کیا جفا، ہاے !
 اٹھ گئی رسمِ اخلاصِ دل زملے سے
 سینہ اپنا ہے، اور ترکشِ قضا، ہاے !
 بھو گئی شمعِ غمخانا و فَا، ہاے !
 نغزگو، نکتہ سنج و سخن سرا، ہاے !
 پیرِ سدا خود کو سمجھا وہ خاکِ پا، ہاے !
 شاعرِ بے بدل، قادرِ کلامِ ادیب
 تاجدارِ غزل، محفلِ شبیوہِ حسرت

فکرِ تاریخ پر آئی یہ ندا، آزاد !

”سید شفیقت کاظمی چلا، ہاے“ (۱۹۷۵ء)

شفقت کی شادی اپنے چچا سید جند و شاہ کی بیٹی سکینہ بی بی سے ہوئی تھی سید
 جند و شاہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ مٹوں حکومت کی ملازمت کی۔ اس سے
 سبکدوش ہوئے، تو اپنا مطلب جاری کر لیا۔ اس سے اچھی خاصی آمدنی تھی۔ آرام و
 آسائش کی زندگی گزاری۔ شفقت کی جسمانی اولاد صرف ایک لڑکا نجیب الحسن
 رضوی ان سے یادگار ہے۔ انھوں نے بی، اسے تک تعلیم پائی ہے۔

کافی ہے اپنے رفعِ ترو د کے واسطے

ان کی نہیں بھی عرضِ وفا کے جواب میں

بیزار ہو سکے نہ تری آرزو سے ہم

سختی شانِ اغنا جو ترے اجتناب میں

دلچسپیاں بہت دلِ مرحوم ! تجھ سے سختیں

جب تو نہیں، تو رونقِ بزمِ جہل نہیں

تجھ سے بچھڑ کے، سب کی نظر میں ذلیل ہیں

تو مہرباں نہیں، تو کوئی مہرباں نہیں

مقتدر میں لکھی سختی با ہم جدائی نہ تم بیوفا ہو، نہ ہم بیوفا ہیں

بسر ہو ہی گئے دنِ زندگی کے تجھے کیا، شاد یا ناشاد تھے ہم

اسباب اور بھی مری بربادیوں کے تھے
 کیا جانے کیوں زباں پہ ترانام آگیا
 بات جب بڑھ گئی تو کیا کرتے ہم کو یارائے اختصار نہ تھا
 بڑے مزے میں گزرتی تھی زندگی شفقت!
 خوشا وہ عہد کہ ان سے نہ تھی شناسائی
 سرگزشت حیات کیا کہیے! خیر، اچھی بُری گزر بھی گئی
 بات اپنی وفا کی جھوٹ نکلی آخر میں تری جفا سے ہارا
 بکول روئیں وہ تری دشمنی کو جن کو تری دوستی نے مارا
 کچھ اور بھی اُسے تھے لیکن جب وقت پڑا، تجھے پکارا
 تری نگاہ تو اکٹھی تھی بے سبب مجھ پر یہ اور بات ہے کہ مجھ کو فریب کھانا تھا
 ایفلے عہد کرنے سکے وہ، تو کیا ہوا
 خود اپنی زندگی کو بھی مٹا تھا ثبات
 باغ پر اپنا بھی کچھ حق تھا، مگر باغ میں جب تک نہ آئی تھی بہار
 خوش ہو کے سہم رہا ہوں تری ہر جفا ہنوز
 ثابت نہیں اگرچہ کچھ اپنی خطا ہنوز
 وہ ایک درد جس نے بنا دی ہے جان پر
 وہ ایک درد جان سے پیار ہے آج تک
 گزری ہے نفس میں عمر لیکن سمجھ لے نہیں یادِ اشیاں ہم
 کچھ بس نہ چلا تری جفا پر دیکھا کیے سوئے آسماں ہم
 اپنی قسمت تھا داغ رسوائی کیا کریں اب تجھے پشیمان ہم!
 سب کا مقصود ذکر تھا تیرا جتنے فقے تجھے سنائے ہیں
 کیا ختم سفر پہ یاد کرتے گزریں جو مصیبتیں سفر میں
 ہر اسے بے نیاز ہو کر لوٹ آئے ہیں تیری رہگزر میں

ظلم و عاتیلگی، کہاں تک دنیا! کہیں اپنا بھی خدا ہے کہ نہیں؟
جن کو تیری نگاہ بھول گئی اب کوئی ان کو پوچھتا بھی نہیں

تھکا دیا ہے زمانے کی گردشوں نے بہت
تیری گلی میں اجازت ملے، تو دم لے لوں
زمانہ دیکھ چکا ہے مری دفا کا مال
کسی پہ اب نہ چلیگا تیری نظر کا فصول

جب سزاوار غم بھی نہ سمجھے گئے ہم کریں اور امید کیا آپ سے!
آج حیراں ہیں یوں، آپ سے مل کے ہم جیسے اب انک نہ تھے آشنا آپ سے
اس زباں سے ترا گلا کیوں ہوا جس زباں سے تیری ثنا کی ہو
رد و صحو کے یہ سال بھی گزرا اب کے بھی پھرے نہ دن ہمارے
خود ہی ان تک جا پہنچے ہم قاصد سے کچھ کہتے کہتے

تیری ادائے کرم، لاکھ و لفریب سا ہی
مگر وہ دل جو تیری بے رخی پہ مرتا ہے
جب اٹھ کے آگئے ہیں، ثواب اس سے کیا غرض
ہم بھی کبھی تھے آپ کی محفل میں، یا نہ تھے
کیا کیا ہوا ہے ترکِ محبت پہ انفعال
آئی ہے تیری یاد جو سچرنا گہاں مجھ
جیلے کی ہوس وہ کیا کریگا مرنے کو بھی جو ترس رہا ہے

جفائے خاص کے لائق مجھی کو ٹھیرایا
اب اور اس کے سوا کیا کرے دفا کوئی!
کسے خبر کہ حدیثِ جہاں کے پردے میں
خود اپنے غم کا فسانہ سنا گیا کوئی

ایسے نکلے تری انجن سے کہ ہم عمر سب کے لیے بے ٹھکانا ہوتے
 جو رِیجا کے لائق تو سمجھا ہمیں
 اتنی امید بھی تھی کہاں آپ سے
 یاد کرنے پہ بھی یاد آتا نہیں
 کس گھڑی ہم ملے تھے کہاں آپ سے
 ان کا خیال، ان کا تصور ہے آج تک جن سے کہیں ملے، نہ کبھی جن سے بات کی
 لگتا ہے یوں کہ جیسے ابھی دل کی دل میں ہے
 حال آں کہ ان سے قصہ غم بار بار کہا

شیم کرمانی، شمس الدین حیدر

اگرچہ اعظم گڑھ (یوپی) کا قصبہ کرمان آبادی وطن تھا لیکن ان کی ولادت ۸ جون ۱۹۱۳ء (۲۱ رجب ۱۳۳۱ھ) کو اپنی ناسخیاں پارہ (ضلع غازی پور) میں ہوئی۔ کرمان کے سادات حضرت شمس الدین عرف شمس (ف: ۱۰۶۰ھ) کے نام لیا ہیں شمس کا اپنے زمانے کے مشہور صوفیہ اور اہل اللہ میں شمار ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں سات حج پیادہ پا کیے تھے۔ اس علاقے میں ان کی کرامات کے وسیوں قصے زبانزد خاص و عام ہیں۔ اسی لیے جب یہ پیدا ہوئے، تو ان کے والد سید محمد اختر نے بطور تفاؤل ان کا نام شمس الدین حیدر رکھا، گھر میں پیار کا نام شمسو تھا۔ ان سے تین بڑے بھائی تھے، علی بخش غفصنفر، اعظم حسین، حسام الدین حیدر۔ ایک بھائی علی حیدر، اور ایک بہن نرہیں خاتون ان سے چھوٹے تھے۔ جب تعلیم کی عمر کو پہنچے، تو اس زمانے کے دستور کے مطابق بسم اللہ گھر پر ہوئی جب یہ مرحلہ طے ہو گیا، تو اسفیں بڑے بھائی سید علی بخش غفصنفر کے پاس گورکھپور بھیج دیا گیا، جو وہاں ملازم تھے۔ وہاں کچھ پڑھا لکھا ہو گا۔ لیکن گورکھپور کا قیام بہت مختصر رہا، جلد ہی وہاں سے واپس آکر انھوں نے وثیقہ عربی اسکول فیض آباد میں داخلہ لے لیا۔ اس مدرسے میں دینیات کی رسمی تعلیم کے علاوہ عربی اور فارسی پڑھانے کا خاص انتظام تھا۔ چنانچہ یہاں انھوں نے عربی اور فارسی

کی تعلیم پائی اور اسی سے یونیورسٹی کے مولوی "اڈر کامل" کے امتحان بھی پاس کیے۔ اس زمانے میں انھوں نے انگریزی نہیں پڑھی۔ یہ کمی انھوں نے بہت دن بعد پوری کی۔ پہلے دسویں کی سند حاصل کی اور پھر انٹر کی۔ اپنی منصبی مسرفیتوں کے باعث بی اے کے امتحان کی تیاری نہ کر سکے؛ اور اس کمی کا احساس انھیں آخر تک رہا۔

ڈمیقہ عربی اسکول سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے ڈی، اے وی ہائی اسکول، اعظم گڑھ میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں وہ فارسی اور اردو پڑھانے لگے۔ مقررہ تنخواہ تلبیل تھی، اور جو کچھ واقعی ملتا تھا وہ قلیل تر تھا؛ اور ستم یہ کہ اس کی بھی وقت پر ادائی ہمیشہ غیر یقینی رہتی۔ یہ صورت حال کسی عنوان اطمینان بخش نہیں تھی۔ بالآخر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ مدرسہ کو خیر باد کہہ کر کوئی اور پیشہ اختیار کیا جائے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کی صنعتِ فلم سازی روز افزوں ترقی کر رہی تھی اور ہمارے بیشتر شاعر اور ادیب اس سے منسلک ہو گئے تھے۔ سب اعظم گڑھ کے قیام کے زمانے میں ان کا تعارف ماسٹر سید منور حسین رضوی سے ہو گیا، جو وہاں کے سماجی حلقوں میں خاصی معروف اور ذی اثر شخصیت تھے۔ سید منور حسین کے ایک بھائی سید شوکت حسین رضوی فلمیں بناتے تھے، مشہور ملکہ ترنم نور جہان ان کی بیوی تھیں۔ سید شوکت حسین نے شمیم کو مشورہ دیا کہ وہ ان کے ساتھ لاہور چلیں، اور پچھولی پکچرز کی فلموں کے لیے گانے لکھیں۔ یہ مدرسہ سے اور قلیل آمدنی سے تنگ تو آ ہی چکے تھے؛ کچھ ان ادیبوں کی اچھی اوقات ان کے سامنے تھی، جنھوں نے فلم کی راہ اختیار کی تھی؛ کچھ سید شوکت حسین نے بھی ہنر باغ دکھائے؛ انھوں نے لاہور جانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

وہ لاہور پہنچے، چند فلموں کے لیے گانے لکھے۔ اپنے مخصوص خاندانی ماحول کے برابر اثر وہ موسیقی پہلے سے جانتے تھے اور اس کے بنیادی اصول سے انھیں اچھی

واقفیت تھی، فلموں کے لیے یہ علم بہت مفید ثابت ہوا۔ بلکہ اس میں اور گہرائی پیدا ہو گئی؛ آواز بھی بہت اچھی تھی۔ یہ سب باتیں بعد کو مشاعرہ بازی کے دور میں بہت کار آمد ثابت ہوئیں۔ لیکن انھیں فلم کا خالص کاروباری ماحول اس نہ آیا۔ انھوں نے گھر کی زمینداری دیکھی تھی، اگرچہ ان تک آنے آتے وہ رئیسانہ سٹاٹ باٹ سب ختم ہو چکا تھا، تاہم ابھی رسی کا بل نہیں گیا تھا۔ غرض کہ جلد ہی ان کا دل اچاٹ ہو گیا اور وہ واپس اعظم گڑھ چلے آئے۔

اعظم گڑھ میں اب ڈی اے وی اسکول کی وہ پہلی نوکری ان کی دسترس سے باہر تھی کیونکہ ان کی غیر حاضری میں وہاں اور انتظام ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ اب ان پر رتی کی کشش غالب آنے لگی، جو اردو، فارسی علوم کا بہتر مرکز تھا۔ انھوں نے بعض دوستوں سے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور کوشش کرنے سے انھیں ۱۹۵۰ء میں اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول میں فارسی کے مدرس کی جگہ مل گئی۔ وہ اپنی وفات کے وقت اسی اساتذہ پر مشتمل تھے۔

انھیں اختلاج قلب کا عارضہ بہت دن سے تھا، توہم کے سببی شکار تھے۔ اسی باعث اکیلے سفر کرنے سے بالعموم اجتناب کرتے، کوئی نہ کوئی دوست یا ان کا اپنا بچہ ان کے ہمراہ جاتا۔ اس کے باوجود اس کا سان گمان بھی نہیں تھا کہ انجام اتنا قریب ہے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۵ء شام کے وقت وہ ایک مقامی مشاعرے میں شریک ہوئے۔ وہیں طبیعت بگڑ گئی اور بیہوش ہو گئے۔ فوراً قریب کے اردن اسپتال میں پہنچا دیے گئے۔ معاینے پر تشخیص ہوئی کہ دماغ کی انس پھٹ گئی ہے۔ اگلے دن (۱۹ مارچ) صبح ساڑھے سات بجے بیہوشی کے عالم ہی میں جان بحق ہو گئے۔ جنازہ اسی شام اٹھا اور ان کی خواہش کے مطابق جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ ان کا جنازہ ۳۰ جنوری ۱۹۷۶ء کو نگر ام کے میر حسن عسکری صاحب کی بڑی صاحبزادی کاظمی بیگم سے ہوا تھا۔ پروفیسر مسعود احتشام حسین مرحوم (وفات: ۱۹۷۶ء) ان کے

ہمزلف تھے۔ دونوں برائیں ایک ہی دن گئی تھیں۔ بڑی بہن شمیم کے عقد نکاح میں آئیں اور چھوٹی ہاشمی بانو، سید احتشام حسین کے شمیم نے تین صاحبزادے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ سید حسین اختر (عرف مراد) سید عابد اختر (عرف عماد) اور سید باقر اختر (عرف سلمان)۔ ان ناموں میں اختر کا لاحقہ شمیم مرحوم کے والد سید محمد اختر کی نسبت سے ہے۔

ان کے گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا۔ والد شاعر تھے؛ اختر ان کا تخلص تھا۔ بڑے منجملے سجائی اعظم حسین کا تخلص اعظم تھا، حکیم زکی حسین اور ان کے دونوں چھوٹے سجائی سید احمد علی، محمد علی، سید محمد علی، سب شاعر اور رشتے میں ان کے چچا ہوتے تھے۔ غرض ان کے بچپن میں ان کے ارد گرد شاعری کا چرچا تھا۔ اس کا اثر ہونا ہی چاہیے تھا، یہ بھی کسی میں مانگ بندی کرنے لگے۔ خاندان کی مذہبی روایت کے باعث شروع میں سوز خوانی پر بھی توجہ رہی اور خود بھی سلام اور نوحے لکھتے رہے۔ بعد کو غزل اور نظم کو ترجیح دینے لگے۔ چندے آرزو لکھنوی (ف: اپریل ۱۹۵۹ء) سے اصلاح لی۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں ان کا رجحان نظم کی طرف زیادہ تھا، اس لیے آرزو سے استفادہ بہت محدود رہا۔

ان کی شاعری کا آغاز ہماری سیاسی تحریک کے متوازی رہا۔ اس دور میں ان پر جوش ملیح آبادی کا بہت اثر تھا۔ انھوں نے بھی سیاسی نظمیں لکھیں، جن کا مجموعہ بعد کو ”روشن اندھیرا“ کے عنوان سے چھپا۔ (۱۹۴۳ء) اس کا سارا خرچ رفیع احمد قدوائی مرحوم (ف: اکتوبر ۱۹۵۴ء) نے اپنی جیب سے دیا تھا۔ ان کے بعض دوسرے شعری مجموعے یہ ہیں: برق و باران (منظومات)، عکسِ گل (لکھنؤ: ۱۹۶۴ء)؛ حرفِ نیم شب (دلی: ۱۹۷۲ء)؛ جانِ برادر (دلی: ۱۹۷۳ء)؛ پروفیسر احتشام حسین کا مرقیہ؛ صبحِ فاران (دلی: ۱۹۷۲ء) انھوں نے پڑت جواہر لال نہرو مرحوم (ف: مئی ۱۹۶۴ء) کی فرمائش پر جنگِ آزادی کی منظوم تاریخ ”تلاشِ سحر“ کے عنوان سے لکھنا شروع کی تھی۔ اس کے متعدد ابواب موقت الشیوعہ جریدہ میں

شائع ہوئے تھے، لیکن افسوس کہ یہ نظم مکمل نہ ہو سکی۔ اور بھی مختصر بہ غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔

ان کا کلام سید سچتہ اور بلیغ ہے، اس لیے بجا طور پر ان کا اس دور کے صفِ اول کے شعراء میں شمار ہوتا تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

برباد سہی لیکن، برباد غمِ دل ہوں _____ آنکھوں سے لگا مجھ کو، گردِ رو منزل ہوں
جشنِ حیات ہو چکا، جشنِ ممات اور ہے
ایک برات آچکی، ایک برات اور ہے
ان کو شمیم! کس طرح نامہ آرزو لکھیں
لکھنے کی بات اور ہے، کہنے کی بات اور ہے

گرا تھا جام، نہ ٹوٹا تھا کوئی آئینہ _____ شکستِ دل کی سبلا آپ کو خبر کیوں ہوا
کبھی نہ روٹھنے والے بھی روٹھ جاتے ہیں یہ بات پیار میں ہوتی تو ہے، مگر کیوں ہوا
دل سے شمیم! گفتگو، کیجیے کب تک چلے
رات بھی مختصر نہیں، بات بھی مختصر نہیں
جو میکدے میں ہو جگر ڈا، تو پہلے یہ دیکھو
کہ میکدے میں کہیں شیخ و برہمن تو نہیں

بہشت سے بھی زیادہ حسین نظر آئی _____ وہ سرزمین جو مآلِ گناہِ آدم ہے

آدابِ جنوں مانگے، آئینِ وفا مانگے
کیا دل ہے کہ اک دنیا، دنیا سے جدا مانگے
اک جانِ طلب تم ہو، تم مل ہی نہیں سکتے
دنیا سے یہ دل آخر، مانگے بھی تو کیا مانگے
دنیا کے اجالوں نے ٹوٹا ہے، شمیم! ایسا
دل بزمِ چراغاں میں، آندھی کی دعا مانگے

بہ بناؤ کہ تبستم بھی ہے اک زخم کا نام _____ چاک ہے کس لیے انسان کا سینہ، نہ کہو

احساس انا کیا ہے، احساس وجود اپنا
ہم کو نہ چھڑا ہم سے، رہ جائیگے ہم تنہا
ہمیں بھی دیکھ کہ شاید تجھے نہیں معلوم
"جہاں نگر" ہمہ عالم ہے "خود نگر" تنہا
اب اپنے ساتھ مجھ غم زما نہ ہے
چلے تھے جب تو غم دل تھا ہمسفر تنہا
نہ جانے بغیر بت اہل نظر پہ کیا گزرے
زمانہ سنگ بکف اور شیشہ گر تنہا
ایسا نہ ہو کہ جوش جنوں محفک کے بیٹھ جائے
ہوتی رہے خرد سے ملاقات گاہ گاہ

تکلف گل کا تبسم بھی حرف و کش ہے مگر کہاں ترے انداز گفتگو کی طرح
تمہاری بات نہیں تم تو با وفا کھڑے گلہ ہے ان سے، جو ایفائے عہد تک جیے
زخم جبین کا ماجر، تم سے، تبسم! کیا کہیں!
کوچہ غیر سے نہیں، اپنی گلی سے آئے ہیں
سمجھے ہے مفہوم نظر کا، دل کا اشارہ جانے ہے
ہم تم چپ ہیں، لیکن دنیا حال ہمارا جانے ہے
ہلکی ہوا کے اک جھونکے میں، کیسے کیسے پھول گرے
گلشن کے گل پوش نہ جانیں، گلشن سارا جانے ہے
شمع تننا، پچھلے پہر تک، درد کا آنسو بن ہی گئی
شام کا تارا کیسے ڈوبا، صبح کا تارا جانے ہے
کیا کیا ہیں آئین تماشا، کیا کیا ہیں آداب نظر
چشم ہوس یہ سب کیا جانے، وہ تو نظارہ جانے ہے

اپنے شمیم رسوا کو تم جانو ہوا بجان کوئی
 بستی ساری پہچانے ہے، صحر اسارا جانے ہے
 شمیم! عہد گذشتہ کی گفتگو نہ کرو وہ دن گئے، وہ محبت گئی، وہ بات گئی
 سکوں کی چمک پہ گرتے ہوئے، دیکھا ہے شیخ و برہمن کو
 پھر میرے کھنڈر کی قیمت کیا، جب دیرو حریم بک جاتے ہیں
 جو کہ رہے ہیں کہ آتی نظر نہ منزل دوست
 وہ لوگ جانب دیرو حریم گئے ہونگے
 غم عشق دل کو بجھے، جو نشا جاودانی
 تو حیات محقر کا غم بے ثبات کیا ہے
 جو مذاق رنگ و بو ہو، تو دلوں کا بھید کیسا
 کہیں موج گل نے پوچھا کہ صبا کی ذات کیا ہے؟
 خاموش نہ تھا دل بھی، خواہید نہ تھے ہم بھی
 تنہا تو نہیں گزرا، تنہائی کا عالم بھی

مانی ناگیوری، بشیر خان

ان کا خاندان دہلی بھوپال کارہنہ والا تھا، جہاں سے ان کے جدِ مرحوم امیر خان ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے میں ترک وطن کر کے ناگیور چلے آئے، اور پھر یہیں کے ہو کے رہ گئے۔

امیر خان کے چار بیٹے تھے: کریم خان، منیر خان، نظیر خان، بشیر خان، سب سے بڑے کریم خان ہی بشیر مانی کے والد تھے۔ کریم خان کی شادی ناگیور کے مشہور سپھان گل میرزا کی دختر امتیاز بی سے ہوئی تھی۔ امتیاز بی اپنی ناسخیال کی طرف سے ایک نو مسلم گونڈ خاندان سے تھیں، جو گونڈ حکمرانوں کے یہاں ملازم تھے۔ بشیر خان سے بڑی ایک بہن عور غلام تھیں۔ ان کا عنفوانِ شباب میں انتقال ہو گیا۔ گویا اس کے بعد بشیر خان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد رہ گئے۔

بشیر خان اپنی ناسخیال میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد کریم خان، خانہ و اماں تھے۔ اپنے زمانے کی فارسی، عربی، اور اردو تعلیم کے علاوہ دسویں درجے تک انگریزی بھی پڑھی۔ والد کا انتقال ۱۹۲۶ء میں ہو گیا، جب یہ آٹھ برس کے تھے؛ والدہ ۱۹۳۸ء میں سدھاریں۔ ان کی ساری تعلیم و تربیت نانائی نگرانی میں ہوئی۔ ان کا ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا، کہتے ہیں کہ اس وقت ان کی عمر ۴۰ سال کی تھی۔ والدہ اعلم بالصواب۔

بشیر خان شروع سے مخنی اور کمزور قوام کے ہونے کے باعث کسی محنت کے کام کے گون نہیں
تھے۔ لہذا عمر بھر کہیں مستقل ملازمت نہیں کر سکے۔ چندے ایک قریب کی مینگانیز
کی کان میں کلر کی کی؛ معلمی کی؛ اور کچھ جگہوں پر بھی عارضی کام کرتے رہے۔ لیکن آخر
تک کم و بیش پریشان حال ہی رہے۔

ضعف معدہ کے دائمی مرہض تھے۔ پھر کچھ اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اسفین میں
متلا ہو کر میوجنرل اسپتال، ناگپور میں علاج کی خاطر داخل ہوئے۔ وہیں ہفتے کے
دن ۳ مئی ۱۹۷۵ء شام کو مالک حقیقی کا بلا وا آگیا۔ اور اگلے دن (۴ مئی) دوپہر
بعد مومن پورہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

ان کی شادی اپنے چچا مینر خان کی صاحبزادی انوری خانم سے ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی۔
ڈیڑھ دو سال بعد بیوی کا زچگی کے ایام میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا
نکاح مرحومہ کی چھوٹی بہن طاہرہ خانم سے ہوا۔ اس بیگم کے بطن سے آٹھ بچے ہوئے؛
چار بیٹے اور چار بیٹیاں۔ ماشاء اللہ سب زندہ و سلامت موجود ہیں۔

مافی ابھی اسکول کے آخری درجوں میں تھے کہ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے
میں پروفیسر منظور حسین شورو اور محمد حبیب اللہ خان غفنی تلمیذ شفیق اردووی
(ف: ۱۹۲۲ء) وہیں ہائی اسکول اسکول، ناگپور میں فارسی اور اردو پڑھاتے
تھے۔ شہر میں بھی مولانا ناطق گلڈھوی (ف: مئی ۱۹۶۹ء) اور ان کے تلامذہ کی موجودگی
کے باعث شعر کے لیے فضا سازگار تھی۔ مافی بھی شعر کہنے لگے۔ انھوں نے کوشش
کی کہ انبال احمد خان سہیل، نظم گر تھی (ف: نومبر ۱۹۵۵ء) انھیں اپنی شاگردی
میں قبول کر لیں۔ لیکن مرحوم نے کسی وجہ سے معذرت کر دی۔ اس کے بعد مافی
نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ طبیعت بھی عزت پسند اور نام و نمود سے متنفر تھی،
اس لیے کسی کے در پر نہیں گئے۔

افسوس کہ مجموعہ کلام زندگی میں شائع نہیں ہوا، اگرچہ اسے خود ہی "صحیفہ رصنم" کے نام
سے مرتب کر لیا تھا۔ اس کا مسودہ ان کے خاندان میں موجود ہے۔ اسی سے چند شعر

نمونے کے طور پر درج کر رہا ہوں، جو ان کے شاگرد عرفان قنوجی اور محمد عبدالحلیم (ناگپور)
کی ہر بانی سے حاصل ہوتے ہیں:

میں یاد گرفتاری بڑھ جاتی، تو اچھا تھا
شرم آتی ہے گھر جاتے، چھوٹے ہوئے زنداں سے
سخنوروں کا شعر میں خیال جیسے لڑ پڑے
جو بات ان کے دل میں ہے، وہی ہے میری آرزو
نوازشِ غمِ دوراں سبھی پہ یکساں ہے گناہگار کا دل ہو کہ بیگناہ کا دل
تیر و سناں، نگاہ کو باندھ گئے سخن طراز
چوٹ لگی ہے پھول سے، زخم کھلے ہیں بات سے
کام کچھ گردشِ دوراں سبھی نہ آئی، مانی!
پھر کہیں نوٹ کے وہ لیل و نہار آتے ہیں
اہلِ دانش نہ سنواریں گے جہاں کو، یارب! کوئی دیوانہ، اسی آب، اسی گل سے اکٹھا
با وضو مسجد گزارانِ حرم صفا بستہ
تیری پلکیں ہیں کہ حجاج کا کعبہ میں ہجوم
کتنے دل ہو گئے احساسِ گناہ سے خالی
حسن نے دیکھ لیا، جب بنگاہِ معصوم
تبصرے لاکھ ہوتے، خالی رُخِ جاناں پر
ایک نکتہ ہے کہ کھلتا نہیں جس کا مفہوم
گم کردہ کیوں ہیں خلاؤں میں، یہ عالم تو کے دیوانے
مانی! یہی اپنی دنیا ہے، شایانِ طوافِ شمس و قمر
بہتر ہے نگاہوں کی پناہ نگاہِ مراد دل کبہ میں گرفتار نہیں ہوتے ہیں قاتل
دل کو محرومیِ دانش یہ نہیں آتی ہے کچھ درِ علم سے ہاتھ آیا، نہ حکمت سے ملا
مانی! منبر کوئی مقام نہیں عشقِ کاراز، دار پر سمجھا

مضطر حیدری، دلاور حسین

ان کا خاندان آگرے کا رہنے والا تھا، جہاں سے یہ لوگ ۱۸۵۷ء کے فوجی ہنگامے کے بعد ہجرت کر کے دلی پہنچے اور پٹنے کے مختصر قیام کے بعد کلکتہ پہنچے۔ یہیں دلاور حسین ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔

تعلیم کا آغاز مدرسہ عالیہ سے ہوا، جہاں پانچویں درجے تک رہے۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو سان جیمز اسکول میں پہنچے۔ لیکن کچھ صحت کی خرابی اور کچھ طبیعت کے اُبالی پن کے باعث تعلیم میں کوئی ترقی نہ کر سکے، دسویں درجے کے امتحان سے پہلے ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ گویا ڈرکٹا پننگ بن گئے، جس کا کوئی مرکز نہ رہا ہو۔

روزگار کی طرف سے ہمیشہ پریشان رہے۔ جب کلکتہ میں کوئی اطمینان کی صورت نہ نکلی، تو بمبئی کی راہ لی کہ شاید وہاں کسی فلمی کمپنی میں گیت یا نظمیں لکھنے کا کام مل جائے۔ وہاں بعض احباب کے سہارے کچھ کام ملا، اور انھوں نے ایک دو فلموں کے گانے لکھے بھی لیکن کوئی مستقل انتظام نہ ہو سکا اور معاوضہ بھی اتنا کم تھا کہ جلد ہی یہ دل برداشتہ ہو کر واپس کلکتہ چلے گئے۔

ان کا بچپن اپنے نانا آبا کی سرپرستی میں گزرا تھا؛ وہ شعرا و موسیقی کے رسیا تھے۔ دلاور حسین بھی انھیں کے رنگ میں رنگے گئے۔ تعلیم کے دوران ہی میں ان کے بعض دوست شعر کہنے لگے تھے، ان سے بھی متاثر ہوتے۔ ادھر نانا جان الہ کو

پیارے ہو گئے۔ اب گویا سر پر کوئی نہ رہا۔ انھوں نے نانا کے مختصر ذخیرہ کتب سے استفادہ کیا اور ان کا ہارمونیم لے کر موسیقی کی دھنیں بجانے لگے۔ رفتہ رفتہ خود شعر کہنے کی تحریک ہوئی، اور انھوں نے ۱۹۴۴ء میں باقاعدہ اس میلان میں قدم رکھ دیا۔ شعر پر مستقل اصلاح کسی سے نہیں لی جو کچھ کہا، اُسے اپنے مطالعے اور ذوقِ سلیم کے پھروسے پر مشاعروں میں سناتے رہے البتہ کلکتہ کے بیشتر بزرگ اساتذہ سے راہِ درسم تھی، انھیں کے مشورہ سے مستفید ہوتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں ایک مختصر مجموعہ 'جامِ جم' کے عنوان سے اردو سبھا، کلکتہ کی طرف سے چھپا تھا۔ اس میں رباعیاں، غزلیات اور نظمیں ہیں۔

ان کے کلام میں ہم عصر سیاسی حالات پر تنقید بہت نمایاں ہے؛ ترقی پسند تحریک کے اثر سے بھی یہ خالی نہیں۔ افسوس کہ عمر نے وفانہ کی۔ وہ سچا س برس کی عمر میں کینسر کے عارضے میں مبتلا ہو گئے، جس سے صحیفہ بانی کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس سے گھبرا کر انھوں نے ۱۳ مئی ۱۹۷۵ء کی رات میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ اگلے دن لاش حاجی محمد حسن اسکویئر (کلکتہ) کے تالاب سے ملی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بچے تحمانی یادگار چھوڑے۔

چمن والوں کے ہونٹوں پر ہیں شادابی کے افسانے
مگر افسردگی کلنتاں کچھ اور کہتی ہے
مکوت بحر کو تم دائمی کہہ لو، مگر مضطر!
سبک رفتاری موج رواں کچھ اور کہتی ہے
سوچا ہے کہ اک بت کو اب دل میں بسا تینے کے
دیران رہیگا یہ اللہ کا گھر کب تک!

وقت پر چھوٹی تھی سبھی سکون افزا ہے
پھر بھی مضطر! یہ مسے درد کا درماں تو نہیں

ہماری داستاں اب نامکمل رہ نہیں سکتی
 زباں رک بھی گئی تو آنکھ سے آنسو رواں ہونگے
 خلوص ہو تو کہیں بندگی کی قید نہیں صنمکدے میں طوافِ حرم بھی ممکن ہے
 رات کی بات کیا؛ رات گئی، بات گئی صبح سے آنکھ ملاؤ کہ سحر ہوتی ہے
 یہ رسم عام نہیں پھر بھی ہم نے دیکھا ہے
 خود اپنی آگ میں پردے جلنے لگتے ہیں
 عجیب حال ہے اس دل کا ان دنوں مضطر!
 ہنسی ہنسی میں بھی آنسو نکلنے لگتے ہیں
 کنجِ قفسِ مقتل تو نہیں ہے، جان: پچی اور لاکھوں پائے
 صحنِ چمن کا ذکر نہ چھیڑو، بال و پیر کا نام نہ لو
 مے ان کی، میخانہ ان کا، جام ان کے، شیشہ ان کا
 تلخی نے کا شکوہ کیسا! کیف و اثر کا نام نہ لو
 کل کی بات، تھقی کل تک، مضطر! چھوٹ تھقی قیاس کھانے کی
 آج قسم کھانے کے لیے بھی ان کے سر کا نام نہ لو

یہ ہمیں تھے کہ بھرم آپ کا رکھا ہم نے
 ہم کبھی حسرتِ دیدار سے آگے نہ بڑھے
 عبث ہے تشنہ لبی کا شکوہ نظامِ فطرت سے میگسارو!
 نگاہِ سائی بدل گئی ہے، شراب کی کچھ کمی نہیں ہے
 رباب و تیشہ و سیف و قلم تراشے ہیں
 ہمیں خدا ہیں، ہمیں نے صنم تراشے ہیں
 یہ سنگ و خشت کو غطت ہمیں نے بخشی ہے
 ہمیں نے دیر ہمیں نے حرم تراشے ہیں

انتظار بادل نام سے ڈر جاتے ہیں
 رات تو دور ہے ہم شام سے ڈر جاتے ہیں
 تہمت نشو و نما راج ہے ہم نو مضطر
 ہونگے وہ اور جو انعام سے ڈر جاتے ہیں
 شبی رات ڈھلتی ہے، ڈھلتے دن؛ کھل اٹھیں گے چین اُرت بارے تو دور
 صبح روشن کا سورج نکلے تو دو، ہرکلی پھول بن کر نکھر جائیگی
 ظلمت شب سے اے دل! ہراساں نہ ہو، تارے گن گن کے ناحق پریشاں نہ ہو
 لاکھ بھاری سہی، رات پھر رات ہے خود گزرتے گزرتے گزر جائیگی
 ہم ٹھہرے مایوس شہزادی، ہسکی باتیں کرتے ہیں
 ذہن میں داءِ غم کے بھی خلل ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے
 اکٹے کا اذنِ بستم بھی ہے بہت مایوس نہ ہو
 عمر کا حاصل اک یہی پل ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے
 شام ابار کے دھڑلے بادل چھائے ہیں ہر سمت مگر
 رات کئے پھر صبح ازل ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے
 مری چارہ سازی کی فکر ہے، مرے ساتھ تیرا بھی ذکر ہے
 مراحل دیکھ کے چارہ گر ترے نام تک تو پہنچ گئے
 وہ نگاہِ ناز بھی ادھر، تو پیام تک تو پہنچ گئے
 کبھی ہم کلام بھی ہونگے ہم کہ سلام تک تو پہنچ گئے
 اب تو اظہارِ تمنا سے بھی جی ڈرتا ہے
 اتنے سہمے ہوئے جذبات کہاں تھے پہلے

سخت جاں بھی ہے، جاں بلب بھی ہے
 دل کا عالم جو کل تھا، اب بھی ہے

فطرتِ حسن کو قتی کیا سمجھے
 بے نیازی بھی ہے، طلب بھی ہے
 مضطرِ روزِ حشر بھی ٹھہرے گناہگار
 وہ پنج گئے وہاں بھی، عجب اتفاق ہے
 افسانہ خاموشی، یہ اشکِ غم، یہ شمعِ انجمن
 چھڑ دی کس نے بھری محفل میں پروانے کی بات
 کیا جانے کیسی آگ ہے یہ؛ شعلوں کا پتہ ہے، اور نہ دھواں
 محسوس مگر ہوتا ہے یہی، جیسے کہ میں جلتا رہتا ہوں
 فطرت میں ازل ہی سے میری، نیرنگی و ندرت ہے مضطر!
 افسانہ تو ہوں میں ایک، مگر عنوان بدلتا رہتا ہے
 کچھ اور مسافر بھی ہیں ہمراہ ہمارے — ہم اپنے سفینے کو ڈبو بھی نہیں سکتے۔
 ان سفینوں کا ڈوبنا بہتر — جن کو ساحلِ نظر نہیں آتا
 ترے فراق کی لذت پہ ناز کرتا ہوں — ترا وصال تو خواب و خیال ہے اے دوست!

شب کی تنہائی مزہ دینے لگی — دن بھی اب یوں ہی گزارا چاہیے
 منتظرِ کل بھی تھے کسی کے ہم — آج بھی انتظار کرتے ہیں
 کم نظروں کے اور اک وگماں سے آگے — اس مفسدہ پر دراز جہاں سے آگے
 اے قافلے والو! نہ یہاں پر ٹھہرو — منزل ہے ابھی دور، یہاں سے آگے
 بجلی کی چمک قید کرو، تو جانیں — کوندے کی لپک قید کرو، تو جانیں
 مانا کہ گلشن پہ تمھارا قبضہ — پھولوں کی ہلک قید کرو، تو جانیں

میخانے میں یہ پسند و نصیحت کیسی!
 اسراف و فحاشی کی حکایت کیسی!
 بے اپنی ہے، جام اپنا، صراحی اپنی
 اے پیرِ مغان! تیری اجازت کیسی!

ذوالفقار علی بخاری، سید

ان کے خاندان کا مستقط الراس وسطی ایشیا کا مشہور مرکزِ علم اسلامیت شہر بخارا تھا، جہاں سے ان کے اجداد اسٹھارھویں صدی عیسوی میں ہجرت کر کے کشمیر جنتِ نظیر میں آئے تھے۔ ایک زمانہ بعد ذوالفقار علی بخاری سے تین چار پشت اوپر یہ لوگ کشمیر سے نکلے، اور صوبہ سرحد کے دارالحکومت پشاور میں آ گئے۔ ان کے والد سید اسد اللہ شاہ بخاری کا شہر کے علما اور برگزیدہ اشخاص میں شمار ہوتا تھا۔ شاہ صاحب مرحوم پیر کی حیثیت سے بھی معروف تھے، اور ان کے مریدوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔

سید اسد اللہ شاہ بخاری کے تین صاحبزادے تھے۔ جن میں سے دو نے خفی شہرت حاصل کی۔ سب سے بڑے پیر سید محمد شاہ تھے۔ یہ شعر بھی کہتے تھے؛ رفعتِ تخلص تھا۔ منجملے سید احمد شاہ بخاری تھے، جنہیں اردو دنیا "پطرس" کے نام سے جانتی ہے اور اگر چاہے بھی، تو انہیں بھلا سکتی۔ ان کا ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو نیویارک میں انتقال ہوا۔ اردو والوں کی جیسی اور بتوفیقی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو گا کہ آج تک ان کی سوانح عمری نہیں شائع ہوئی۔

سب سے چھوٹے یہی سید ذوالفقار علی بخاری تھے، جن کے بارے میں یہ چند سطرین پیش کر رہا ہوں۔

ذوالفقار علی ۱۹۰۴ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک تعلیم بھی وہیں گورنمنٹ ہائی اسکول میں پائی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے لاہور آ گئے۔ ان دونوں بھائیوں نے ”پیر“ کے سابقے سے کس طرح چھٹکارا پایا، اس کا قصہ ذوالفقار علی نے اپنی کتاب ”سرگزشت“ میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بھائی جان کا پورا نام پیر سید احمد شاہ بخاری تھا، اور میرا پیر سید ذوالفقار علی شاہ بخاری۔ چونکہ والد مرحوم کے بعد ہم دونوں کسی سے بیعت لینے کے اہل نہیں تھے، لہذا ہم نے خیال کیا کہ ہمارا کوئی حق نہیں کہ پیر کا لفظ اپنے نام کا جزو بنائے رکھیں۔ چنانچہ بھائی جان ”پیر احمد شاہ“ سے احمد شاہ ہو گئے، اور میں ”پیر سید ذوالفقار علی شاہ“ سے ذوالفقار علی بخاری بن گیا۔ پشاور میں ان کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر ڈاکٹر تھے۔ وہ احمد شاہ کی صلاحیتوں کے پیش نظر اور خاص کر ان کی انگریزی میں قابلیت کے باعث ان سے بہت محبت کرتے تھے؛ اور انھیں صرف ”پیر“ کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن لفظ پیر کا تلفظ اس طرح کرتے جس طرح یہ فرانسیسی میں بولا جاتا ہے، یعنی پینر (بالکل اسی طرح جیسا کہ پیر سوپ میں ہے) فرانسیسی پیر، انگریزی میں پیر ہے اور فرانسیسی میں پطرس۔ آپ نے حضرت عیسیٰ کے حواری سینٹ پٹر کا نام سنا ہوگا؛ انھیں بھی یونانی میں (اور اسی سے عربی میں بھی) پطرس کہتے ہیں۔ غرض جب احمد شاہ نے لاہور کالج میں پہنچنے کے بعد انگریزی میں مضمون لکھنا شروع کیے تو ان پر وہ اپنے نام کی جگہ پٹر لکھنے لگے؛ بلکہ انھوں نے اپنے استاد سے اپنی عقیدت اور ارادت کا اظہار یوں کیا کہ ان مضامین کے ساتھ اپنا پورا نام پٹر ڈاکٹر لکھتے رہے۔ چنانچہ اس زمانے میں ان کے جو مضامین لاہور کے انگریزی روزنامے ”سول اینڈ ملٹری گزٹ“ میں چھپے تھے، ان کے ساتھ نام پٹر ڈاکٹر (Peter Watkins) ہی تھا۔

اب یہ قصہ ختم ہی کر لوں:

سید امتیاز علی تاج (ف: اپریل ۱۹۷۰ء) نے ۱۹۱۸ء میں ماہنامہ ”کھکشاں“

جاری کیا؛ بڑے سٹاٹ کا پرچہ تھا یہ۔ چونکہ اس وقت بیشتر صف اول کے ادیبوں سے تاج کے ذاتی مراسم تھے؛ وہ تاج کی فرمائش پر اس میں مضمون لکھنے لگے۔ انہیں میں احمد شاہ بخاری بھی تھے؛ یہ کالج میں تاج کے اجتماعت بھی رہے۔ بخاری نے ”کہکشاں“ کے لیے ایک سلسلہ مضامین لکھا: ”یونانی حکماء اور ان کے خیالات“ اور موضوع کی مناسبت سے ان پر اپنے اصلی نام کی جگہ ”پیٹرس“ کا قلمی نام استعمال کیا۔ ان کی ہدایت تھی کہ میرا نام نہ چھپے اور نہ کسی کو بتایا جائے کہ یہ مضامین میرے لکھے ہوئے ہیں۔ پہلی دو تین قسطوں میں تو ان کی ہدایت پر عمل ہوا لیکن اس کے بعد ایک قسط پر کاتب نے سہواً ”پیٹرس“ کے ساتھ ان کا پورا نام ”احمد شاہ بخاری“ بھی لکھ دیا۔ ادیبوں پر راز فاش ہو گیا کہ ”کون“ معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں“ اب چونکہ سب کو معلوم ہو ہی گیا تھا، اس لیے اس کے بعد خود احمد شاہ بخاری نے بھی یہ قلمی نام اختیار کر لیا، اور کھلے بندوں اسے اپنی تحریروں میں استعمال کرنے لگے۔

تو اسی موقع پر یہ چھوٹے بھائی ”ذوالفقار علی بخاری“ ہو گئے۔ اور بعد کو انگریزیت نے ترقی کی، تو اس میں تخفیف کر کے زیڈ۔ اے بخاری بن گئے۔

ان کے سرکاری ملازمت میں شامل ہونے کا واقعہ اتفاقاتِ زمانہ کی حیرتناک مثال ہے۔ ہوا یہ کہ ایک دن پیشاور میں ان کے کسی دوست نے انہیں بتایا کہ اخبار میں بینام کا اشتہار چھپا ہے کہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے، جو انگریزی، اردو، فارسی، عربی، پشتو، پنجابی زبانوں سے واقف ہو۔ اس دوست نے مذاق سے کہا کہ بھلا بتاؤ، انہی ساری زبانیں جاننے والا اس شخص کو کہاں ملیگا؟ وہ دوست تو صرف اتنا کہہ کر چلے گئے، ذوالفقار علی بخاری نے ”ٹریبیون“ اخبار کا وہ پرچہ تلاش کیا، جس میں اشتہار چھپا تھا اور چونکہ وہ کم و بیش یہ سب زبانیں جانتے تھے، لطف لینے کو مندرجہ اشتہار پتے پر درخواست بھیج دی، اور اس میں مشورہ طلبی کے لیے علامہ اقبال (ف؛ اپریل ۱۹۳۸ء)

اور پروفیسر محمد سعید کے نام لکھ دیے کہ اگر میرے بارے میں مزید پوچھ گچھ کرنا منظور ہو، تو ان اصحاب سے رجوع کیا جائے۔ قصہ کوتاہ، وہ ان اصحاب کی سفارش پر ملازم ہو گئے۔ یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے، جب ان کی عمر صرف ۲۱ برس کی تھی۔

فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے ختم ہونے پر حکومت ہند کے فوجی دفتر کے جنرل اسٹاف نے ایک ممتحنین کا بورڈ "قائم کیا تھا، تاکہ اس کی مدد سے انگریز افسروں کی قابلیت اور اہلیت کی جانچ کی جاسکے۔ اس محکمے کا صدر دفتر شملے میں تھا۔ وہ اشتہار اسی دفتر کی طرف سے شائع ہوا تھا، اور اسی بورڈ کے رکن ذوالفقار علی بخاری مقرر ہوتے تھے۔

یہ بہت ذمے داری کا عہدہ تھا۔ ان سے پہلے شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد یوسف رنجوار (جن ۱۹۲۳ء) اس بورڈ کے رکن تھے جس جگہ پر ذوالفقار علی بخاری کا تقرر ہوا تھا، یہ ۱۹۲۰ء میں رنجوار کے پنشن پر سبکدوش ہونے سے خالی ہوئی تھی۔ بخاری اس عہدے پر دس ساڑھے دس برس متمکن رہے۔

اگرچہ ممبئی اور کلکتہ میں بعض لوگوں نے پہلے سے معمولی صلاحیت کے ریڈیو ٹرانسمیٹر لگا رکھے تھے، لیکن سرکاری محکمے کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو قائم ہوا۔ اس کی تنظیم و ترویج کے لیے بی بی سی، لندن نے حکومت ہند کی درخواست پر میٹرلائینل فیلڈن (ف: لندن، ۲ جون ۱۹۴۲ء) کو ہندوستان بھیجا۔ ظاہر ہے کہ فیلڈن کو موزوں کارکنوں کی ضرورت تھی، جو اس نئے محکمے کی تنصیب و ترقی میں ان کے معاون ثابت ہو سکیں۔ ذوالفقار علی بخاری کے ایک انگریز دوست نے فیلڈن سے ان کا ذکر کیا؛ بخاری نے بھی دعوت صحیح دی، اور بالآخر انتخابی بورڈ نے ان کا دلی اسٹیشن میں پروگرام ڈائریکٹر کے عہدے پر تقرر منظور کر لیا۔

فیلڈن آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر جنرل تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ عہدے کا نام

سمجھ رکھ لیجیے، وہ محکمے کے سیاہ و سپید کے مالک تھے۔ لارڈ ولنگٹن والیسراے سے ان کی ذاتی ملاقات ہی نہیں، گہری دوستی تھی۔ اس لیے جب بھی کوئی محکمانہ یا دفتری قسم کی دشواری پیش آئی، جس سے فیلڈن کو اپنی من مانی کرنے میں رکاوٹ محسوس ہوتی، وہ سیدھے ولنگٹن کے پاس چلے گئے؛ اور ان سے، جو حکم چاہا، جاری کرالائے۔

ذوالفقار علی بخاری کی فیلڈن سے پہلی ہی ملاقات میں دوستی ہو گئی تھی۔ اور دوستی بھی ایسی کہ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ ستھوڑے دن بعد فیلڈن کی خواہش پر پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) بھی دلی آ گئے۔ اویہاں دلی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر مقرر ہو گئے۔ اس پر ذوالفقار علی بخاری کو ترقی ملی اور یہ ان کے نائب اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر بن گئے۔ ذرا خیال فرمائیے، بڑا بھائی اسٹیشن ڈائریکٹر، اور چھوٹا بھائی اسسٹنٹ ڈائریکٹر، اور کنٹرولر جنرل، فیلڈن، ان دونوں کا یا رِ غار، گویا ان کی جیب ہیں۔ اس پر سردار دیوان سنگھ مفتون (ف: جنوری ۱۹۷۵ء) نے پھبتی کسی کہ ایک بی بی سی لندن میں ہے، اور ایک بی بی سی دلی میں، یعنی بخاری برادر س کا رپورٹیشن جو آل انڈیا ریڈیو کی کرتا دھرتا ہے۔

ستھوڑے دن بعد جب ڈپٹی کنٹرولر کاؤس جی بہرام جی سیٹھنا کا بمبئی تبادلہ ہو گیا، تو ان کی جگہ پطرس ڈپٹی کنٹرولر بن گئے، اور ذوالفقار علی اسٹیشن ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اسی زمانے کا ایک لطیفہ یاد آیا:

کسی نے پوچھا: حضرت! اب یہاں ریڈیو اسٹیشن پر دو بخاری ہیں۔ بات چیت میں جب تک پورا نام نہ لیا جائے معلوم نہیں ہوتا کہ آپ ان دونوں میں سے کن صاحب کا ذکر کر رہے ہیں؟ محض بخاری کہہ دینے سے القباس کا اندیشہ ہے۔ کوئی ایسا نشان مقرر ہونا چاہیے کہ پورا نام بھی نہ لینا پڑے اور تعین بھی ہو جائے۔ سامع نے کہا کہ اس میں کیا مشکل ہے، بڑے بھائی (احمد شاہ بخاری)

صحیح بخاری، اور چھوٹے (ذوالفقار علی بخاری) غلط بخاری، اس بات پر ایک تہمت پڑا۔ لیکن یہ لطیفہ کچھ ایسا چپک کے رہ گیا کہ اس کے بعد بینکلف دوستوں کی مجلسوں میں ان دونوں بھائیوں کی طرف واقعی صحیح بخاری اور غلط بخاری کے ناموں ہی سے اشارہ ہوتا رہا۔

۱۹۳۷ء کے شروع میں حکومت ہند نے (یا کہیے فیلڈن نے) فیصلہ کیا کہ ہندستان میں ریڈیو اور براڈ کاسٹنگ کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ بعض لوگوں کو انگلستان بھیجا جائے، جو وہاں بی بی سی میں کچھ دن رہ کر اپنے کام کی تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں۔ اس پر دو آدمیوں کا انتخاب ہوا۔ ایک فیلڈن کے پرائیوٹ سکٹر (مسٹر آچاریہ) اور دوسرے ذوالفقار علی بخاری کا۔ غرض سال بھر سے کچھ کم بی بی سی، لندن میں تربیت حاصل کرنے کے بعد بخاری واپس آئے، لیکن دلی پہنچنے پر انھیں معلوم ہوا کہ اب ان کا دلی میں قیام نہیں رہے گا چنانچہ یہ اسی عہدے پر بمبئی ریڈیو اسٹیشن بھیج دیے گئے۔ بمبئی ریڈیو کا موجودہ اسٹوڈیو اور دفتر انھیں کے زمانے میں تیار ہوا۔ قیام بمبئی کے دوران میں انھوں نے روزمرہ کے کام کے لیے گجراتی اور مراٹھی دونوں زبانیں اچھی خاصی سیکھ لی تھیں، اگرچہ خود انک انک کے بات کرتے تھے، لیکن سمجھتے خوب تھے۔

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی۔ عہد حاضر میں جنگ صرف فوجوں یا میدان ہی تک محدود نہیں رہ گئی ہے، بلکہ فریقین کی پوری پوری آبادی اس کے نرغے میں آجاتی ہے۔ حکومت جب انک اپنے لوگوں کو اس بات کا یقین نہ دلا دے کہ جنگ مفاد عامہ کے لیے لڑی جا رہی ہے، اور سرکار کا موقف صداقت اور انصاف پر مبنی ہے، اسے عوام کی ہمدردی اور اعانت حاصل نہیں ہو سکتی۔ نہ صرف یہ، بلکہ فریقین غیر جانبدار ممالک کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے بھی پوری سعی کرتے ہیں۔ صورت حال کی اس تبدیلی کا بہ اثر ہوا

ہے کہ فوج تولڑنے کو میدان جنگ میں جاتی ہے، اور حکومت کے تمام ذرائع نشر و اشاعت حرکت میں آ جاتے ہیں، لوگوں پر یہ واضح کرنے کو اور انہیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ حکومت جنگ کرنے پر اس لیے مجبور ہوتی ہے کہ ملک کی آزادی، بلکہ ہستی اور وہ تمام اقدار جن کی لوگ قدر کرتے ہیں، دشمن کی وجہ سے معرض خطر میں ہیں۔ پس، عوام کا فرض ہے کہ وہ حکومت کے اقدام کی تائید کریں اور جنگ جیتنے کے لیے اس سے پورا تعاون کریں۔ چنانچہ جب جنگ شروع ہوئی، تو حکومت برطانیہ کی پراپیگنڈے کی مشین بھی پورے زور شور سے حرکت میں آگئی۔ بی بی سی، لندن نے بھی اپنی سرگرمیاں تیز سے تیز کر دیں۔ اس کے سامعین میں اردو بولنے والے و محاذوں پر تھے؛ ایک خود ہندستان میں؛ دوسرے وہ ہندستانی فوجی جو یورپ اور ایشیا اور افریقا کے جنگ کے میدانوں میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ اس لیے بی بی سی نے اپنے عملے میں کئی اردو دان حضرات کا اضافہ کیا، جو نہ صرف اس کے نشریات کو بہتر بنانے کے لیے مشورہ دیتے، بلکہ حسب ضرورت مختلف محاذوں پر جا کر ہندستانی فوجیوں سے ملتے، ان کی حوصلہ افزائی کرتے، اور ان کی حالت کی بہتری کے لیے منصوبے بناتے اور سفارشیں پیش کرتے تھے۔

اسی سلسلہ میں ذوالفقار علی بخاری بھی لندن بلا لیے گئے۔ حکومت برطانیہ کی وزارت اطلاعات نے ایک اتحادی ادارہ نشر و اشاعت قائم کیا تھا، بخاری صاحب اسی ادارے کے ہندستانی رکن کی حیثیت سے گئے تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اس ادارے کے فرائض میں یہ بھی داخل تھا کہ مختلف ممالک کے اصحاب مجاز کو برطانی اور اتحادی پراپیگنڈے کی تائید پر آمادہ کرے۔ بخاری صاحب اس دوران میں یورپ کے کئی محاذوں پر دورے کو گئے تھے۔ اس زمانے میں انہیں عارضی طور پر ”میجر“ کا عہدہ بھی دے دیا گیا تھا۔

لندن سے واپسی کے تھوڑے دن بعد ہی ان کا تبادلہ کلکتہ ہو گیا۔ یہاں انھوں

نے بنگالی سیکھی۔ ان کا بنگالی کا علم اور معیار گجراتی اور مراٹھی سے کہیں بہتر تھا۔ اس میں بیتکلف تقریر کر سکتے تھے۔ سکتے سے انھیں پھر بمبئی جانا پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک کو آزادی ملی ہے، تو وہ بمبئی ہی میں تھے۔

لیکن درمیان میں ایک بات رہ گئی۔ وہ بمبئی میں تھے کہ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں انھیں امریکا کی مشہور فلم ساز کمپنی میٹرو گالڈون میئر نے فلمیں تیار کرنے کے لیے امریکا بلایا۔ انھوں نے حکومت سے رخصت لی اور امریکا سدھارے۔ وہاں کوئی چھ مہینے قیام رہا۔ واپس آئے، تو تقسیم ملک کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں یہ بھی پاکستان گئے اور وہاں ریڈیو پاکستان کے (یہ نام بھی انھیں کارکھا ہوا ہے) اس سے پہلے نام پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن تھا) ڈائریکٹر جنرل مقرر کئے گئے۔ وہ اس عہدے سے ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء میں سبکدوش ہوئے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی وہ اپنی وفات تک ریڈیو پاکستان سے بحیثیت مشیر وابستہ رہے۔

آخری تین چار سال دل کے عارضے میں مبتلا رہے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ علاج کے لیے لندن گئے تھے۔ علاج سے مرض میں کچھ افاقہ ہو گیا، اور وطن واپس آ گئے۔ آغاز جولائی ۱۹۷۵ء میں وہ گر گئے اور ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ آپریشن ہوا، اتنے میں دل کی تکلیف بڑھ گئی۔ اس پر اسپتال میں داخل ہوئے، جہاں ان کا ہفتے کے دن ۱۲ جولائی ۱۹۷۵ء (یکم رجب ۱۳۹۵ھ) کو انتقال ہو گیا۔ جنازہ اگلے دن اتوار کو اٹھا، اور انھیں پٹی، ایچ سو ساسٹی، کراچی کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اولاد میں تین بیٹیاں ان کی یادگار ہیں۔

بہت لوگوں نے ان کی تاریخ وفات کہی۔ نسیان اکبر آبادی کا قطعہ تاریخ ہے؛
خبر مرگ زید لے بخاری کی سن کر مری آنکھ سے ہو گئے اشک جاری
یہ تاریخ فکر رسا سے ملی ہے جہاں سے لٹھے آج زید لے بخاری“

(۱۳۹۵)

رئیس امر وہوی کے قطعے میں ”ذوالفقار حقائق پناہ“ سے ۱۳۹۵ برآسا ہوتے

ہیں۔

اس برصغیر۔ ہندوستان اور پاکستان میں ریڈیو اور براڈ کاسٹنگ کے فروغ اور ترقی میں ذوالفقار علی بخاری نے جو نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کا انکار ممکن نہیں۔ ان کی ذہانت اور طباعی کا ایک زمانہ معترف ہے۔ میں انھیں ۱۹۳۶ء سے جانتا تھا۔ اس میں شممہ بھر مبالغہ نہیں کہ ان کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، معاملہ فہمی کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ جن لوگوں کو ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، ان سے کچھ کہا جائے، تو انھیں مشکل سے اعتبار آئیگا۔

ڈراما اور موسیقی ان کے مرغوب موضوع تھے، علماً اور عملاً دونوں طرح۔ اور انھیں ان میں ایسی گہری بصیرت حاصل تھی کہ بڑے بڑے جغادری ان کا لوہا مانتے تھے۔ غالب نے ایک جگہ عیش کی تعریف یہ کی ہے کہ کسی کو اپنا دلپسند مشغلہ بطور پیشہ اختیار کرنے کا موقع مل جائے۔ یہی ذوالفقار علی کے ساتھ ہوا؛ اور وہ زندگی بھر عیش کرتے رہے۔

انھیں نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ افسوس کہ ان کی تحریریں عموماً شائع نہیں ہوئیں؛ وہ ہمیشہ ثوب سے خوبتر کی جستجو میں رہے۔ خدا کرے اب شائع ہو جائیں!

انھوں نے "حریت" کراچی کے لیے اپنی یادداشتیں قلمبند کی تھیں۔ یہ ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۴ء میں ہفتہ وار اس پرچے میں چھپتی رہیں۔ بعد کو ان کا مجموعہ "مرکز نش" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا (کراچی ۱۹۶۶ء) معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے اس کا دوسرا حصہ بھی مرتب کر لیا تھا؛ یہ بھی چھپ جانا چاہیے۔ ذوالفقار علی بخاری شعر بھی کہتے تھے۔ وہ کلاسیکی انداز کے خوش فکر شاعر تھے۔ اگرچہ وہ نئے طرز فکر سے دامن کشاں نہیں گزرتے، لیکن بنیادی طور پر انھوں نے روایتی اسلوب سے روگردانی بھی نہیں کی۔ افسوس کہ ان کا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ ذیل میں نمونے کے طور پر ان کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:

اے میرے شہر سے آنے والو! کچھ تو کہو، ہاں کچھ تو کہو
 اس شہر کے گھر آباد ہیں، یا آباد ہیں زنداں؟ کچھ تو کہو
 دامن کے چاک سے دور ہے گفتا چاک گریباں، کچھ تو کہو
 یا اب کے بھی بیع صرفہ گزری فصل بہاراں، کچھ تو کہو
 کیا جوش جنوں کا رنگ رہا؟ کیا وحشت کے سامان ہوئے؟
 یا اب کے بھی بے فیض رہی پر سی رحمت باراں، کچھ تو کہو
 کیا صبح کو اب بھی باز صبا، پیغام محبت لاتی ہے؟
 کیا شام کو اب بھی لہراتی ہے کا کل پیچیاں؟ کچھ تو کہو
 کیا بزم میں اب بھی ساغر مے سے چہرے روشن ہوتے ہیں؟
 کیا شام میں اب بھی ہوتا ہے محفل میں چراغاں؟ کچھ تو کہو
 وہ شہر کا واعظ جو ہر ایک پہ کفر کا فتویٰ جبرتا سمجھا
 کس حال میں ہے وہ مردِ خدا؟ اے مردِ مسلمان! کچھ تو کہو
 ہاں موت سبھی کو آتی ہے، ہم سب کو مرنا ہے، لیکن
 اس شہر میں زندہ رہنے کا بھی کوئی ہے امکاں؟ کچھ تو کہو
 گم کردہ راہ، خاک بسر ہوں، زرا ٹھہر
 اے تیز رو! غبارِ سفر ہوں، زرا ٹھہر
 رقصِ نمود یک دو نفسِ ادر بھی سہی
 دوش ہوا پہ مثلِ شر رہوں، زرا ٹھہر
 اپنا حرام تیز نہ کر، اے سیم زبست!
 بجھنے کو ہوں، چراغِ سحر ہوں، زرا ٹھہر
 مومِ موم سی امبا۔ ہوں، مجھ سے گریز کر
 اپنی کسی دعا کا اثر ہوں، زرا ٹھہر

سجدہ شوق کرے کون ادا، میرے بعد
آپ پھرتے رہیں، بن بن کے خدا، میرے بعد
ایک میں ہوں کہ مری یاد دلوں سے نہ مٹی
ورنہ ٹٹنے کو تو کیا کیا نہ مٹا! میرے بعد
میں ہوں سرسبز خزاں میں بھی بہاروں کی طرح
کس کو اس آتئیگی یہ آب و ہوا، میرے بعد
کس کو آتیکا اسیری میں رہائی کا مزا
کس کو پہنا تینکے زنجیر و فاء، میرے بعد

موجِ دل تہابِ طلب ہے	وصل کی شب بھی بھر کی شب ہے
تو آقا ہے، میں بندہ ہوں	تجھ سے شکوہ، سو یاد ہے
میرا جینا تیری خاطر	مرنے کا بھی کوئی سبب ہے
جس نے مجھ کو دل بخشا ہے	ساری دنیا کا وہ لب ہے
دل کا آنا، دل کا جانا	ایک سے بڑھ کر ایک غضب ہے
مجھ کو بس تیرا ہی جنوں ہے	میرے جنوں میں بھی اک ڈھب ہے
اس دنیا میں، اس دنیا میں	جس کی طلب تھی، اس کی طلب ہے
ہم ہیں اور دیوار کا سا یہ	کوئی ہمارا بھی منصب ہے
حسن کا نغمہ، اللہ اللہ!	عشق کا مطرب مہرِ لب ہے
وہ بھی میرے دست نہیں ہیں	جن سے عداوت جب تھی نہ اب ہے
دل حاضر ہے، دل کے مالک!	مالِ عرب تھا، پیشِ عرب ہے

تیرا میرا منہ تکتے ہیں	سب پیاسے ہیں، کون پلائے!
حسن کا جلوہ، اللہ اللہ!	آنکھیں دیکھیں، جی لپٹائے
ایمانوں کا اللہ بیل	جب وہ کافر سامنے آئے

اللہ رے، اشیاء پر خدا کی کشش

صحرے سے لوٹ لوٹ کے آتا ہوں گھر کو میں
ہم شناسا بحر کی تہ کے ہوئے
اور ساحل کے ستم سہ کے ہوئے
اس توقع پر رہے کاٹے عزیز
دیکھ لوں دو گل کہیں بیکے ہوئے
ہم کو دیکھو، میکدے کے دشمنو!
جو بھی کچھ ہم ہیں، یہیں وہ کے ہوئے

پھر بے گمراہیوں کی مجھ کو تلاش
پھر کوئی راہبر نہ ہو جائے
مجھ کو محفل میں باریاب کر دے
سجدہ گاہ، شاہ در نہ ہو جائے
داندان بہم شود خسر من
بجلیوں کو خبر نہ ہو جائے

غیب کی ولایت عشق، عشق کی عنایت غم
غم ہزار لغت ہے، کوئی غم کو کیا جانے!
اک صدا ہے جس پر ہم رقص کرتے رہتے ہیں
درد میں جو آجائے، زبرد ہم کو کیا جانے!
نرم میں تو ہم دونوں اجنبی سے رہتے ہیں
کوئی تم کو کیا سمجھے، کوئی ہم کو کیا جانے!

بہت ہو گئے، جو دردِ دل کو دردِ دل سمجھتے ہیں
مگر ہم دردِ دل کو زلیلت کا حاصل سمجھتے ہیں

عشق ہے آخر، موت نہیں ہے
ٹل جائیگا ٹلتے ٹلتے

تیرے الطافِ گزشتہ مجھے یاد آتے ہیں
غم فرا موش تو ہوں، لطف فرا موش نہیں

شورشِ عقل ہے برہم کن جمیعِ دل ہم تن حرف ہے تو، میں ہم تن گوش نہیں
مندرجہ ذیل ان کی آخری غزل ہے، جو انھوں نے اپنی وفات سے چند دن پہلے کہی
تھی:

شام ہو، دوست ہوں، سُبُو بھی ہو	اور خدا رکھے تجھ کو، تو بھی ہو
ذکرِ حق میں، ہوں صوفیانِ کرام	میگساروں کی یاد ہو بھی ہو
بزمِ یاراں میں، باہمہ آداب	تو ہی موضوعِ گفتگو بھی ہو
ہوا اگر تیرا طرہ دستار	گل کی گلشن میں آبرو بھی ہو
اور باتوں کے ساتھ حسبِ محل	آنکھوں آنکھوں میں گفتگو بھی ہو
کچھ تو آئے نظر، سرابِ سہی	کچھ تو انعامِ جستجو بھی ہو
ذہن کا فہمِ دل مسلمان ہے	ان میں ممکن ہے، دودھ دکنی ہو

نشر جالندھری، محمد عبدالحکیم خان

ضلع جالندھر (پنجاب) میں ایک چھوٹا سا گاؤں میاں والی مولویاں (تخصیل کو روہ) ہے؛ محمد عبدالحکیم خان وہیں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے؛ ضلع کی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ جالندھری لکھتے تھے۔ بے سستی بڑی مردم خیز رہی ہے۔ عہدِ مذلیہ کے بعض مشہور علما یہاں کی خاک سے اٹھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے مرشد حضرت بدرالدین ادلیا۔ جب کابل سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے، تو انھوں نے بھی یہیں قیام کیا تھا، بلکہ میاں والی مولویاں کی بنیاد ہی انھوں نے رکھی تھی۔

نشر کے والد مولوی محمد اشرف خان مقامی پرائمری اسکول کے صدر تھے۔ نشر کا تعلیمی دور بہت متاثر ہوا؛ اپنے درجے میں ہمیشہ اول آئے۔ دسویں کا امتحان انھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول، کوئٹہ سے پاس کیا تھا، جہاں اس وقت ان کے بھائی مولوی عبدالغفور خان مقیم تھے۔ اس امتحان میں بھی اول آئے، اور اس طرح لالہ جمعیت رائے گولڈ میڈل کے مستحق ٹھہرے، جو وہاں کے ایک رئیس لالہ جمعیت رائے نے اپنے مرحوم اکلوتے بیٹے کی یاد میں جاری کیا تھا۔ اس کے بعد وہیں اسلامیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔

شاعری بہت کمسنی میں شروع کی۔ جب ایک مرتبہ گرمی کے زمانے میں اساکہ باراں سے خلق خدا بہت پریشان تھی، ان کے استاد نے درجے کو بارش پر مضمون

لکھنے کو کہا۔ نشتر نے مضمون تو نشر میں لکھا، لیکن اس کے آخر میں اس شعر کا اضافہ کر دیا :

الہی! قبول اس کی کر لے دعائیں
کہ مینھ کو نرسنتی ہے ساری خدائی

اس وقت ان کی عمر بمشکل دس برس کی ہو گی۔ کونٹہ میں فوجی ملازمت کے امیدواروں کے لیے کیڈٹ کالج قائم تھا۔ اس میں اردو کے استاد کی جگہ خالی ہوئی۔ نشتر نے سبھی ٹیچر شپ کا امتحان پاس کر کے درخواست دے دی۔ اور مقابلے کے امتحان میں یہاں سبھی اول آئے۔ اس پر کالج کے پرنسپل نے انھیں ڈیڑھ سو روپے کے مشاہرے پر ملازم رکھ لیا۔ یہاں بعض اوقات اساتذہ کو فیلڈ سروس پر یعنی باہر بھی جانا پڑتا تھا۔ نشتر نے فیلڈ میں جانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی کے تمام راستے بند ہو گئے، اور عمر بھر ڈیڑھ سو روپے سے آگے بڑھنے کی امید نہ رہی۔ اس پر انھوں نے کچھ مدت بعد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

اس کے بعد چنڈے ”وکیل“ (امرتسر) کے ایڈیٹر رہے اور پھر لاہور آ گئے۔ اب انھوں نے مختلف ناشرین کے وہاں کام کرنا شروع کیا۔ بیسیوں کتابیں معمولی اجرت پر لکھ کر دوسروں کے حوالے کر دیں، جو ان اصحاب کے نام سے شائع ہوتیں۔ غرض ناشرین کے وارے نیارے ہوتے رہے، لیکن نشتر غریب نے زندگی بھر کبھی فارغ البالی کا منہ نہ دیکھا۔ مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ سیما اکبر آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) نے کیا تھا۔ اس کے لیے مشہور ناشر مولوی فیروز الدین (ف: اپریل ۱۹۴۹ء) نے انھیں دو پیسے فی شعر معاوضہ دیا تھا۔ سیما بے پچارے بھی کیا کرتے، اسفیس روپے کی ضرورت تھی۔ بیماری کی حالت میں سبھی انھوں نے اس کے پانچ دفتر کا ترجمہ مکمل کر دیا اور اس کے بعد کام چھوڑ دیا۔ نشتر نے نہ صرف اس ترجمے پر نظر ثانی کی، بلکہ خود چھپے دفتر کا ترجمہ اضافہ کر کے کتاب مکمل کر دی۔ یہی ترجمہ بعد کو الہام منظوم کے عنوان سے فیروز الدین اینڈ سنز کی طرف سے شائع ہوا۔

اس دوران میں نشتر نے ۱۹۲۴ء میں منشی فاضل اور ۱۹۲۵ء میں انٹر کے امتحان پاس کر لیے تھے۔ بی، اے کی تیاری کر رہے تھے کہ شادی ہو گئی۔ اس کے بعد کسبِ روزگار کا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور یوں تعلیم سے دست بردار ہونا پڑا۔ نشتر نے شروع میں کچھ دن نظمِ طباطبائی سے مشورۂ سخن کیا، لیکن جلد ہی اشناد نے فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نشتر کو جملہ اصنافِ سخن پر پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کے اپنے نام سے جو کتابیں شائع ہوئیں، ان میں سے بعض نام یہ ہیں: نشترِ ادب، روحِ ادب، شرحِ بابِ جبریل وغیرہ۔

اتوار ۲ جون ۱۹۷۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

افسوس کہ باوجود تلاش، ان کے دونوں دیوان مہیا نہ ہو سکے۔ ایک تذکرے میں تین غزلیں ملیں، انھیں میں سے چند شعر بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں۔

رخصت ہوا شباب، زمانہ گزر گیا
وہ ہم، نہ وہ جواب، زمانہ بدل گیا
پہلی سی وہ زمین نہیں، وہ آسمان نہیں
دنیا ہے جیسے جواب، زمانہ بدل گیا
ہنگامے عشق و حسن کے افسانہ ہو گئے
اللہ انقلاب، زمانہ بدل گیا
ارشاد جو حضور کا ہے، ہاں بجا، درست
بدلے نہیں جواب، زمانہ بدل گیا
نشتر جو شکوہ سخنِ تغافل ہوا کبھی
ہنس کر دیا جواب: "زمانہ بدل گیا"

یہ طرفہ بحر ہے، ساحل ہے موجِ موج اس کی
بظاہر ایک بھی ساحل نظر نہیں آتا

رواں دواں میں مسافر تلاشِ منزل میں
اگرچہ جادۂ منزل نظر نہیں آتا
یہ اشکِ اشک نہیں، تنگِ اشک ہیں، نشتر
جگر کا خون جو شامل نظر نہیں آتا

جو گلشن میں بہا رفتنہ سماں دیکھ لیتا ہوں
تو دامن دیکھ لیتا ہوں، گریباں دیکھ لیتا ہوں
نگاہ ویرانی، دورِ رخ ہیں تصویرِ محبت کے
گلستاں دیکھ لیتا ہوں، بیاباں دیکھ لیتا ہوں
خود اپنا رہنما ہوں میں، بیابانِ تمنا میں
کہ ہر ذرے میں کوئے جاناں دیکھ لیتا ہوں

منظر لکھنوی، سید منظر حسن

نجیب الطرفین یعنی دوصیالی اور ناخیاالی دونوں سلسلے امام و ہم حضرت نقی علیہ السلام سے جاملتے ہیں۔ ان کے بزرگوں میں ایک صاحب نجم الدین سب سے پہلے سبزواری سے ہندستان آئے۔ یہی لکھنؤ کے مشہور خاندان اجتہاد کے بھی مورث اعلیٰ ہیں۔ یہاں ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی، اور نصیر آباد کا علاقہ بطور جاگیر عطا ہوا۔ ایک زمانے تک خاندان نے خوشحالی کا دور دیکھا۔ لیکن کسی چیز کو وہ انہیں رفتہ رفتہ حالات بگڑتے گئے، یہاں تک کہ ان کے جد امجد سید وارث حسین صرف رئیس روضہ (ضلع رائے بریلی، یو، پی) ہو کے رہ گئے۔ منظر کے والد بزرگوار شمس الدین مولانا سید سبط حسن کسی تعارف کے محتاج نہیں، بلحاظ خطیب ان کا ملک بھر میں شہرہ تھا۔ ان کا چہنہ ۲۸ محرم ۱۳۵۴ھ (۲ مئی ۱۹۳۵ء) کو لکھنؤ میں انتقال ہوا اور وہیں امام باڑہ غفران مآب میں دفن ہوئے۔

منظر کی ٹھیک تاریخ ولادت تو معلوم نہیں ہو سکی، لیکن اندازہ ہے کہ وہ ۱۹۱۴ء کے شروع میں اپنے آبائی مکان (بنجاری ٹولہ) لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم گھر ہی پر مولانا آغا جون مرحوم کی نگرانی میں ہوئی، جو خاندان اجتہاد

ماخذ: سید باسط حسن ماہر لکھنوی؛ مرزا محمد اشفاق (شیعہ کالج، لکھنؤ)؛
کاظم علی خان صاحب (شیعہ کالج، لکھنؤ)

کے فرد تھے۔ اس کے بعد سلطان المدارس لکھنؤ میں داخلہ لیا، لیکن بدقسمتی سے اسی دوران میں ان کے والد مولانا سبط حسن کا انتقال ہو گیا؛ مجبوراً اس کے بعد انہیں تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

تعلیم نامکمل رہ جانے سے قدرتاً دنیوی ترقی کی سب راہیں بند ہو گئیں، جس سے لازماً عمر بھر قلیل، بلکہ ناکافی آمدنی میں گزارا کرنا پڑا۔ زندگی سبھ مختلف پریشانیوں کی آماجگاہ بنے رہے۔ صحت ہمیشہ متوسط درجے کی رہی، نہ بہت اچھی، نہ بُری، لیکن آرام و آسائش کے مسلسل فقدان نے رفتہ رفتہ رنگ دکھایا؛ ۱۹۷۲ء میں تپ دق میں مبتلا ہو گئے۔ کافی وسائل نہ ہونے کے باعث مناسب علاج بھی نہ ہو سکا۔ تپ دق اب مہلک نہیں رہا اور قابل علاج ہے۔ لیکن اس کا صرفہ ہنوز خاصا گراں ہے؛ اور اسی کا سامان ان کے پاس نہیں تھا۔

بالآخر اسی مرض سے ۲۲/۲۳ جون ۱۹۷۵ء کی شب میں تقریباً ڈیڑھ بجے (یعنی ۲۳ جون کے ابتدائی حصے میں) اپنے گھر پر جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔ ۲۳ جون دوپہر کے وقت امامبارہ غفران مآب (لکھنؤ کے اندرونی صحن میں) شمالی پھاٹک کے مقابل) سپرد خاک ہوئے۔

بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے، اور یہ اثر تھا خاندانی ماحول کا۔ والد کا میدان علم و فضل میں ڈنکا بجاتا تھا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، فاطمہ تخلص تھا۔ منظر کے ایک چچا مولانا ظفر ہدی ماہنامہ "سہیل مین" لکھنؤ کے مدیر تھے؛ دوسرے مولانا سید کامل حسین کامل (سکریٹری جس جعفر علی خان اثر رامپوری) شعر کہتے تھے اور مختلف علوم و فنون میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ خود منظر کے بڑے بھائی سید محمد حسن سالک تخلص اور چھوٹے بھائی سید باسط حسن ماہر بھی شعر کہتے تھے۔ (تیسرے بھائی سید محمد وارث حسن انگلستان میں مقیم ہیں) غرض یہ بھی شعر کہنے لگے۔ ساری عمر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

ان کے قطعات کا مجموعہ "ہفت رنگ" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ معلوم ہوا تھا

کہ ان کے برادرِ خرد ماہرِ صاحبِ ان کے قصائد "منظر و نظارہ" کے نام سے مرتب کر کے چھپوانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ لیکن کچھ شائع نہیں ہوا (۱۹۷۸ء) اس کے علاوہ بھی ان کا بہت غیر مطبوعہ کلام (سلام، غزل وغیرہ) ان کے خاندان میں موجود ہے۔

منظرِ مرحوم ساری عمر مجرور رہے تاہل کے جنجال میں پڑے ہی نہیں۔ بڑی بذلہِ سخن، شگفتہ اور باغ و بہارِ طبیعت پائی تھی۔ صاف دل اور مرخانِ مرغِ کسی کے بُرے میں نہیں تھے۔ اپنے قریبی حلقہٴ احباب میں سب انہیں "منظر بھیا" کہہ کر پکارتے؛ اور وہ اس سے بہت خوش ہوتے تھے۔

اَنَا لِلْمَدِّ وَأَنَا لِلْبِنَةِ رَاجِعُونَ

کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ زبان پر قدرت ہے۔ فنی پہلو سے بھی بے عیب ہے۔

چند قطعات ملاحظہ ہوں:

آبلہ دل کا پھوٹ جائیگا	رشتہ صبر ٹوٹ جائیگا
جام ہاسختوں سے چھوٹ جائیگا	مسکرا کر نہ دیکھیے، ورنہ

جو حجابات ہیں، وہ اٹھا دیجیے	دل کی خاموش دنیا جگا دیجیے
ہوسکے، تو صد پر صد دیجیے	آسے ڈھونڈتی ہے نگاہِ وفا

زرا دنیا سے ہٹا کر دیکھ لیجیے	نقابِ رخ الٹا کر دیکھ لیجیے
بہانے سے، پلٹ کر دیکھ لیجیے	اگر ہے مصلحت سے چشم پوشی

فرا کچھ محبت کے ماروں سے کہہ دو
جیہیں کس طرح جاں نثاروں سے کہہ دو

بتاؤ تو، کیا فیصلہ ہے تمہارا !
جو منہ سے نہ بولو، اشاروں سے کہہ دو

زباں سے نہ رُو دادِ غم کہہ سکیں گے
نہ ایذائے شامِ اِلم، کہہ سکیں گے
یونہی دل کے ارمان، دل میں رہیں گے
نہ تم کہہ سکو گے، نہ ہم کہہ سکیں گے

اب اذیت، اذیت نہیں ہے رحمتِ شامِ فرقت نہیں ہے
یہ ندامت سرِ قبر کیسی ! جاؤ، کوئی شکایت نہیں ہے

وقت کے ساتھ چھل کے نکل جاؤ گے
پھیر لو گے نظر، چال چل جاؤ گے
تخام کہہ ہم کیلجے کو رہ جائیں گے
تم بدلتے بدلتے، بدل جاؤ گے

حامد الہ آبادی، حامد حسین

شیوخ عہد یقی کے ایک متوسط الحال، لیکن معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ضلع الہ آباد کی تحصیل چائل میں ایک مختصر موضع ”بہکا“ ہے۔ یہ انھی کے بزرگوں نے آباد کیا تھا، جب وہ عہدِ عالمگیری کے آخری زمانے میں یہاں آکر بس گئے تھے حامد حسین جون ۱۹۳۲ء میں بہکا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم اختر حسین خاصی سماجی حیثیت کے مالک تھے۔ بزرگوں کی پیروی کر دہ جا داو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی نذر ہو گئی؛ انھوں نے اپنی محنت اور معاملہ فہمی، سوجھ بوجھ اور انتظامی قابلیت سے خاندان کو سپر سے اپنے پائو پر کھڑا کر دیا۔ اس سے املاک میں بھی وسعت ہوئی؛ اور وقار میں ترقی بھی۔

حامد حسین اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھے۔ ۱۹۵۸ء میں ان کے والد حکیم اختر حسین کسی مقدمے کے سلسلے میں کچھری گئے تھے، وہاں بھری عدالت میں کسی مخالف نے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب خاندان کی پوری ذمہ داری حامد حسین کے کندھوں پر آ پڑی۔ یہی مصیبت کیا کم تھی کہ کچھ مدت بعد ۱۹۵۹ء میں حکیم اختر حسین کے بعض مبینہ قاتلوں کا پُر اسرار طریقے پر قتل ہو گیا اور اس سلسلے میں جو بدوق استعمال ہوئی تھی، بد قسمتی سے تفتیش پر کھلا کہ وہ خود حامد حسین کی تھی (جو قاتلوں نے اسی جرم کے ارتکاب کے لیے چوری کی تھی) اس

پر حامد حسین گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور اس سلسلے میں آٹھ مہینے جیل میں کاٹنا پڑے۔ لیکن بالآخر استغاثہ جرم ثابت نہ کر سکا اور یہ باعزت بری کر دیے گئے۔

دسویں درجے تک تعلیم باقاعدہ اسکول میں پائی تھی۔ اس کے بعد ناسازگار حالات کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ملازمت کے دوران میں پرائیوٹ طور پر انسٹر اور ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات پاس کر کے آخر کار بی۔ اے کی سند بھی لے لی۔ ملازمت محکمہ تعلیم میں رہی جہاں نیک نامی سے بسر ہوئی۔

وہ شعر تو بہت ابتدا میں کہنے لگے تھے، لیکن ۱۹۵۰ء سے اس پر زیادہ توجہ دینے لگے۔ یہ شوق انھیں گویا ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والد حکیم اختر حسین بھی شعر کہتے تھے؛ اختر اور شمیم تخلص کرتے تھے۔ ان کے تین چار شعر دیکھیے جن سے ان کے اندازِ سخن کا کچھ اندازہ ہو جائیگا (اس سے مقصد یہ بھی ہے کہ اس طرح ان کے چند شعر محفوظ ہو جائیں)

حریص لذت آزار، مجھ کو دیکھ کر، ہمد!

کسی نے میرے دل میں جستجوئے لامکاں رکھ دی

حاضر ہیں آپ کے درِ دولت پہ دیر سے

ہوش و حواس، عقل و خرد، جسم و جاں سے ہم

اک بے نیازِ عشق و محبت کی یاد میں

اختر! خدا گواہ، گئے دو جہاں سے ہم

کبھی بے آئینہ جلووں کی ازانی سمجھی دیکھی ہے

اگر مقصود ہو، لاشبیشہ دل، دیکھنے والے

بساط کون و مکاں پر یقین کی چال چلا

تو راز مجھ پہ کھلا کہ کیا ہوں میں

پہلے مدتوں حامد بہکاوی کے نام سے لکھتے رہے، بعد کو احباب کے کہنے پر حامد حسین

حامد لکھنے لگے۔ الہ آباد کے ماہنامے ”شبحون“ سے اس کے روزِ اوّل سے تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اگرچہ اسخوں نے ابتداً غزل سے کی تھی، لیکن ”شبحون“ سے تعلق کے بعد نظم پر بھی توجہ کرنے لگے۔ اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ ”شبحون“ میں کبھی کبھی تبصرے بھی لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں شہرِ رنقاؤ شمس الرحمن فاروقی کے ساتھ مل کر اسخوں نے جدید شاعری کا ایک نمایندہ انتخاب ”نئے نام“ کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ اسخوں نے بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لکھا؛ ان میں سے دو کتابوں، ”ایجاوات کی کہانی“ (۱۹۷۳ء) اور ”بھارت کے نامور سائنسدان“ (۱۹۷۴ء) پر اسخیں یوپی اردو اکیڈمی نے انعام دیا تھا۔

افسوس کہ ان کا مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا، اگرچہ اس کا نام ”انسان کی خوشبو“ مشہر ہو چکا تھا۔ اس میں کچھ ان کی بے نیازی کو بھی دخل

رہا۔

۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کو معمولی بخار میں مبتلا ہو گئے؛ علاج ہونے لگا۔ انہیں متاثرِ الہ قید کے زمانے سے دل کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا، اور دل پہلے سے کمزور تھا؛ اب کچھ پیچھے بھی متاثر پائے گئے، تو علاج کے لیے میڈیکل کالج، الہ آباد میں داخل ہو گئے۔ پانچ دن تک زیست اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد ۱۷ دسمبر ۱۹۷۵ء کو رحلت کی۔ لاش ان کے وطن بہار گئی اور وہاں خاندانی قبرستان میں سپردِ خاک ہوئی۔

۱۹۵۱ء میں ان کی شادی الہ آباد کے جوار کے ایک مقام ”سیدسراں“ میں ہوئی تھی۔ جسمانی اولاد میں چار بیٹے (اعظم، معظم، اسلم، اکرم) اور دو بیٹیاں (نسرین اور تمکین) اپنی یادگار چھوڑیں۔

افسوس کہ کلام آج تک جمع نہیں ہو سکا۔ کچھ غزلیں ماہنامہ ”شبحون“ میں ملیں۔ ان کی بیاض سے کچھ کلام شمس الرحمن فاروقی صاحب نے مہیا کیا، جس کے لیے ان کا ممنون ہوں، اسی کا انتخاب بطور نمونہ پیش ہے :

پامال جنوں شہرِ تمنا بھی کرینگے
یہ شرط اگر ہے تو ہم ایسا بھی کرینگے
مستقبلِ زرّیں پہ سبھروسا بھی کرینگے
جینا ہے تو جینے کا سہارا بھی کرینگے
خاکسترا مضیٰ میں شررِ دھونڈنے والے!
کہتے ہیں کہ راہوں میں اجالا بھی کرینگے
ہم برسِ سیکار میں امروڑ کے غم سے
ہاں، ہم ہی علاجِ غم دوران بھی کرینگے
دشواریِ حالات، حوادث کے تھپیڑے
منزل کا یقین ہے تو گوارا بھی کرینگے
یہ بزم کا عالم ہے، تو پھر اہل تمنا
ساتی سے توجہ کا تقاضا بھی کرینگے
پیداریِ غم آج کہ ہر اک پہ گراں ہے
کیا اہل جہاں اس سے کنارہ بھی کرینگے؟

کتابِ شوق، لیکن بے ورق ہوں یکے از کشنگانِ ماخلق ہوں
مری پہنا تیوں کا راز سمجھو مجھ دیکھو، طبق اندر طبق ہوں
ہزاروں طور ہیں فاشاک جن سے انھیں سپا تیوں کی میں ریش ہوں

ہزاروں لفظ ہیں لیکن ہر اک کی جیب خالی ہے
یہ افلاسِ لباسِ شاعری، یارو! مثالی ہے
لگے ہیں کان آوازوں پہ، لیکن لفظ گونگے ہیں
گذرتے موسموں کی بداستان سب سے نرالی ہے
کسی تعریف ہی کی رکشانی میں آنکھ کھلتی ہے
بتانے کی ضرورت ہے، یہ کالی رات کالی ہے۔

ہمیں تنہا نہیں ہیں، جستجو کی دوڑ میں، لیکن
ہمیں سے کس لیے پھر آج ہر ذرہ سوالی ہے
یہ یکتائی ہماری، ہم سے ہی منسوب ہے، حامد !
یہ اپنی وضع، اپنی طرز خود ہم نے نکالی ہے

اک شخص تھا سواب دہ بیاباں نورد ہے
اس شہر میں ہمارے سوا کون مرد ہے
چہرہ ہر ایک مدِّ مقابل کا نورد ہے
عشقِ نبرد پیشہ طلبِ کارِ مرد ہے
یک جہتی نگاہ کو آواز کون دے
ہر دفتر خیال یہاں فرد فرد ہے
اس جستجو کی دوڑ میں یہ سبید بھی کھلا
رنگِ سخن تلاشِ معانی کی گرد ہے
غرفے سے لمحے کے جھانکیگا اصل رنگ
چہرے پہ ہم سبھوں کے اگر آبِ زرد ہے
دستِ سخن میں تیشہ باطل نہ دیکھیے
دشمن اگر چہ راہ کا ہر سنگِ سرد ہے
اس میں حرارتوں کی نسی روح پھونک دو
خواہش کی لاش ایک زمانے سے سرد ہے

یقین کی حد سے گزر کر گماں تک آئے ہیں
یہیں تو ختم نہیں راہِ جستجو، اے دوست !
روایتوں کے سمندر کو پیر کر، ہم لوگ
تمہارے بام سے، تم کو خبر بھی ہو شاید
کہاں سے اہلِ محبت کہاں تک آئے ہیں
چراغِ دل کے سہارے جہاں تک آئے ہیں
مقامِ عشقِ حقیقت نشانِ تک آئے ہیں
ہزار سنگِ سرد و ستاں تک آئے ہیں

منزل ورہ کا یقیں کیسا چل پڑے آپ تو چلتے رہیے
اپنی تشہیر کی خاطر ہی سہی گھر سے باہر بھی نکلتے رہیے
روح کی موت سے بچنے کے لیے اپنے قالب کو بدلتے رہیے

کچھ گفتگو سے اس کو سروکار بھی تو ہو یہ خامشی علامتِ اظہار بھی تو ہو
بکتے ہیں ہم بھی، کوئی خریدار بھی تو ہو بازار کی طرح کوئی بازار بھی تو ہو
جس کی بشارتیں ہیں کتابوں میں جا بجا وہ صبحِ زندگی کی نمودار بھی تو ہو
یہ کاروانِ شوق، یہ راہیں، یہ منزلیں حائل کسی جگہ کوئی دیوار بھی تو ہو
تاریکیوں میں ہم سبھی اماں ڈھونڈتے چلیں لیکن وجودِ صبح سے انکار بھی تو ہو

آؤ، ان لمحوں کو ہم لوگ مقید کر لیں
تاکہ آنکھوں میں یہ اندازِ جہاں رہ جائے
بات بننے کی نہ صورت، نہ کوئی شکل فرار
پاس لے دے کے اگر، بحرِ بیاں رہ جائے

آنکھوں کے ساتھ ذہن کا دروازہ بند کر
ہر صاحبِ کمال پر یوں نہ ہر خند کر
یہ ایسی ویسی بات نہیں ہے، گرہ میں رکھ
جو تجھ کو مل گیا، اسے مٹھی میں بند کر
وہ تیرگی کا زہر، یہ تابندگی کا قہر
اب تجھ کو اختیار ہے، جو بھی پسند کر

راشدان، م (نذر محمد)

پاکستان کے ضلع گوجرانولہ میں، وزیر آباد در لائل پور لائن پر ایک خاصا بڑا قصبہ (جو اب شہر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے)، علی پور چٹھہ ہے؛ یہ تحصیل کا صدر مقام بھی ہے تقسیم ملک سے پہلے اس کا نام ”اکال گڑھ“ تھا۔ اس زمانے میں یہاں کا مولویوں کا خاندان عمائد میں شمار ہوتا تھا۔ (شاید اب بھی ہو)۔ اگرچہ یہ لوگ قوم کے جموعہ تھے، لیکن انھوں نے دینیات کو اپنا پیشہ بنایا، اور پشتوں تک بنو و محراب کے مکین رہے۔ سکھوں کے عہد میں ان کی خاصی عزت تھی اور ان کا یہ مقام انگریزی زمانے میں بھی قائم رہا۔ اسی خاندان کے ایک فرد جناب فضل الہی چشتی صوبے کے محکمہ تعلیم میں ملازم تھے۔ وہ بتدریج ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کے عہدے تک پہنچے اور وہیں سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے: نذر محمد اور عبد الماجد۔ یہی نذر محمد بعد کو، نام راشد کے نام سے دنیا سے شعرا و ادب میں مشہور ہوئے۔ ماجد صاحب بھی مدتوں محکمہ تعلیم سے منسلک رہے۔ وہ کسی زمانے میں ملتان میں سیکنڈری تعلیم کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ آج کل غالباً کسی ناشر کتب کے یہاں نوکر ہیں

راشد صاحب یکم اگست ۱۹۱۰ء کو اکال گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ”خضر عمر“ تاریخی

۷ ایک صاحب نے مقام ولادت ”کیلیان والا“ کہا ہے یہ سچبک نہیں

نام ہے جس سے (۱۹۱۰ء) نکلتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول میں پائی، جہاں سے ۱۹۲۶ء میں دسویں کی سند ملی۔ اس کے بعد گورنمنٹ انسٹرکٹ لائٹل پور پہنچے، اور ۱۹۲۸ء میں وہاں کا نصاب مکمل کر کے لاہور چلے آئے اور گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہیں سے چار برس بعد ۱۹۳۲ء میں ایم اے (اقتصادیات) کی سند حاصل کی۔

ان کی شعر گوئی اکال گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں شروع ہو چکی تھی۔ روایت ہے کہ انھوں نے سب سے پہلی نظم ۱۹۱۷ء میں "انسپکٹر اور مکھیاں" کے عنوان سے سات برس کی عمر میں کہی۔ ہوا یہ کہ ایک انسپکٹر صاحب ان کے اسکول کا مہمانہ کرنے کے لیے آئے۔ ان کے سر کے گرد مکھیوں کا جھرمٹ منڈلا رہا تھا، جو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ان کے ساتھ منتقل ہوتا رہا۔ یہ نظارہ دیکھ کر نذر محمد کو سخت تعجب ہوا اور اس پر انھوں نے یہ نظم لکھی۔ اس نظم میں انھوں نے اپنا تخلص "گلاب" لکھا تھا۔ ان کے والد جناب فضل الہی نے نظم دیکھی، تو بہت خوش ہوئے اور اس پر بیٹے کو ایک روپیہ انعام دیا۔ خود ان کے والد (یعنی راشد کے دادا) جناب غلام رسول جو پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے، اور اردو، فارسی میں شعر بھی کہتے اور "غلامی" تخلص کرتے تھے، جناب فضل الہی نے بیٹے کی یہ نظم اپنے آبا کی خدمت میں بھیج دی۔ دادا نے اس پر ہونہار پونے کو یہ شعر لکھا:

میرے میاں گلاب! دہن میں گلاب ہو

خوشبو سے تیری بابا ترا فیضیاب ہو

اور کہا کہ شعر گوئی سے اجتناب کرو، ورنہ کسی کام کے نہیں رہو گے؛ بس اپنی تعلیم سے کام رکھو۔ لیکن یہ نشہ ایسا نہیں، جسے ٹرشی اتار دے۔ چنانچہ ان کا یہ مشغلہ جاری رہا۔ کالج پہنچے، تو اس شوق نے اور ترقی کی اور نچنگی اختیار کر لی۔ گورنمنٹ کالج، لاہور کے زمانے میں یہ کالج کی بزم سخن کے سکتر اور کالج کے

ماہانہ رسالے ”راوی“ کے اردو حصے کے مدیر مقرر ہو گئے۔ اسی زمانے میں ان کی غزلیں اور نظمیں ہمایون اوزنگار میں بھی شائع ہوئیں۔ وہ نشر بھی لکھتے تھے؛ اس میں زیادہ توجہ تنقید پر تھی۔ غرض کہ کالج سے فارغ ہونے سے پہلے وہ لاہور کے ادبی حلقوں میں شاعر اور ادیب کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے۔

اس زمانے میں وہ ”راشد وحیدی“ کے نام سے لکھتے رہے۔ یہ نسبت اسٹخوں نے اپنے خاؤ محمد وحید کیلانی سے اظہارِ ارادت کے طور پر اختیار کی تھی۔ کیلانی صاحب بھائی دروازہ، لاہور کے اسلامیہ ہائی اسکول میں مدرس ثانی (سیکنڈ ماسٹر) تھے۔ ۱۹۲۳ء میں نیرنگ خیال جاری ہوا؛ اور واقعاً ”ستارۂ درخشندہ و ماہ کامل شذالی بات ہو گئی۔ تاثیر اس کے ایڈیٹر تھے۔ ان کے ساتھ پورا ”نیازمندان لاہور“ کا حلقہ ان کی پشت پر؛ چغتائی کی مصوری کے شاہکار بھی ہر شمارے میں شامل ہوتے۔ اور ان تمام خوبیوں کے باوجود چندہ صرف تین روپے لائے! چھ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ پرچے کی اشاعت پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس پر بعض اور اصحاب کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ حافظ محمد عالم نے ”عالمگیر“ اور وحید کیلانی نے ”قوس قزح“ جاری کیے۔ ”عالمگیر“ تو چل نکلا، کیونکہ حافظ محمد عالم کا اپنا مطبع تھا اور ان کی مالی حالت بھی بودی نہیں تھی؛ لیکن ”قوس قزح“ نے دو ہی برس (۱۹۲۷-۱۹۲۹ء) میں دم توڑ دیا۔ خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا، جو ذرا طویل ہو گیا۔ کہ یہ رہا تھا کہ ن، م راشد ان دنوں راشد وحیدی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ راشد تخلص بھی کیلانی صاحب ہی نے دیا تھا۔

کالج کے دور میں وہ اسی نام سے روایتی شاعری کرتے رہے۔ اس زمانے میں وہ اختر شیرانی (ف: ستمبر ۱۹۲۷ء) اور روش صدیقی (ف: جنوری ۱۹۷۱ء) اور سید عابد علی عابد (ف: جنوری ۱۹۷۱ء) کے زیر اثر رہے، بلکہ ایک مرتبہ روش صدیقی نے خود مجھ سے کہا تھا کہ ابتدا میں راشد نے اپنے کلام پر ان سے اصلاح

لی۔ لیکن جلد ہی وہ روایتی عشقیہ اور غنائیہ شاعری کو ترک کر کے میراجی (ف: نومبر ۱۹۴۰ء) اور تصدق حسین خالد کے ساتھ مل کر آزاد نظم نگاری کرنے لگے۔

ایم اے کرنے کے بعد اپنی افتادِ طبع کے باعث، انھوں نے چاہا کہ والد کے اثر سے کہیں محکمہ تعلیم میں ملازمت مل جائے۔ جناب فضل الہی اس زمانے میں شیخوپورہ میں تعینات تھے۔ یہ ان کے پاس پہنچے، لیکن یہاں کوئی کامیابی نہ نہ ہوئی۔ جلد ہی والد کا تبادلہ ملتان ہو گیا، اور یہ بھی ان کے ساتھ وہاں چلے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب حکومت پنجاب نے دیہات سدھار کا کام وسیع پیمانے پر شروع کر رکھا تھا۔ (سر) مالک ڈارنگ اس محکمہ کا کڑا دھڑا اور مسٹر برین ان کے دستِ راست تھے۔ من جملہ ادبیاتوں کے مختلف مقامات سے ایسے رسالے شائع ہونے لگے جن میں دیہاتی زندگی کی بہتری اور دیہاتیوں کی بہبودی کے موضوع پر مضامین چھپتے تھے۔ اسی طرح کا ایک ماہنامہ "مخلتان" ملتان سے بھی نکلتا تھا۔ راشد اس کے ادارہ تحریر سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں وہ دو برس رہے، اور پھر ۱۹۳۴ء میں واپس لاہور آ گئے۔

لاہور کے علمی حلقوں میں وہ اجنبی نہیں تھے۔ مولانا احسن اللہ خان تاجور بنجیب آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) اس زمانے میں اپنا مشہور ماہنامہ "شاہکار" شائع کرتے تھے۔ انھوں نے راشد کو "نائب مدیر" کی جگہ پیش کی۔ شاہرہ صرف ۳۵ روپے تھا، لیکن مرتا کیا نہ کرتا، تنخواہ کم ہونے کے باوجود راشد نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ مگر یہاں کی فضا سے جلد ہی دل اچاٹ ہو گیا۔ تاجور نے رسالے کا کاروباری صیغہ اپنے برادرِ نسبتی سلیمان خان کے سپرد کر رکھا تھا؛ راشد کی ان سے کسی بات پر چل گئی۔ تنخواہ پہلے ہی ناکافی تھی؛ ۱۹۳۵ء میں شادی بھی ہو گئی تھی جس سے ذمہ داریاں المضاعف ہو گئیں۔ انھوں نے تنخواہ میں اضافے کی درخواست کی، جو مولانا تاجور نے رد کر دی۔ اس پر دل برداشتہ ہو کر راشد نے استعفیٰ دے دیا اور ملتان کی راہ لی؛ اور وہاں کمشنر کے دفتر

میں کلرک بن گئے۔

ملتان کے زمانہ قیام کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے:
یہ خاکسار تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ یہ تحریک علامہ عنایت اللہ مشرقی (ف)؛
اگست ۱۹۶۳ء میں شروع کی تھی۔ یہاں اس کے حسن و قبح پر بحث
کرنا بھل ہوگا۔ جن لوگوں نے اس زمانے میں خاکساروں کو خاکی وردی ڈالنے،
کندھوں پر سیلچے رکھے، بازاروں میں فوجی مارچ کرتے دیکھا ہے، وہی کچھ ان کے
عرائم کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ راشد شروع سے نظم و ضبط کی زندگی کے قائل
رہے تھے۔ انہیں خاکساروں کی تنظیم اور باقاعدگی بہت پسند آئی۔ غرض وہ
اس تحریک میں شامل ہو گئے اور رفتہ رفتہ ضلع بھر کے رضا کاروں کے سالار
کے عہدے تک پہنچ گئے۔ لیکن ان لوگوں کی آمریت ان کے حلق سے نہ اتر سکی
اور سال ہی بھر بعد وہ اس سے الگ ہو گئے۔

ملتان کا یہ زمانہ ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ انہوں نے اپنی آمدنی میں اضافے
کی غرض سے روسی مصنف ایگنرینڈ کوپرین کے ناول ”یاما“ کا اردو میں ترجمہ
کیا کہ شاید اس سے کچھ یافت ہو لیکن ناشر نے انہیں ایک جیبہ بھی نہ دیا، بلکہ
کتاب پر سنجیت مترجم ان کا نام تک شائع نہیں کیا۔

انقصہ صورت حال سخت نا پسلی بخش تھی۔ خانہ داری کی روز افزوں دہم داریاں،
تنخواہ قلیل، اور کام ان کے مذاق کے بالکل خلاف۔ ان کے لیے ملتان میں کوئی
اور کشش بھی نہیں رہی، لیکن احتیاج انسان کو سب کچھ برداشت کر لینے
پر مجبور کر دیتی ہے۔ بہر حال وہ یہاں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔
اور بالآخر مئی ۱۹۶۳ء میں آل انڈیا ریڈیو، لاہور کے دفتر میں پروگرام اسٹنٹ
کی نوکری مل گئی۔ چند ہفتے بعد اسی عہدے پر دلی تبادلہ ہو گیا اور یہاں
ترقی کر کے پروگرام ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۶۹ء میں دوسری
جنگ عظیم شروع ہو گئی اور ریڈیو کے محکمے کے ڈائریکٹر جنرل سید احمد شاہ

بخاری "پطرس" مرحوم (ف: دسمبر ۱۹۵۸ء) نے ادیبوں کی کھیپ کی کھیپ کو فوج میں عارضی کمیشن دلو کر محکمہ تعلقات عامہ میں بھرتی کرادیا۔ اسی ریے میں راشد سحبی کپتان بن گئے اور عراق، ایران، مصر، سری لنکا (سبلون) میں چار برس گزار کر وسط ۱۹۶۴ء میں وطن واپس آئے، اور دوبارہ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ تھوڑے ہی دن لکھنؤ میں اسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر رہے تھے کہ ملک تقسیم ہو گیا اور وہ پاکستان چلے گئے۔ پشاور اور لاہور میں دو ڈھائی سال گزارنے کے بعد ان کا ریڈیو پاکستان کے مرکزی دفتر کراچی میں بحیثیت مدیر تعلقات عامہ تقرر ہو گیا۔ اس کے بعد کوئی دو سال پشاور میں ریجنل ڈائریکٹر بھی رہے۔

۱۹۵۲ء میں انھیں اقوام متحدہ (نیویارک) میں ملازمت مل گئی۔ اس سلسلے میں انھوں نے نیویارک، انڈونیشیا، پاکستان، ایران میں ۱۵-۱۶ برس گزارے ۱۹۷۴ء میں ملازمت سے پینشن پر سبکدوش ہوئے، تو مستقل سکونت انگلستان میں اختیار کر لی۔ پہلے لندن میں ایک کرایے کے مکان میں مقیم رہے؛ ۱۹۷۵ء کے اواخر میں "چیلٹن ہم" میں اپنا مکان خرید لیا۔

ان کی پہلی بیوی ان کے ماموں کی بیٹی تھیں۔ اس بیگم سے ان کے پانچ بچے ہوئے، چار بیٹیاں: نسرتین، یاسمین، شاہین اور تمزمین؛ اور ایک بیٹا: شہریار۔ بفضلہ سب بچے زندہ ہیں۔ شہریار پاکستانی سفارتخانہ برسلز (بلجیم) میں ملازم ہیں۔ (۱۹۷۵ء) بڑی دونوں لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے۔

اس بیگم کا اکتوبر ۱۹۶۱ء میں انتقال ہو گیا۔ اس زمانے میں وہ نیویارک میں مقیم تھے۔ یہاں ان کی چھوٹی بچی تمزمین یو این او کے اسکول میں پڑھتی تھیں۔ اسکول میں اس کی استانی مس شیلانجیلینی تھیں۔ اس خاتون کے والد اطالوی نسل کے اور ماں انگریز ہے۔ وہ خود ڈریسڈر ٹیچر ہیں۔ مدتوں روما (اطالیہ) کے انٹرنیشنل اسکول میں پڑھاتی رہیں اور جس زمانے میں راشد نیویارک میں تھے،

یہ وہاں یو، این، او کے انٹرنیشنل اسکول میں ملازم تھیں۔ جب راشد کی بیوی کا انتقال ہو گیا، تو انھوں نے دو سال بعد ستمبر ۱۹۶۳ء میں ان سے شادی کر لی۔ ان کے بطن سے ۱۹۶۷ء میں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انھوں نے 'نزیل' رکھا۔

جون ۱۹۷۵ء میں ان کے خسر مسٹر انجیلینی کا لندن میں انتقال ہو گیا، اور ان کی لاش جنوبی لندن کے برقی شمشان میں جلائی گئی۔ راشد بھی جنازے کے ساتھ تھے۔ جب لاش جل رہی تھی انھوں نے وہاں کے منتظمین سے دریافت کیا کہ اس کا طریقہ کیا ہے؟ جب انھیں بتایا گیا، تو کہا یہ تو بہت آسان اور عافیت مندرجہ ذیل ہے۔ بیوی سے کہنے لگے کہ جب میں مروں، تو میری لاش بھی اسی طرح جلائی جائے۔ یہ بات انھوں نے بیوی سے پھر ایک موقع پر دہرائی، بلکہ جب ان کا بیٹا شہر یار برسلسز سے ملنے کو لندن آیا، تو اس سے بھی کہا کہ "میاں، میرے مرنے پر میری لاش برقی شمشان میں جلا دینا۔"

مسز شیدا راشد کا بھائی روما میں تھا۔ اس کی موت کا تار ملنے پر وہ روما چلی گئیں۔ روانگی سے پہلے انھوں نے راشد سے کہا تھا کہ آپ بعد کو میری والدہ کو ساتھ لے کر روما آجائیے گا۔ راشد ۹ اکتوبر کو اپنے مسکن چیلٹن ہم سے وان اسٹیڈ آئے۔ اسٹیشن پر اترنے کے بعد وہ بکس ہاتھ میں لیے پیدل اپنی خوشدامن کے مکان گئے۔ انھیں انجانا کی شکایت پہلے سے تھی۔ ہاتھ میں بوجھل بکس لیے تقریباً میل بھر کے اس پیدل سفر نے انھیں بالکل نڈھال کر دیا۔ منزل مقصود پر پہنچنے کے کوئی دس منٹ بعد شام کے ساڑھے سات بجے ان پر دل کا دورہ پڑا اور اس سے پیشتر کہ کوئی طبی امداد پہنچ سکے، وہ جاں بحق ہو گئے۔ یکم روما سے اور بیٹا شہر یار برسلسز سے آئے تو ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۵ء دن کے چار بجے ان

۵۔ یہ نام انھوں نے اپنے نام (نذر محمد) کے پہلے حصے، اور بیوی کے نام (شیدا) کے آخری حصے سے ترکیب دگر بنایا ہے (وہ بیوی کو شیل کے نام سے پکارتے تھے) یوں عربی میں نزیل کے معنی ہیں، مہمان

کے جسدِ خاکی کو ان کی خواہش کے مطابق، جنوبی لندن کے برقی شمشان میں نذر آتش کر دیا گیا۔

چونکہ لاش کا جلانا، اسلام کی روایات کے خلاف ہے، اس لیے لندن میں مقیم بیشتر مسلمانوں نے تجہیز و تکفین اور جنازے میں شمولیت نہیں کی تھی۔ مشکل سے آٹھ دس آدمی جنازے کے ساتھ تھے اور وہ بھی ان کے ذاتی دوست۔

راشد کے تین مجرے چھپ چکے ہیں: (۱) ماورا (۱۹۴۲ء)؛ (۲) ایران میں اجنبی (۱۹۵۵ء)؛ (۳) لا = انسان (۱۹۶۹ء)۔ بعد کا کلام بھی مدون شدہ موجود ہے، اور یقیناً چھپ جائیگا۔ اس کے علاوہ اسخوں نے بعض ترجمے کیے تھے، ان میں سے بھی تین شائع ہو چکے ہیں۔ کوپرین کے ناول ”یاما“ کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ولیم سیروین کے ناول (Mama, I love you) کا ترجمہ اور لورین آیزلے کا ناول (وقت کا آسمان) بھی چھپ چکے ہیں۔ آخری زمانے میں وہ جدید فارسی کا وسیع مطالعہ کر رہے تھے، اور اسخوں نے ۲۰-۲۲ ایرانی رشاعروں کی تخلیقات کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا؛ یہ تراجم بھی شائع ہو رہے ہیں۔

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ جب ۱۹۴۲ء میں ان کا پہلا مجموعہ ”ماورا“ شائع ہوا ہے، تو ادبی اور تنقیدی حلقوں میں گویا بھونچال سا آگیا۔ اس سے پہلے ہیئت کے تجربے تو ایک زمانے سے ہو رہے تھے؛ لیکن کہا گیا کہ اسخوں نے صنعتِ ابہام کو بددینا حد تک استعمال کیا ہے اور خنثی عریانی کھلے بندوں ان کے ہاں ہے، اتنی اس سے پہلے کہیں اور نہیں ملتی۔ یہ جارحانہ تنقید بیشتر ان اصحاب کی طرف سے ہوئی، جو وکٹوریائی عہد کے اخلاقی قواعد و ضوابط کے زیر اثر عورت اور اس کے منسلقات کا برسرِ عام ذکر بھی بد اخلاقی (بلکہ گناہ) تصور کرتے تھے۔ حیات النصارى نے تو اپنی تنقید ”نم راشد پر“ کے عنوان سے کتاپے کی شکل میں شائع بھی کر دی تھی۔ (دلی نومبر ۱۹۴۵ء) لیکن دھن کے پگے راشد نے ان مخالفانہ حملوں کی پروا نہ کی، اور اپنی انتخاب کردہ راہ پر گامزن رہے۔ ”لا = انسان“ کے شروع میں

ان کا ایک طویل مصاحبہ (انٹرویو) چھپا ہے، جس سے ان کی شاعری کے کئی گوشے روشنی میں آتے ہیں، اور اس سے ان کے کلام کے سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ بہر حال، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو شاعری کی تاریخ میں راشد کا مقام محفوظ ہے۔

نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

بوسے آدم زاد

بوسے آدم زاد آئی ہے کہاں سے ناگہاں ؟
دیو اس جنگل کے ستارے میں ہیں
ہو گئے زنجیر پا خود ان کے قدموں کے نشاں !

یہ وہی جنگل ہے جس کے مرغزاروں میں سدا
چاندنی راتوں میں وہ بیخوف و غم رقصاں رہے
آج اسی جنگل میں ان کے پاؤں شل ہیں، ہاتھ سرد
ان کی آنکھیں نور سے محروم، پتھرائی ہوئی
ایک ہی جھونکے سے ان کا رنگ زرد
ایسے دیوؤں کے لیے بس ایک ہی جھونکا بہت
کون ہے بابِ نبرد ؟

ایک سایہ دیکھتا ہے چھپ کے ماہ و سال کی شاخوں سے آج
دیکھتا ہے بے صدا، زولیدہ شاخوں سے انہیں
ہو گئے ہیں کیسے اس کی بوسے اتر حال دیو
بن گئے ہیں موسم کی تمثال دیو

ہاں اتر آتیکا آدمزادان شاخوں سے رات
حوصلے دیووں کے مات !

گداگر

جن گذرگا ہوں پہ دیکھا ہے نکا ہوں نے لہو
یا سیہ عورت کی آنکھوں میں یہ سہم
کیا یہ ادبچے شہرہ جائینگے بس شہروں کا دہم
میں گداگر اور مرا دریوزہ فہم

راہ پیمانی عصا اور عافیت کوشی گدا کا لنگ پا،
آرہی ہے ساحروں کی، شعبدہ سازوں کی صبح
تیز پا، گرداب آسا، ناچتی، بڑھتی ہوئی
اک نئے سدرہ کے نیچے، اک نئے انساں کی ہو
تابہ کے روکینگے ہم کو چار سوا !

کیا کہینگے اس نئے انساں سے ہم
ہم تھے کچھ انساں سے کم ؟
تنگ پر کرتے تھے ہم بارانِ تنگ
سختی ہماری ساز و گل، نغمہ و نکہت سے جنگ
آدمی زادے کے سایے سے بھی تنگ ؟

داشته

میں ترے خندہ بیباک سے پہچان گیا
کہ تری رُوح کو کھاتا سا چلا جاتا ہے

کھوکھلا کرتا چلا جاتا ہے، کوئی الم زہرہ گداز؛
میں تو اس پہلی ملاقات میں یہ جان گیا

آج یہ دیکھ کے حیرت نہ ہوئی
کہ تری آنکھوں سے چپ چاپ برسے نئے اشکوں کے سحاب
اس پہ حیرت تو نہیں تھی، لیکن
کسی دیرانے میں سمٹے ہوئے خوابیدہ پرندے کی طرح
ایک مبہم سا خیال
دفعۃً ذہن کے گوشے میں ہوا بال فشاں
کہ تجھے میری تمنا تو نہیں ہو سکتی
آج لیکن مری باہنوں کے سہارے کی تمنا ہے ضرور
یہ ترے گریہ مناک سے میں جان گیا —
تجھ سے وابستگی شوق بھی ہے
ہو چکی سینے میں بیدار وہ دلسوزی بھی
مجھ سے، مجھ پر ازل جس پہ ہیں مجبورِ ازل!
نفسِ خود ہیں کی تسلی کے لیے
وہ سہارا بھی تجھے دینے کو آمادہ ہوں
تجھے اندوہ کی دلدل سے جو آزاد کرے!
کوئی اندیشہ ہے تو یہی
تیرے ان اشکوں میں اک لمحہ کی نو میدی کا پرتو ہو لیکن
اور جب وقت کی امواج کو ساحل مل جائے
یہ سہارا تری رسوائی کا اک اور بہانہ بن جائے
جس طرح شہر کا وہ سب سے بڑا مردِ لیم

جسم کی مُزد و شبانہ دے کر
بن کے رزاق، تری تذلیل کیے جاتا ہے
میں بھی باہنوں کا سہارا دے کر
تری آئینہ کی توہین کا مجرم بن جاؤں
سبا ویران

سیماں سربز انو اور سبا ویران
سبا ویران، سبا آسب کا مسکن
سبا آلام کا انبارِ بے پایاں
گیاہ و سبزہ گل سے جہاں خالی
ہوائیں تشنہِ باراں
طیور اس دشت کے منقارِ زیرِ پَر
تو سرمہ در گلو انسان
سیماں سربز انو، اور سبا ویران

سیماں سربز انو، نرِ شتر و غمگین، پریشاں مُو
جہانگیری، جہانباہی، فقط طرّامہ آہ
محبتِ شعلہ پُراں، ہوس بوسے گلِ بے بُو
نہ زانِ دہر کمتر جو
سبا ویران کہ اب تک اس زمین پر ہیں
کسی عیار کے غارتگروں کے نقشِ پایاں
سبا باقی، نہ ہر دے سبا باقی
سیماں سربز انو

اب کہاں سے قاصدِ فرخندہ لے آئے
کہاں سے، کس سب سے کاسۂ پیری میں لے آئے

شورش کشمیری، عبدالکریم (آغا)

ان کا خاندان کشمیری، ذات برہمن، گوت ڈار تھی۔ بزرگوں میں کوئی مشرف باسلام ہو گیا تھا، غالباً ان کے پردادا سرینگر سے مہاراجا گلاب سنگھ کے عہد میں قفل مکان کر کے امرتسر (پنجاب) میں آئے تھے۔ لیکن ان کے دادا (امیر بخش) کسی بات پر ان سے ناراض ہو کر لاہور چلے آئے، اور ایک دوڑ (انارکلی) پر ایک تھوڑا سا کشمیری باقر خانی اور قلعے بچنے لگے۔ خوب کمایا اور خوب اڑایا۔

ان کے دو بیٹے تھے: ایک عبدالکریم کے والد نظام الدین (ف: ۱۳ اپریل ۱۹۵۶ء) اور دوسرے ان سے بڑے جن، کا عین عنضوان شباب میں بعمر ۱۶-۱۷ سال تپ محرقہ سے انتقال ہو گیا۔ باپ کی توئم پرستی نے انہیں سمجھایا کہ بیٹا اس لیے ہاتھ سے نکل گیا کہ سروت لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتا تھا۔ انہوں نے حفظ و تقدم کے طور پر چھوٹے بیٹے کو اسکول سے اٹھا لیا کہ اس پر کوئی آنچ نہ آئے۔ اکڑتا بیٹا اور گھر میں فراغت، لاڈ چاؤ کی کمی نہیں تھی۔ لیکن جابل رہ گیا کوئی ستر بھی نہ سیکھا۔ جب تک باپ کا کامیاد عروج پر رہا، یہی عیش کرتے رہے۔ لیکن باپ کے جو بچھن تھے، ان کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی کفایت نہیں کر سکتا تھا۔ دوپہر ڈھلنے لگی تو فکر ہوئی کہ بیٹا کیا کر گیا! ایک دوست کی وساطت سے ایک مین کے کا درخانے میں ملازم ہو گئے۔ دو ایک سال میں یہاں چل نکلے، تو ریلوے ورکشاپ میں جگہ مل گئی۔ لیکن بعد کو پرانے کا درخانے کے مندر مالک کے اصرار پر واپس چلے

آئے، اور پھر کہیں اور نوکری نہیں کی۔

عبد الکریم ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو لاہور میں پیدا ہوئے، تعلیم دیوساج ہائی اسکول، انارکلی لاہور میں پائی۔ ۱۹۲۷ء۔ ۱۹۲۸ء کا ہندوستان سیاسی سرگرمیوں کے باعث شعلہ رجوالہ بنا ہوا تھا۔ سامن کیشن میں کسی ہندوستانی کا شامل نہ کرنا پورے ملک نے اپنی توہین تصور کیا اور اس سے تحریک آزادی کی رفاہ اور تیز ہو گئی۔ نوجوانوں پر اس کا خاص طور پر بہت گہرا اثر ہوا۔ شہر شہر خفیہ اور دہشت پسند جماعتیں قائم ہو گئیں۔

اسی زمانے میں عبدالکریم نے ایک ہندو دوست کے ساتھ مل کر "بال بھارت سمجھا" قائم کی۔ عبدالکریم نے بہت کم عمری میں مولانا ظفر علی خان (ف: نومبر ۱۹۵۶ء) کے دو زمانے "زمیندار" کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ یہ اخبار گھر میں آتا تھا، ان کی دادی ان سے پڑھا کرتی تھیں۔ عبدالکریم نے یہ عادت انھیں سے لی۔ زمیندار کی زبان، ظفر علی خان کی خطابت اور صحافتی شاعری۔ ان سب باتوں کا نوجوان عبدالکریم کے کردار اور مستقبل کی تشکیل میں بڑا اثر تھا۔

اب عبدالکریم باقاعدہ سیاسی تحریک میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے سب سے پہلی تقریر جولائی ۱۹۳۵ء میں شہید گنج کے منگامے کے دفن میں شاہی مسجد لاہور میں کی۔ اس تقریر قیام کر لیے گئے، مقدمہ چلا، اور دو سال قید اور تین سو روپے جرمانے کی سزا ملی۔ لیکن اپیل میں جرمانہ معاف ہو گیا، اور یہ ایک ماہ کی حوالات اور تین ماہ کی قید کے بعد رہا ہو کر گھر آ گئے۔

لیکن اس کے بعد جیل جانا گویا آئے دن کی رسم بن گئی۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک ہر سال چند مہینے جیل میں گزرے، اور ستمبر ۱۹۳۹ء سے آخر ۱۹۴۴ء تک مسلسل پانچ سال، اگرچہ مناسبات برس کی ہونی تھی۔ حالات کی سنگینی کا کچھ اندازہ اس سے سمجھیے کہ ۱۹۴۴ء تک یعنی جب ان کی عمر صرف ۲۷ برس کی تھی، وہ اس کا ایک تہائی (یعنی ۹ برس) جیل میں بسر کر چکے تھے۔ فروری ۱۹۳۹ء میں وہ مجلس احرار میں شامل

ہو گئے۔

اب سوال یہ تھا کہ لسراوقات کی کیا صورت ہو۔ ان کی صلاحیتوں اور اقتدا طبع کو دیکھتے ہوئے احباب نے سوچ بچار کے بعد طے کیا کہ ان کے لیے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا جائے۔ ایک ہمدرد مخیر دوست نے دوا خیر اردو پے کا عطیہ دیا جس سے "مکتبہ احرار" کے نام سے ایک ادارہ وجود میں آیا۔ لیکن یہ نام ہی اسے لے ڈوبا۔ شہید گنج کے قیضے کے بعد مجلس احرار کی ساکھ عوام میں کوڑی بھر کی نہیں رہی تھی۔ اب بھلا ان کے نام پر قائم کردہ ادارہ کیونکر کامیاب ہو سکتا تھا! نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ اس مکتبے کی طرف سے تین کتابیں شائع ہوئیں، لیکن نفع جو کھی رہا ہو، عبد الکریم کو اس میں سے ایک پائی نہیں ملی۔ رفتہ رفتہ سارا سرمایہ بھی منتطوں کی سہل انگاری اور نا تجربہ کاری کے باعث ضائع ہو گیا۔

اب سب لوگ ان سے شادی کے لیے اصرار کرنے لگے۔ بالآخر ۲ مئی ۱۹۳۵ء کو ان کی ابنائے میں شادی ہو گئی۔ دلہن (خورشیدہ) ان کے ماموں کی بیٹی تھیں۔ یہ انھیں لے کر لاہور واپس پہنچے، تو دعوت ولیمہ میں دوسرے احباب کے ساتھ مولانا ظفر علی خان بھی تھے۔ انھوں نے ادباً تین شعر کا قطعہ کہا:

گجر دم بیکے قاصد یہ مسرت زہا پیام آیا
کہ ابنائے سے شوہر ش ایک پھندا سی ڈھن لایا
مرے دل سے دعا نکلی کہ اس جوڑے کے سر پر ہو
نئی کی رحمتوں کا اور خدا کے فضل کا ساتا
مبادک ہو تھیں شوہر ش! یہ تیری خانہ آبادی
تسے گھر آگئی اک اور انگریزوں کی فریاد

بعض وجود بہت باہرکت ہوتے ہیں، خاص طور پر بیوی۔ ذمے داری بڑھ جاتی ہے اور انسان میں کام کرنے کا نیا ولولہ اور نئی انگ پید ہو جاتی ہے۔ یہی صورت یہاں بھی پیش آئی۔ شادی کے بعد عبد الکریم نے انتہائی سنجیدگی اور فرض شناسی کے احساس سے مستقل

آمدنی کے وسائل پیدا کرنے پر توجہ کی، اور بفضلہ اس میں انھیں کامیابی ہوئی۔ انھوں نے مختلف ناشرین کے ہاں سے اجرت پر کام کیا۔ ان کے مسودوں کی تصحیح، ترتیب، نظر ثانی کے علاوہ خود بھی کچھ لکھتے، اور اس طرح چار پانچ سو روپے ماہانہ یافت ہونے لگی۔ پھر مشہور کانگریسی لیڈر لالہ پٹی داس (ف، جولائی ۱۹۶۹ء) کے داماد پر پودھ چندر کے رجوع کرنے میں وزیر پنجاب بھی رہے، ساتھ مل کر ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (ف، فروری: ۱۹۵۸ء) کی مشہور کتاب 'غبارِ خاطر' کا دوسرا ایڈیشن (جس میں موسیقی سے متعلق ایک خط کا اضافہ تھا) اسی ادارہ نے شائع کیا تھا۔ اس ادارے کی طرف سے بعض اور کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں، لیکن تقسیم ملک میں اس کا سارا اثاثہ برباد ہو گیا۔

آزادی ملک سے پہلے مجلس احرار کی طرف سے تھوڑی مدت کے لیے ایک روزنامہ 'آزاد' نکلا تھا۔ اس کے شعبہ ادارت میں کئی نام تھے، لیکن یہ امر واقع ہے کہ اس کا بیشتر کام شورش ہی کرتے تھے۔ لیکن یہ پرچہ دولت مستعمل ثابت ہوا۔ تقسیم ملک کے ساتھ ہی یہ بند ہو گیا۔ تقسیم کے ساتھ ہی انھوں نے مجلس احرار سے اپنا تعلق منقطع کر دیا اور اس کے بعد کسی سیاسی جماعت کے رکن نہیں بنے۔ اب انھوں نے صوفت کو اپنا ادھرنا، کچھو نا بنالیا۔ ۱۹۴۷ء ہی میں انھوں نے اپنا سہفہ دار چٹان جاری کیا، جو آج تک باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

مسل قید کی زندگی نے ان کی صحت خراب کر دی تھی اور وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو تنجیر معدہ کا شدید دورہ پڑا جس پر بغرض علاج میواستال (لاہور) میں داخل ہو گئے۔ دو تین دن کی دوا دوش سے کچھ افادہ ہو گیا، سب نے اطمینان کی سانس لی لیکن جمعہ ۲۴ اکتوبر کی شب میں طبیعت یک نخت پھر خراب ہو گئی اور نصف شب کے تھوڑی دیر بعد (ساڑھے بارہ بجے) یعنی ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء کے اول وقت حرکت قلب بند ہوجانے سے۔
ضمناً یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ناشرین نے اس ایڈیشن کے لیے مولانا آزاد کو دس ہزار روپے بطور حق تصنیف ادا کیے تھے۔

جان بحق ہو گئے۔ جنازہ بروز سہفہ ۲۵ اکتوبر ہی کی شام میں اٹھا اور میانی صاحب کے (مشہور قبرستان) میں سپرد خاک ہوئے۔ چادر لٹکے اور سات لڑکیاں جسمانی یادگار چھوڑیں۔

میں امر دہوی نے تاریخ کہی :

یادِ شورش میں ہے اشکوں کی تراوش، اے دل !
اور سینے میں غم، بحر سے سوزش، اے دل !
سوزشِ غم میں کہاں فکر کی کاوش، اے دل !
”حاصلِ شورشِ غم“ ہے غمِ شورش، اے دل !

۶۱۹۷۵

ان کی تعلیم جیسا کہ کہ چکا ہوں، نامکمل رہ گئی تھی۔ لیکن انھوں نے وسیع مطالعے سے یہ کمی پوری کر لی۔ خوش بختی سے انھیں اپنے عہد کے مشاہیر علم و ادب کی رفاقت اور صحبت کے مواقع ملے اور انھوں نے ان سے پوری طرح استفادہ کیا۔ ان پر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا خاص اثر رہا۔ مولانا آزاد سے نشر کا پریشکوہ انداز سیکھا، مولانا ظفر علی خان کے تتبع میں صحافتی شاعری اختیار کی، اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی پیروی میں وہ شعلہ بیان خطیب بن گئے۔ مولانا آزاد کی معنوی شاگردی پر انھوں نے خود یوں فخر کا اظہار کیا ہے :

کسی ذلیل قلم کار سے تعلق کیا !

خدا کا شکر ہے، تلمیذِ ابوالکلام ہوں میں

موضوعاتی ہنگامی شاعری میں ظفر علی خان کو جو یدِ طولیٰ حاصل تھا، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ شورش اس میدان میں ان کے قدمِ مقدم چلے اور اس میں ایسی حیرتناک کامیابی حاصل کی کہ خود مولانا ظفر علی خان کو یہ سند دینا پڑی :

شورش سے مراد شہ ہے، اور وہ اذلی ہے

میں وقت کا دشمن ہوں، تو وہ ثانیِ سہراب

اسی باعث رشید احمد صدیقی نے کہا تھا: شورش کاشمیری ابوالکلام کے طنطنہ، قلم اور نظریے علی خان کے ہمہہ انشا کا وارث ہے؟

انھوں نے مختلف اوقات میں اپنے کلام پر مولانا ظفر علی خان، تاجو نجیب آبادی اور احسان دانش سے اصلاح لی۔ بلکہ احسان تو اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ پہلے یہ الفت تخلص کرتے تھے، شورش تخلص انھیں احسان ہی نے دیا تھا؛ نیز وہ آخر تک اپنا کلام انھیں دکھاتے رہے۔ وہ کبھی کبھی اسرار / اسرار بصری کے قلمی نام سے بھی لکھتے رہے۔ یہ نام انھوں نے ۱۹۴۴ء میں جیل سے رہائی اور گھر پر نظر بندی کے دوران میں اختیار کیا تھا کیونکہ ان کی نقل و حرکت اور تحریر و تقریر پر پابندی عائد تھی۔

نظم و نشر کا خاصا ذخیرہ ان کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا۔ ان میں چار کتابیں (۱) بوسے گل، نالہ دل، دو چراغِ عقل (۱۹۷۲ء) آزادی ملک سے پہلے کی سوانح عمری؛ (۲) پس دیوارِ زندان (آزادی سے پہلے، جیل کی دس سالہ داستان)؛ (۳) موت سے واپسی (عہدِ ایوبی میں اسیری کے ۲۳۲ دن کی کہانی)؛ (۴) تمغہ خدمت (ساہیوال جیل کے تین مہینے سترہ دن کے حالات) گو یا خود نوشت سوانح کا حصہ ہیں؛ (۵) "شب جاے کہ من بودم" سفرنامہ حجاز ہے۔

ان کے کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے: (۱) گفتنی تا گفتنی؛ (۲) چہ قلندر ازہ گفتیم؛ (۳) الجباد، الجباد۔ انھوں نے بعض مشاہیر عہد کے تاثراتی خاکے بھی لکھے تھے؛ (۱) حسین شہید سہروردی؛ (۲) حمید نظامی؛ (۳) میاں افتخار الدین؛ (۴) شہد عطاء اللہ شاہ بخاری۔ چہرے: مختصر خاکے (کراچی ۱۹۶۵ء)۔

ایک کتاب اس بار میں "بدنام قحبہ خانے کی کہانی ہے" فیضانِ اقبال "میں علامہ اقبال کے "خطبات، مقالات، ارشادات اور خطوط" کا "افشردہ و عصا" (۱۲) پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں اقبال کے خیالات کو دس مختلف عنوانوں کے تحت جمع کیا ہے۔ اور کبھی کبھی کتاب میں ہیں۔

ان کا کلام بہت متناسق ہے۔ بطور نمونہ صرف ایک مختصر نظم پر اکتفا کرتا ہوں۔

شیرالدواب عند اللہ

زبان بگڑی، قلم بگڑا، روش بگڑی، چلن بگڑا
 خود اپنے ہاتھ سے کافر گروں کا پیر بن بگڑا
 مہلا تکفیز کا جھگڑ کہ شرق و غرب کا نب اُٹھے
 اٹھی دشنام کی آندھی، مزاج اہرمن بگڑا
 چیا مفقود، غیرت سڑگوں، خوفِ خدا غائب
 کچھ اس انداز سے بدعت فروشوں کا چلن بگڑا
 کروں طولِ سخن، تو بات حرفِ ناروا ہوگی
 کلام مختصر یہ ہے کہ ہر لات و دشن بگڑا
 میں اکثر سوچتا ہوں کس طرح سے ان کو سمجھاؤں
 یہ جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے نظمِ انجمن بگڑا
 یہی وہ گفتگو ہے، ناز ہے جس کی بلاغت پر
 یہی وہ مہم ہے جس سے اسلوبِ سخن بگڑا
 خدا کے نیک بندوں کو کہاں تک گالیاں دو گئے؟
 کرو گئے کیا، اگر اس پر خدا نے دوا لیجئے بگڑا؟
 "لگے منہ بھی چڑانے، دیتے دیتے گالیاں صابا!
 زباں بگڑی تو بگڑی تھی، خبر یہیے دمن بگڑا"

ہزار لکھنوی، سید حسن

ان کے مورث نقوی سادات میں سے تھے۔ روایت ہے کہ ان کے بزرگ عہد شجاع الدولہ (۱۷۵۴-۱۷۸۵ء) میں ایران سے لکھنؤ آئے اور یہاں بلند مراتب پر فائز ہو گئے۔ سید حسن ہزار نے شاعری گویا ورثے میں پائی۔ ان کے والد سید جعفر حسین عرف محمد صاحب شعر کہتے اور بہار تخلص کرتے تھے؛ وہ سانان قوم سید علی نقی صفی لکھنوی (ف: جون ۱۹۵۰ء) کے شاگرد تھے۔ لالہ سری رام نے انھیں فصاحت کا شاگرد دکھا ہے، لیکن ہزار ایک تحریر میں انھیں صفی کا شاگرد کہتے ہیں۔ ممکن ہے، دونوں سے یکے بعد دیگرے مشورہ رہا ہو، یا شاید لالہ سری رام کو غلط اطلاع ملی ہو لکھنؤ کی انجمن معین الادب اپنی ادبی سرگرمیوں اور خدمات کے لیے کسی زمانے میں معروف تھی۔ اس کے سالانہ مشاعرے بڑے بزرگ واقعات سے ہوا کرتے تھے جن میں باہر کے مشاہیر بھی شریک ہوتے۔ بہار تذاتوں اس انجمن کے سکریٹری تھے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا، تو ان کے احباب نے اثر لکھنوی کی تجویز پر اس انجمن کا نام بدل کر "انجمن بہار ادب" کر دیا۔

بہار تو خیر ان کے والد ہی تھے۔ ان کے علاوہ ننھے آغا صاحب زبیر لکھنوی، حکیم مٹھے آغا صاحب آفتاب، سید محمد ہادی عزمیہ بھی اسی خاندان کے فرد تھے۔ گویا ان کے بچپن میں چاروں طرف مآخذ: سید علی ہمدانی (ہزار کے بہنوئی)، سید نواب افسر لکھنوی اور کاظم علی خان صاحب (شیعہ کا لیج لکھنؤ)

شاعری کا چسر چا تھا۔ گھر کی مستورات تک اس سے مستثنیٰ نہیں تھیں۔ ہزار نے اسی
 ماحول میں پرورش پائی۔ بچپن ہی میں وہ اپنے والد بہار کے ساتھ مشاعروں میں جانے لگے
 تھے؛ وہاں اپنے والد ہی کے کہے ہوئے چند شعر پڑھ دیتے۔ ہزار تخلص بھی والد کے تخلص
 بہار کی مناسبت سے اختیار کیا تھا۔ انیس سو کم بہار کا بیٹا جلد انتقال ہو گیا، اور یہ ان
 سے استفادہ نہ کر سکے۔ بالآخر جب باقاعدہ شاعری کرنے لگے تو مولانا عبد الباقی اسی
 (ف: جنوری ۱۹۴۶ء) سے اصلاح کا رشتہ قائم کر لیا۔

ہزار کی ٹھیک تاریخ ولادت معلوم نہیں ہو سکی۔ والد کے بعد ان کے چچا ماسٹر مجتبیٰ حسین
 ان کے کفیل ہوئے۔ وہ انھیں اپنے ساتھ سینا پور لے گئے اور وہاں ان کا گورنمنٹ
 ہائی اسکول میں داخلہ ہو گیا؛ ۱۹۴۱ء میں دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ
 سکے اور نہ شاعری کی کثرت نے انھیں کوئی اور کام کرنے کی فرصت دی۔ اگرچہ انہی تعلیم
 کچھ زیادہ نہیں تھی، لیکن انھوں نے ذاتی مطالعے سے اس کی بہت حد تک تلافی کر لی
 تھی۔

وہ شروع میں لکھنؤ ہسپتال بورڈ میں ملازم ہوئے لیکن یہاں غالباً زیادہ دن نہیں رہے۔
 ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ راجا دارنے گڑھ نے انھیں اپنا درباری شاعر مقرر کر دیا۔ بعد کو
 وہ راجا صاحب موصوف کے ادبی سکریٹری بھی بن گئے۔ ایک موقع پر خوش ہو کر راجا صاحب
 نے انھیں تین توڑے سونے کا میڈل اور "عندلیب سخن" خطاب عطا فرمایا تھا۔

انھیں تپ دہی کا پرانا عارضہ تھا۔ اس کے علاوہ خون کے کم دباؤ اور قلب کی تکلیف بھی تھی۔
 بہت علاج ہوئے۔ یوپی حکومت نے بھی علاج کے لیے امداد دی اس سے حالت کچھ بہتر ہو
 گئی۔ ۳ نومبر ۱۹۷۷ء کو کسی کام سے کانپور گئے۔ وہیں شام کے وقت ایک مٹول میں
 دل کا شدید دورہ پڑا۔ اور آنا فانا جان بحق ہو گئے۔ اگلے دن (۴ نومبر ۱۹۷۷ء)
 کو کانپور میں بسا بیٹوں کے تکیے کے سامنے تکیہ چٹو شاہ میں سپرد خاک کر دیے گئے۔
 کہاں عمر بسر کی، اور کہاں کی مٹی مٹی میں کھی تھی۔ سچ ہے قَاتِلِ رِیْ نَفْسِکَ بِأَيِّ دَمْنٍ
 تَمَوَّتْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ

رائے گڑھ کے قیام کے زمانے میں شادی کی تھی؛ اس بگم کے بطن سے ایک بیٹی (لیکین) ہوئی
یہ ماشاء اللہ زندہ ہیں اور اپنے خاندان کے ساتھ کھنڈیا میں رہتی ہیں۔ سزا کی اس بیوی کا
جلد ہی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے نکاح ثانی نہیں کیا؛ بقیہ عمر بھرتو میں
گزر ادی۔

انھوں نے غزل، غزل، سلام، قصیدہ، نظم۔ بہت کچھ لکھا۔ افسوس کہ کوئی مجموعہ کلام ان کی
زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ تلاش بسیار کے باوجود ان کا کلام دستیاب نہیں ہوا۔ صرف
ایک غزل ملی؛ اسی کو چوں کا توں پیش کر رہا ہوں:-

جلوہ حق آشنا، آئینہ باطل نہیں
صاحبان فکر جو چاہیں، کریں وہ فیصلہ
میرے ماتھے کی لکیریں، ہیں جلالِ خسروی
اب خدا ہی نافذ ابن جائے تو ہے اور بات
ظلم دھانے کے لیے بھی حوصلہ درکار ہے
ایک ہے اپنے لیے، وہ دھوپ یا چھاؤ ہو
ہربانی سے تری، بہتر تغافل تھا ترا
اپنی عزت ذمہ شاہی کی حدوں سے دور ہے
کوئی بھی سینہ مرے دل کا متحمل نہیں
میں ہی کہتا رہو گا؛ "میں کسی قابل نہیں"
میں فقیر بیواؤں ہوں، مگر سائل نہیں
ورنہ میری خدا مکان میں کہیں ساحل نہیں
تنگدل کے ذہنِ اعلیٰ کا کوئی قابل نہیں
ہم مسافر ہیں، ہماری کوئی بھی منزل نہیں
وہ بھی کوئی بات ہے، جس کا کوئی اصل نہیں
شورشِ طوفان، دینِ عشرت ساحل نہیں

اے ہزار! اس دور میں متقلو کی منزل دار ہے
یہ صدمے صور، آوازِ شکستِ دل نہیں

طالب دہلوی شیش چندر سکینہ

دلی کے ایک مثنوی کا ستھ (سکینہ) گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد رے صاحب ہمیش داس (آنریری مجسٹریٹ) کا انبالہ چھاؤنی میں شراب فروشی کا بڑا وسیع کاروبار تھا۔ کسی زمانے میں پورے پنجاب (قبل آزادی) میں مسکرات کا ٹھیکہ اسی خاندان کے پاس تھا۔ خاندان کے متوال کا اندازہ کچھ اس سے کیجئے کہ دلی میں دریائے جمنا کا پرانا پل طالب کے دادا رے صاحب سالک رام (ف: ۱۹۱۷ء) نے حکومت سے ٹھیکہ لے کر تعمیر کروایا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے کاکا حاجی کے مندر (دلی) کے پاس کا ستھ براہروی کا جلسہ کیا۔ اس میں آٹھ ہزار افراد نے شرکت کی تھی؛ سب لوگ رے صاحب سالک رام کے مہمان تھے کہا جاتا ہے کہ اس جلسے پر ان کا ایک لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا۔

زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کچھ رے صاحب ہمیش داس کی تجارت کے جوڑ توڑ سے ناواقفیت اور بڑی حد تک اسامیوں کی بے ایمانی کے باعث کاروبار میں سخت نقصان ہوا۔ جن لوگوں سے لینا تھا، انھوں نے دینے سے انکار کر دیا؛ جنہیں لینا تھا، وہ تقاضا کرنے لگے۔ رے صاحب نے کسی لوگوں کو اپنی ضمانت پر مختلف جگہ سے قرض دوارکھا تھا؛ قرضخواہوں نے یہ حالت دیکھی تو اپنے واجبات کا مطالبہ ان سے کر دیا، اور یہ بھی دینا پڑے۔ غرض دیکھتے دیکھتے لاکھ لاکھ کا گھر اکھ ہو گیا۔ لیکن کسی چیز کو دوام نہیں کسی نہ کسی طرح وہ وقت بھی کل گیا اور خاندان پھر اپنے پانوں پر کھرا ہو گیا۔

طالب کی پیدائش ۱۲ فروری ۱۹۱۰ء کو انبالہ چھاؤنی میں ہوئی تھی۔ ان سے ایک چھوٹے بھائی ایش چند ایم اے (ولادت: یکم مارچ ۱۹۱۵ء) ہیں، جنہوں نے صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ استاد اللہ حیات ہیں۔

طالب کی ابتدائی تعلیم انبالہ چھاؤنی میں ہوئی اور انہوں نے ۱۹۲۵ء میں بنارس داس ہائی اسکول، انبالہ چھاؤنی سے دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد سان سفینس کالج، دہلی میں داخلہ لے لیا جہاں سے ۱۹۲۸ء میں دہلی یونیورسٹی سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران میں ۱۹ اپریل ۱۹۲۷ء کو ان کے والد راجے صاحب ہمیش داس کا انتقال ہو گیا۔ انٹر کے بعد انہوں نے بی اے میں داخلہ لے لیا تھا، لیکن گھر کے تبدیل شدہ حالات کے پیش نظر وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے، اور یہ سلسلہ مجبوراً منقطع کرنا پڑا۔ رفتہ رفتہ جب حالات سدھر گئے اور پھر فرصت نصیب ہوئی، تو انہوں نے بی اے ۱۹۳۴ء میں ہندو کالج، دہلی سے پاس کیا۔

ہاتھی لاکھ لے، پھر بھی سو لاکھ کا۔ بہت الٹے تلکے نہ سہی تاہم، خدا کے فضل و کرم سے گھر کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ انہیں بسر اوقات کے لیے کسی نوکری کی ضرورت پیش آتی، لیکن سیکار کی زندگی بھی تو نہیں کشتی! وہ ۱۹۲۷ء سے شعر کہنے لگے تھے، بعد اس میں اپنے چھوٹے بھائی منشی بہادر راج بہادر برق دہلوی (دف: فروری ۱۹۳۶ء سے مشورہ رہا۔ برق خود آغا شاعر قزلباشی (دف: مارچ ۱۹۴۰ء) کے شاگرد تھے۔ اس طرح گویا طالب کا سلسلہ داغ کے واسطے سے خاندان ذوق سے جا ملا۔

شعر گوئی کے شوق نے طالب کو اکسایا کہ وہ صحافی بنینگے۔ اس زلمے میں دیش بندھو گیتا (دف: نومبر ۱۹۲۹ء) کے اخبار ”تیج“ کا طوطی بولتا تھا۔ طالب صحافت کی تربیت حاصل کرنے کو اس کے دفتر پہنچے کسی معادضے یا تنخواہ کے بغیر چھ ماہ وہاں کام کیا۔ اس کے بعد حکومت ہند کے مامنامہ ”آجکل“ (اردو)، ”امریکن ریویڈر“، ”ڈسٹیکر“ (ہالینڈ) اور بعض اور پرچوں سے تعلق رہا۔ کہیں طویل، کہیں مختصر، لیکن کسی جگہ مستقل تعلق قائم نہ کر سکے۔ ان کی وضع داری کا ایک قصہ سنئے:

سہ چھوٹا اس طرح کہ برق کی بیوی، طالب کے والد (رائے ہمیش داس) کے گے چچا کی صاحبزادی تھیں۔

نقشبندی جہاد راج بہادر برہنہ کا انتقال بہت اچانک اور افسوسناک حالات میں ہوا تھا۔ ۱۲ فروری ۱۹۳۶ء کو وہ اپنے دوست شگن چند روشن پانی پتی کی صاحبزادی کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے پانی پت گئے؛ دہلی کے کئی اور شعرا بھی گئے تھے۔ وہیں شب میں ان کی طبیعت خراب ہو گئی، اور اسی حالت میں حرکت قلب بند ہو جانے سے حٹ پٹ ہو گئے۔ طالب نے ۱۹۳۷ء میں ان کی برسی کے دن اپنے مکان پر ایک شاعرے کا انتظام کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء کو چھوڑ کر چونکہ اس سال فرقہ دارانہ فسادات کے باعث فضا بہت مکدر تھی، یہ سلسلہ بلاناغہ ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ ۱۹۵۱ء میں شری حیر گپت سبھانے پیشکش کی کہ آئندہ یہ مشاعرہ ان کی عمارت میں ہوا کرے۔ وہاں ۱۹۶۱ء میں پچیسواں (جولائی) مشاعرہ ہوا؛ اور اسی کے ساتھ یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔

۱۹۳۲ء میں ان کی شادی گوالیار کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی؛ چند رکمادی بیوی کا نام تھلا دلا دیں خدانے تین بیٹے اور ایک بیٹی عطا کی۔ تینوں بیٹے صغریٰ میں داغ مفارقت دے گئے۔ بیٹی (سنگیت) مجبورہ زندہ ہیں۔ ان کی شادی ڈاکٹر بشن مرادی لائل سیکند کے ساتھ ہوئی تھی؛ جو آج کل کینیڈا کے شہر ہیلٹن کے اسپتال میں ماہر امراض دماغی کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ میاں بیوی اپنے بچوں کے ساتھ وہیں مقیم ہیں۔ طالب صاحب اپنی بیٹی اور اس کے بچوں سے ملنے کے لیے وسط ۱۹۷۷ء میں کینیڈا گئے تھے۔ وہاں سے ستمبر میں واپس آئے۔ بظاہر صحت بالکل ٹھیک تھی۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ موت اتنی قریب ہے۔ ۱۴ نومبر ۱۹۷۷ء صبح کے وقت فالج کا حملہ ہوا؛ ۱۵-۱۶ کی شب میں (ڈیڑھ بجے علی الصبح) ارون اسپتال ہی میں جان بحق ہو گئے۔

طالب کو نظم و نثر دونوں سے یکساں مزا ملت تھی۔ ترجمہ بھی اچھا کرتے تھے۔ ان کے ترجمہ شدہ افسانے مختلف رسالوں میں منظر پر آئے ہیں۔ ان کی یہ کتابیں چھپ چکی ہیں؛ (۱) رتن مالا؛ شعری انتخاب؛ (۲) حرفِ ناتمام؛ برق صاحب سے متعلق مضامین؛ (۳) یادِ گاہِ برق؛ برق صاحب سے متعلق مضامین (۱۹۴۵ء)؛ ہمارے حسین (دہلی ۱۹۴۵ء) (۵) انوارِ نظر؛

(۶) خدنگ ناز؛ (۷) خمستان کیفی (دلی ۱۹۵۱ء)؛ (۸) کتیر کی سیر: سفرنامہ (دلی ۱۹۶۶ء)
 (۹) سزہ بیگانہ: غزلوں کا انتخاب (دلی ۱۹۶۸ء)؛ (۱۰) یہ کتنی دلی: (۱۹۲۷ء تا ۱۹۴۷ء)
 کی دلی کی ادبی سرگرمیوں کی داستان (دلی ۱۹۷۵ء)

کلام نچتہ ہے، جس میں ابتذال کا شائبہ تک نہیں مضمون آفرینی کی کوشش ہر صفحے سے عیاں
 ہے کلام نچتہ اور بے عیب ہے۔ کہیں کہیں زبان کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ چند شعر بطور نمونہ
 درج ذیل ہیں:

کسی کو غم کسی کا ہے، کسی کو غم کسی کا ہے بغنوانِ دگر، سب ایک ہی افسانہ کہتے ہیں
 مری خطا کتنی نہ دیتے اگر نگاہ مجھے نگاہ دی ہے تو مجھ پر انتیاد مویں میں
 وہ دل جو تنگ بظاہر ہے اس قدر ہمدرد اسی میں وسعتِ کون و مکانِ نظمیں لگی
 اس قید کا مزہ انہیں ہر ایک کو نصیب جینے کا لطف حلقہ دار و رسن میں ہے
 یہ ابتیادِ ماوشما ہے بیک نفس نہیرِ زمیں یگانہ و بیگانہ ایک ہے
 سکونِ دل نہیں جس کے نصیب میں طالب! اسے کہیں کبھی میسر خوشی نہیں ہوتی
 محبت، ماورائے کفر و دیں ہے محبت کا کوئی مذہب نہیں ہے
 محبت، حسن ہے، حسن آفریں ہے محبت، حسن سے بڑھ کر حسیں ہے
 بھروسہ کیا کرے کوئی کسی پر! جو اپنا ہے، وہی اپنا نہیں ہے
 ہوئے جاتے ہیں آپ کیوں بدمعاش! ہم زمانے کی بات کہتے ہیں
 تم پر کہ اپنا گمان ہوتا ہے تم سے جب دل کی بات کہتے ہیں
 زینت ہے بہار کی خستراں سے جب موت نہیں، حیات کیا ہے!
 محروم دیدہ رہی، یہ اور بات ہے حذرِ نگاہ تک تو ہمدی نظر لگی

اسے محفل میں بھی تنہا سمجھو جسے احساس ہو تنہائی کا
 مانگ لو بڑھ کے کچھ ان سے مانگا! دقت آیا ہے پندیرالی کا

لگی ہوئی ہے یہاں تو دل سے، نظر میں ان کے دل لگی ہو
 یہ دل لگی ہے، تو باز آئے، جناب! ہم ایسی دل لگی ہے

تھیں نور منصفی سے کہ دو یقیں کیسے کسی کو آئے
تھکے وعدے کا ٹھیک ہی کیا، تھی کسی سے کبھی کسی سے
رکھینگے کیا یاد رکھنے والے کہ آئے تھے نرم آب گل میں
جو زندگی کے یہ چادون بھی کٹے نہ طالب بستی خوشی

دکھ دنیا آسان بہت ہے دکھ سہنا آسان نہیں ہے
دلفت خود عنوان ہے اپنا اس کا کچھ عنوان نہیں ہے
اوروں کے جو کام نہ آئے کام کا وہ انسان نہیں ہے
نہ مجھ سے ذکر کرے کوئی آشیانے کا چمن پرست ہوں، مجھ سے چمن کی بات کرو
اب خوشی میں بھی بھر آتی ہیں ہمدی آنکھیں

دقت بے وقت کی ہر سات کہاں تھی پہلے!
ٹٹا ہو گا نہ کوئی اس طرح راہ محبت میں کہ وہ اپنا، نہ دل اپنا، نہ پہلو میں گلہ اپنا
کرم سے، درد سے، اخلاق سے، ہر مروت سے فراجب ہے، بنا ئے تو دل دشمن میں گھر اپنا
پردے میں عنایت کے جو ہوتا ہے نمایاں ناقابل برواشت ہے وہ جو روقاب اور
در پردہ بھی دیکھا، تجھے بے پردہ بھی دیکھا وہ شان حجاب اور تھی، یہ شان حجاب اور
یاد بھولے سے کرینگے نہ کبھی اور، بھولے سے اگر یاد آیا!
یاد آتا تھا بہر حال جسے شام بھولے، تو سحر یاد آیا

عجیب لطف ہے، کھاتے ہیں اور بھی قسمیں جب اعتبار کے قابل سخن نہیں رہتا
وہ ایک میں، جو ہر اقرار پر یقیں کر لوں وہ ایک تم، جسے پاس سخن نہیں رہتا
عشرت ذات نہیں وصل دگر پر موقوف تنگ قطرہ ہے سمندر میں فنا ہو جانا
دل کی آواز کو کہتے ہیں، خدا کی آواز ہو مبارک اسے دنیا کی صدا ہو جانا
نہ فرق آیا ازل سے زینت گلزار ہستی میں

بہار اس کی، بہارِ جاوداں معلوم ہوتی ہے
ابھی چشم قبول اس کی طرف مائل نہیں شاید
ابھی ہر سعی، سعی راہِ گمان معلوم ہوتی ہے

یہ خوش فہمی ہے اپنی، یا لگا ہوا ناز کا حادو

"نہیں" بھی اب تو ظالم تیری "ہاں" معلوم ہوتی ہے

تیری محفل میں پہنچنے کو تو ہم بھی پہنچے
کچھ اس انداز سے اپنوں نے نوازا ہٹیں
بہر عنوان ہو کر ہی رہیگا، وہ جو ہونا ہے

ترے اندیشہ سود و ذریاں سے کچھ نہیں ہوتا

کبھی راضی برضا ہو کے بھی دیکھو طالب!
مفلسی، تنگ نہیں، عیب نہیں، جرم نہیں

لیکن افلاس کا احساس بُرا ہوتا ہے

بات باریک ہے، مشکل سے سمجھ پاؤ گے

عس کو کہتے ہیں دعا، وہ بھی گلا ہوتا ہے

بے زبانی زبان ہو کے رہی ہر نظر دانتان ہو کے رہی

محوی صدیقی لکھنوی، محمد حسین

لکھنؤ کے ایک سرہم آلودہ خاندان کے فرد تھے، جس میں دین اور دنیا دونوں کا اجتماع تھا۔ ان کے دادا مولانا محمد صادق علی حید عالم اور حافظ قرآن بزرگ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں "عملیات" میں بھی یرطولی حاصل تھا۔ ان کے فرزند حافظ علی حسین تھے۔ وہ بھی اپنی خاندانی روایات کے وارث اور عربی فارسی کے عالم تھے۔ فارسی میں شریکتے تھے، فوز تخلص تھا۔ کسب کے لیے خطاطی اور خوشنویسی کا پیشہ اختیار کیا، اور اسی سلسلے میں اس زمانے کے مشہور مطبع نوکشور میں تیس روپیہ ماہرہ پر ملازم ہو گئے۔ یہی زمانہ ہے، جب نواب صدیق حسن خان مرحوم (ف: فردی ۱۸۹۰ء) نے بھوپال میں تصنیف و تالیف کا کام وسیع پیمانے پر شروع کیا اور ریاست میں اس کے لیے ایک باقاعدہ دفتر کی تشکیل کی۔ انھوں نے منشی نول کشور (ف: فردی ۱۸۹۵ء) کو لکھا کہ آپ کے یہاں تعلق و نسخ کا جو بہترین کاتب ہو، اسے بھوپال بھیج دیجیے۔ اس پر منشی صاحب موصوف نے حافظ علی حسین صاحب کو بھوپال جانے پر آمادہ کر لیا۔ یہ جب بھوپال پہنچے، تو تو نواب صاحب موصوف نے ان کی بہت آؤ بھگت کی اور اپنے ہاں کی کتابت کا جملہ کام ان کی نگرانی میں دے دیا۔ پچاس روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ نواب صاحب کی زندگی تک وہ یہ کام کرتے رہے۔ ان کا انتقال بھی بھوپال ہی میں ہوا۔ وہیں قبرستان "گنج شہیدان" میں مدفون ہیں۔ یہی حافظ علی حسین ہمارے محوی صدیقی کے والد بزرگوار تھے۔ محوی لکھنوی ۱۵ مئی

۱۸۹۱ء (۶ شوال ۱۳۰۸ھ) کو پیدا ہوئے۔ تعلیم کا مرحلہ آیا، تو اس کا انتظام گھر پر ہوا۔ اس کے بعد فرنگی محل کے مدرسہ نظامیہ میں داخلہ لیا۔ اور تکمیل اپنے والد کی نگرانی میں بھوپال میں کی، مدرسہ احمدیہ سے عربی کی، اور مدرسہ سلیمانہ سے فارسی کی سند فیض پائی۔

تکمیل تعلیم کے بعد ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ آئے اور یہاں ماہانہ "النظر" سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں ۱۹۱۶ء تک یعنی پانچ برس، اولاً اس کے انتظامی اور پھر ادارتی شعبے میں کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں ان کی مٹا ہیر عبد الجلیل شرر، فصاحت لکھنوی، علی محمد عارف لکھنوی، پیادے صاحب رشید، جالب دہلوی، وحید الدین سلیم، چکبست لکھنوی اکبر الہ آبادی وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔ اس سے انھیں اپنے دل و دماغ کی غفی صلاحیتوں پر جلا کرنے اور انھیں بہرے کا لالہ بنانے میں بڑی مدد ملی۔ ۱۹۱۴ء میں انجمن ترقی اردو کا ایک جلسہ لکھنؤ میں ہوا تھا۔ یہیں محوی کی ملاقات مولوی عبدالحق مرحوم (ف: اگست ۱۹۶۱ء) سے بھی ہوئی، جس سے بعد کو انھیں بہت فائدہ پہنچا۔

۱۹۱۶ء میں ان کے والد حافظ علی حسین بہت بیمار ہو گئے۔ اس پر محوی صاحب لکھنؤ سے بھوپال چلے گئے، اور یہاں انھیں ریاست کے دفتر تاریخ میں عربی مترجم کی جگہ مل گئی، ان کی کتاب "ازدواج الانبیاء" لکھنؤ ۱۹۱۶ء اسی زمانے میں لکھی گئی تھی۔ دو سال بعد ۱۹۱۸ء میں وہ لکھنؤ واپس آ گئے۔ یہاں انھوں نے اپنا "دائرۂ ادبیہ" قائم کیا۔ "انسانی قربانیاں" کی تصنیف اور اشاعت اسی زمانے میں ہوئی۔ (لکھنؤ، ۱۹۱۹ء)

لکھنؤ میں کوئی سال بھر قیام رہا ہو گا کہ مولانا عبدالقادر آزاد سجانی (ف: جون ۱۹۵۷ء) نے انھیں کانپور طلب کیا۔ آزاد سجانی مرحوم کا نام ہادی تحریک آزادی اور تحریک خلافت میں بہت نمایاں ہے۔ انھیں فلسفے سے بہت شغف تھا۔ اسی لیے وہ اپنا نام سجانی ربانی لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے کانپور میں "مدرسہ الہیات" قائم کیا تھا۔ محوی صاحب کو اسی مدرسے میں عربی پڑھانے کے لیے بلایا گیا تھا۔ محوی سال بھر کانپور میں رہ کر علی گڑھ چلے گئے، اور جامعہ ملیہ کے شعبہ تصنیف و تالیف میں کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے

”طقات ناصری“ اور تاریخ فیروز شاہی“ کا ترجمہ کیا۔
 جیسا کہ بیان ہوا، ”الناظر“ کی ملازمت کے زمانے میں ان کا مولوی عبدالحق مرحوم سے تعارف ہو گیا تھا چونکہ یہ روزگار کی طرف سے پریشان تھے، اور اپنی استعداد اور استعداد کے باوجود انھیں کہیں جہم کر بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی تھی، انھوں نے مولوی عبدالحق سے رجوع کیا اور اردو کی درخواست کی موصوف نوجوان اور موہنارادیوں کی حوصلہ افزائی پر ہمیشہ تیار رہتے تھے انھوں نے محوی کو اورنگ آباد بلایا جہاں وہ خود اس زمانے میں کالج کے پرنسپل اور انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے۔ سو رہیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی تھی، لیکن جب یہ اورنگ آباد پہنچے، تو مولوی صاحب نے از خود یہ بڑھا کر ایک سو پندرہ کر دی۔ یہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے۔ اورنگ آباد میں ان کا قیام ۱۹۲۹ء تک رہا۔ اس زمانے میں وہ انجمن کی انگریزی/اردو ڈکشنری کی ترتیب میں بھی شریک رہے تھے۔

۱۹۳۰ء میں وہ مدراس چلے گئے۔ ادلاجمالیہ عربک کالج میں عربی کے استاد رہے، بعد کو مدراس یونیورسٹی میں مدرس (لیکچرر) مقرر ہو گئے۔ یہاں سے وہ ۱۹۵۲ء میں سبکدوش ہوئے۔ یہ ان کی تصنیفی و تالیفی زندگی کا سب سے بار آور زمانہ ہے۔ یہاں انھوں نے دیوان میر محمدی بیدار دہلوی (۱۹۳۵ء) واقعات اظہری اور دیوان (اظہری)، اردو فارسی (۱۹۳۶ء) میر اسماعیل خان ابجدی کا انور نامہ (۱۹۴۲ء) اور کلیات فارسی (۱۹۵۴-۱۹۵۵ء)؛ کلمات اشعار سرخوش (۱۹۵۱ء) مرتب کیے؛ ان پر دیباچے اور حواشی لکھے؛ اور یہ سب کتابیں مدراس یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔

مدراس کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد انھوں نے بھوپال میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ پڑھنے لکھنے کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہا۔ یہاں انھوں نے بچوں کے لیے کسی کہانیاں لکھیں جو اسی زمانے میں شائع ہو گئی تھیں۔

انھیں شعر گوئی کا شوق ورثے میں ملا تھا۔ ان کا کلام ۱۹۰۷ء ہی سے موقت الشیوع رسائل میں شائع ہونے لگا تھا۔ لیکن ابھی تک انھوں نے کسی سے باقاعدہ اصلاح کا تعلق پیدا نہیں کیا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے احمد علی شوق قدوائی (ز: اپریل ۱۹۲۵ء)

کی شاگردی اختیار کی اور استاد کی زندگی بھران سے مشورہ کرتے رہے۔ اب بھوپال میں مستقل قیام اختیار کرنے کے بعد انھوں نے اپنا کلام بھی جمع کرنا شروع کیا۔ نعتیہ کلام ”نغمہ فردوس“ کے نام سے چھپا (بھوپال، ۱۹۸۶ء) اور رباعیات کا مجموعہ ”آبشار“ کے عنوان سے (لکھنؤ، ۱۹۷۱ء)۔ اس سے مدتوں پہلے ایک طویل نظم ”شاعر کا دل“ کے عنوان سے بھی چھپی تھی (مدراں، ۱۹۳۸ء)۔ لیکن افسوس کہ غزلیات کا دیوان نہیں چھپ سکا، حال آنکہ ان کی بڑی تمنا تھی کہ یہ محفوظ ہو جائے۔ کسی زمانے میں ان کے شاگرد جوہر چاندوری نے ان کے موشعوں کا ایک مختصر مجموعہ چھاپا تھا۔ (لکھنؤ، ۱۹۴۸ء) اب یہ بھی نایاب ہے۔ بہر حال، اگر پورا کلام نہیں، تو ان کا ایک ناسیدہ انتخاب شائع ہو جانا چاہیے۔ انھوں نے اور بھی نظم و نثر کا بہت ذخیرہ چھوڑا ہے۔

ستمبر ۱۹۷۲ء سے علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسپتال مزمن کی تکلیف تھی۔ ہر طرح کے علاج کیے لیکن کسی سے نائدہ نہیں ہوا۔ ۱۹۷۴ء تک بالکل زار و نزار ہو گئے؛ اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا تک دو بھر ہو گیا۔ اسی میں بدھ کے دن ۱۹ نومبر ۱۹۷۵ء صبح آٹھ بجے کے بعد روحِ نقسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ بھوپال کے شاہی قبرستان ”بڑے باغ“ میں دفن ہوئے۔ سید حسن امجدی، حکیم میرن دہلوی (جامعہ نگر، نئی دہلی) نے تاریخ کہی، جس کے پہلے مصرع سے عیسوی اور دوسرے مصرع سے ہجری سال برآمد ہوتا ہے :

اٹھ گیا دنیا سے کیسا شاعر شیریں مقال (۱۹۷۵ء)

خادمِ اردو زبان مرحوم محوی لکھنؤی (۱۳۹۵ھ)

محوی مرحوم نے اپنی زندگی میں چار نکاح کیے۔ پہلی بیوی لکھنؤ کی تھیں۔ شادی کے ایک سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ دوسری شادی بھی لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے ایک بچہ ہوا تھا، جس کے بعد وہ مسلسل بیمار رہنے لگیں۔ پہلے ان کی موت ہوئی اور پھر نو مود بھی چل بسا۔ تیسری بیوی بھوپال کی تھیں۔ ان سے دو لڑکے ہوئے؛ (۱) حامد جسین صدر نقی، جو آج کل نیو کالج، مدراس میں مدرس شعبہ اردو فاضلی ہیں۔ (۲) محمود حسین؛ روزنامہ انقلاب، ممبئی

بھٹی کے دفتر میں ملازم ہیں۔ چوتھی بیگم بھی بھوپال ہی کی تھیں۔ ان سے تین صاحبزادے (سعید حسین، جمیل حسین، منیر حسین) اور ایک صاحبزادی (نور جہان بیگم) ہیں۔ ماشاء اللہ سب اپنی اپنی جگہ خوش و خرم ہیں۔

ذیل میں چند شعر بطور نمونہ کلام ملاحظہ ہوں، جو ان کے صاحبزادے منیر المحوی (منیر حسین) کے عنایت کردہ کلام سے انتخاب کیے گئے ہیں:

اللہ رے طلسمِ جمال سخن فریب کچھ تجھ سے کہنے آئے تھے، یاد اب گز نہیں
بچپن کیا ہے مجھے، افسانہ شب نے اظہار کا بھی شوق ہے، رسوائی کا ڈر بھی
نعمتِ شکرِ جفا، اہلِ نظر نے پائی، لو! ہوسِ شکوہ بیدارِ شکر میں رہے
مذاقِ عیش بھی پامال، ذوقِ غم بھی اندر رہے

یہ کیا ہم شکستہ خاطر دوں کی زندگانی ہے!
نگاہِ شوق بھی ناکام، ذوقِ عشق بھی رسوا

مگر دل ہے کہ سرشارِ فریبِ شادمانی ہے
مصوّر کی نظر، شاعر کا دل، سجدے میں ہیں دونوں

جوانی بن کے وہ حسن واداکاشا سہکار آئی
وہ پھیلی چاندنی، تارے وہ چھٹکے، چاند وہ کلا

وہ صبحِ عید کے پیکر میں شامِ انتظار آئی
ہر گام پر تباہی ہے راہیں نئی نئی اس عقلِ نکتہ رس سے بھی اکتا رہے ہیں تم
یہ عدم کے جانے والے، ہیں تمہارے ہی توشیدہ

کوئی رہ گیا ہے پیچھے، کوئی لے گیا ہے بازی
گیا دل بھی جوانی بھی، نشاط و کیف کے دن بھی

تمنا جس کو کہتے ہیں، وہ دیوانی نہیں جاتی
میں ہوں، اور سارے جاں کے حادثات امتحاں ہوتے ہیں مشتِ خاک کے
مّت کے بعد آج جو نظریں ہوئیں دو چار وہ بھی کس اشتیاق سے دیکھا کیے مجھے

اب یہ پتا چلا کہ وطن کیوں عزیز ہے مدت کے بعد گھر کو جو آئے سفر سے ہم
تو ہی بتا، دل دیوانہ پھر کہاں جائے! جو اپنے گھر کے لیے ہے، نہ تیرے در کے لیے
دلوں سے یاس رخصت، درد رخصت، بلیسی رخصت

وہ جانِ حسن، جانِ آرزو، جانِ شباب آیا
ذکرِ چین، نہ فکرِ نشیمن، خدا کی شان! اس کر تعس میں اور دل آزاد ہو گیا
بول پر آہ، بالیس اشک سے تر، ہاتھ دل پر ہے

کسی کی یاد ہے، اور رات کا خاموش منظر ہے
سکون کی شورش آباد جہاں میں آرزو کیسی!

اے ناداں! یہ نعمت کبجِ تربت میں میسر ہے
رونے سے بھی کچھ دل کی تسکین نہیں ہوتی کچھ روز محبت میں یہ کام بھی کر دیکھا
مرے عزم و وفا کی لاج رکھ لی، سخت جانی نے

ہجومِ آرزو میں ورنہ جینا کوئی آساں تھا؟
رو رہا ہے دل، مگر اندری مجبوریاں ہنس رہے ہیں ہم زمانے کو دکھانے کے لیے

بسل الہ آبادی، سکھ دیو پرشاد سنہا (منشی)

۱۱ نومبر ۱۸۹۹ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن سہوانی پور (ضلع رائے بریلی) ہے، جہاں سے ان کے جد امجد کسب معاش کے سلسلے میں الہ آباد آئے، اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ بسمل کے والد کا نام منشی بشیشور دیاں سنہا تھا۔ خاندان کی سکونت الہ آباد کے مشہور محلے میر گنج میں رہی، جس میں نرو خاندان بھی رہتا تھا؛ کایستھوں کی عربی فارسی سے رغبت ان کے حصے میں بھی آئی۔ تعلیم ماڈرن ہائی اسکول اور کایستھ پائتالہ کالج، الہ آباد میں ہوئی۔ ابھی تعلیمی مراحل ہی میں تھے کہ شجر کہنے لگے۔

۱۹۱۸ء میں نوح نادر دی (ف: اکتوبر ۱۹۶۲ء) کی شاگردی اختیار کر لی۔ لیکن بعد کو کس بات پر ان سے قطع تعلق ہو گیا۔ چونکہ اب ان کی مشق کافی ترقی کر چکی تھی اور زبان و بیان پر ابھی قدرت حاصل ہو گئی تھی، لہذا اس حادثے سے انھیں کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ الہ آباد اور نواح میں ان کے شاگردوں کا خاصا وسیع حلقہ تھا۔ پڑھتے بھی خوب تھے، ان کے ترانے میں سوڈ سے زیادہ نشاط کا عنصر نمایاں تھا۔ کلام کے دہمبوتے "جذبات بسمل" اور "افکار بسمل" کے عنوان سے چھپ چکے ہیں۔ اول پردیباچہ سر عبد اللہ نقاد کے قلم سے ہے، اور دوسرے پر سر جی بہادر سپرو کے قلم سے۔ لیکن اس پر بھی ایک زمانہ گزر گیا، ابھی بہت کلام غیر مطبوعہ ہو گا۔

ساری عمر الہ آباد کے میونسپل بورڈ میں ملازم رہے۔ وہاں سے سبکدوش ہوئے، تو اس کے بعد

کہیں اور ملازمت نہیں کی، اس کی ضرورت بھی نہیں تھی؛ بس اوقات کے لیے خرا کا دیا بہت کچھ تھا۔

صحت عموماً ہمیشہ اچھی رہی اور انھوں نے خاصی لمبی عمر پائی۔ چند دن کی معمولی علالت کے بعد ۲۳، ۲۴ نومبر ۱۹۷۵ء کی درمیانی شب (گویا ۲۴ نومبر کے ابتدائی اوقات) میں حرکت قلب بند ہو جانے سے جان بحق ہوئے۔ موت سے ایک دن پہلے انھوں نے تازہ غزل کہی تھی، جس میں مصرع تھا:

بسل آیا ہے اکیلا، بسل جاؤ گی اکیلا

لیکن اسے غلط کر دکھایا ان کے ۳۸ سالہ بیٹے شیشو شنکر لال نے۔ جب بسل کی چٹیا میں آگ لگائی جا رہی تھی، تو شیشو شنکر لال سدے کی تاب نہ لاسکے، اور آٹا فاناں کے تلب کی حرکت بند ہو گئی۔

بسل کا شعری رشتہ نوح ناروی کے واسطے سے داغ دہلوی سے ملتا ہے۔ داغ اسکول نے زبان کو سلیس اور صاف ستھرا رکھنے میں جو خدمات انجام دی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس میدان میں داغ کے شاگردوں میں نوح کو اور بھی امتیاز حاصل تھا۔ بسل اپنے استاد کے رنگ میں اس حد تک رنگے ہوئے ہیں کہ بیشتر اوقات دونوں کے کلام میں امتیاز محال ہے۔ انھوں نے خود بھی خاندان داغ کا فرد ہونے پر اکثر فخر کیا ہے لکھتے ہیں:

یکس کے منہ میں دباں ہے، جو کہ سکے بسل!

مری زبان نہیں، داغ کے گھرانے کی
ہمارا سلسلہ ہے خاندان داغ سے بسل! — ختم ہو سیکھنا، وہ سیکھ لے اردو زبان ہم
چند شعر دیکھیے:-

عشق میں ملتی ہے مرکز، اہل دل کو زندگی
وقت اخیر موت کے آثار دیکھ کر
مٹ گئی شمع کی تنویر وہ سب رات کے ساتھ

خاک بھی اب نظر آتی نہیں پر دانوں کی

ترے در سے، ترے کوچے سے، اٹھنا غیر ممکن ہے
 دکھائیگی ہمیں جو گردشِ تقدیر، دیکھینگے
 آپ کی محفل سے اٹھنے کا نتیجہ یہ ہوا ————— تنگ آکر اٹھ گئے دنیا کی بھی محفل سے ہم
 نہ آئی نیند، نہ آئی قضا، نہ آئے آپ ————— تڑپ تڑپ کے شب انتظار دیکھ لیا

گلزار میں آیا موسمِ گل، اللہ رے جوانی پھولوں کی
 اب پھول کے بلبل کہتی ہے، پھولوں سے کہانی پھولوں کی
 گلشن میں نہ کیونکر دل بہلے، وہ سنتے ہیں میں سنا تا ہوں
 پھولوں سے فسانہ بلبل کا، بلبل سے کہانی پھولوں کی
 بلبل کے مقدر سے مشک، تقدیر اسی کی اچھی ہے
 چل پھر کے صبا ہی چومتی ہے، کیا کیا پشانی پھولوں کی

ہر موج ہے اک پردہ سازِ ہستی ————— کھلنے کو جابوں سے ہے رازِ ہستی
 کوشش نہ ابھرنے کی کرو، اے بلبل! ————— غرقابِ فنا ہو گا، جہازِ ہستی

قاصر، برہم نامہ قدرت (چودھری)

ایک قدیم موہیال برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی ذات و ت، اور گوت بھاردوار تھی اور پیدا ہوئے ۱۴ ستمبر ۱۸۹۱ء کو صبح پانچ بجے ویرم دھان تحصیل شکر گڑھ، ضلع گودا پیور (حال پاکستان) میں یہ قصبہ بھی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے انہیں کے بزرگوں کا بسایا ہوا ہے۔

ان کے والد چودھری گوداں دتتا مل دت تعلیم یافتہ بزرگ تھے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق اُردو اور فارسی کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، انگریزی میں بھی دسویں کے سند یافتہ تھے۔ لیکن انھوں نے گھر کی زمینداری کی دیکھ بھال کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا۔ چودھری گوداں دتتا مل کے دادا (یعنی قاصر کے جدِ اعلیٰ) منشی ہمیش داس فارسی کے فاضل اور بہادر جاسوچیت شاہ کے درباری اور مشیر تھے۔ بعد کو قاصر کے دادا منشی شکر داس نے دیباہداری ترک کر دی اور اپنی جاداد کی نگرانی پر اکتفا کی۔ اس سے معلوم ہوگا کہ بفضلہ گھر میں علم و فضل بھی تھا اور دولت بھی۔

سے قاصر نے خود اپنی تاریخ ولادت دو جگہ لکھی ہے: ۱۳ جولائی ۱۸۶۹ء (دال ڈال، پات پات، ۱۱)؛ بھادوں ۱۴۸۸ ہجری (۲۵ کر ذی قعدہ)؛ ۱۳ جولائی ۱۸۶۹ء مطابق مئی ۱۲ ۱۸۷۰ء (۱۲ کر ذی قعدہ)؛ اور ۱۱ بھادوں ۱۴۸۸ ہجری کو ۱۴ ستمبر ۱۸۷۱ء (۱۱ کر ذی قعدہ)؛ ۱۲ ستمبر ۱۸۷۱ء (۱۲ کر ذی قعدہ)؛ ۱۳ جولائی ۱۸۶۹ء (۱۳ کر ذی قعدہ)؛ ۱۴ ستمبر ۱۸۷۱ء (۱۴ کر ذی قعدہ)؛ ۱۵ ستمبر ۱۸۷۱ء (۱۵ کر ذی قعدہ)؛ ۱۶ ستمبر ۱۸۷۱ء (۱۶ کر ذی قعدہ)؛ ۱۷ ستمبر ۱۸۷۱ء (۱۷ کر ذی قعدہ)؛ ۱۸ ستمبر ۱۸۷۱ء (۱۸ کر ذی قعدہ)؛ ۱۹ ستمبر ۱۸۷۱ء (۱۹ کر ذی قعدہ)؛ ۲۰ ستمبر ۱۸۷۱ء (۲۰ کر ذی قعدہ)؛ ۲۱ ستمبر ۱۸۷۱ء (۲۱ کر ذی قعدہ)؛ ۲۲ ستمبر ۱۸۷۱ء (۲۲ کر ذی قعدہ)؛ ۲۳ ستمبر ۱۸۷۱ء (۲۳ کر ذی قعدہ)؛ ۲۴ ستمبر ۱۸۷۱ء (۲۴ کر ذی قعدہ)؛ ۲۵ ستمبر ۱۸۷۱ء (۲۵ کر ذی قعدہ)؛ ۲۶ ستمبر ۱۸۷۱ء (۲۶ کر ذی قعدہ)؛ ۲۷ ستمبر ۱۸۷۱ء (۲۷ کر ذی قعدہ)؛ ۲۸ ستمبر ۱۸۷۱ء (۲۸ کر ذی قعدہ)؛ ۲۹ ستمبر ۱۸۷۱ء (۲۹ کر ذی قعدہ)؛ ۳۰ ستمبر ۱۸۷۱ء (۳۰ کر ذی قعدہ)؛ ۱ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۱ کر ذی قعدہ)؛ ۲ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۲ کر ذی قعدہ)؛ ۳ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۳ کر ذی قعدہ)؛ ۴ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۴ کر ذی قعدہ)؛ ۵ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۵ کر ذی قعدہ)؛ ۶ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۶ کر ذی قعدہ)؛ ۷ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۷ کر ذی قعدہ)؛ ۸ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۸ کر ذی قعدہ)؛ ۹ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۹ کر ذی قعدہ)؛ ۱۰ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۱۰ کر ذی قعدہ)؛ ۱۱ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۱۱ کر ذی قعدہ)؛ ۱۲ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۱۲ کر ذی قعدہ)؛ ۱۳ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۱۳ کر ذی قعدہ)؛ ۱۴ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۱۴ کر ذی قعدہ)؛ ۱۵ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۱۵ کر ذی قعدہ)؛ ۱۶ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۱۶ کر ذی قعدہ)؛ ۱۷ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۱۷ کر ذی قعدہ)؛ ۱۸ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۱۸ کر ذی قعدہ)؛ ۱۹ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۱۹ کر ذی قعدہ)؛ ۲۰ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۲۰ کر ذی قعدہ)؛ ۲۱ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۲۱ کر ذی قعدہ)؛ ۲۲ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۲۲ کر ذی قعدہ)؛ ۲۳ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۲۳ کر ذی قعدہ)؛ ۲۴ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۲۴ کر ذی قعدہ)؛ ۲۵ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۲۵ کر ذی قعدہ)؛ ۲۶ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۲۶ کر ذی قعدہ)؛ ۲۷ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۲۷ کر ذی قعدہ)؛ ۲۸ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۲۸ کر ذی قعدہ)؛ ۲۹ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۲۹ کر ذی قعدہ)؛ ۳۰ اکتوبر ۱۸۷۱ء (۳۰ کر ذی قعدہ)؛ ۱ نومبر ۱۸۷۱ء (۱ کر ذی قعدہ)؛ ۲ نومبر ۱۸۷۱ء (۲ کر ذی قعدہ)؛ ۳ نومبر ۱۸۷۱ء (۳ کر ذی قعدہ)؛ ۴ نومبر ۱۸۷۱ء (۴ کر ذی قعدہ)؛ ۵ نومبر ۱۸۷۱ء (۵ کر ذی قعدہ)؛ ۶ نومبر ۱۸۷۱ء (۶ کر ذی قعدہ)؛ ۷ نومبر ۱۸۷۱ء (۷ کر ذی قعدہ)؛ ۸ نومبر ۱۸۷۱ء (۸ کر ذی قعدہ)؛ ۹ نومبر ۱۸۷۱ء (۹ کر ذی قعدہ)؛ ۱۰ نومبر ۱۸۷۱ء (۱۰ کر ذی قعدہ)؛ ۱۱ نومبر ۱۸۷۱ء (۱۱ کر ذی قعدہ)؛ ۱۲ نومبر ۱۸۷۱ء (۱۲ کر ذی قعدہ)؛ ۱۳ نومبر ۱۸۷۱ء (۱۳ کر ذی قعدہ)؛ ۱۴ نومبر ۱۸۷۱ء (۱۴ کر ذی قعدہ)؛ ۱۵ نومبر ۱۸۷۱ء (۱۵ کر ذی قعدہ)؛ ۱۶ نومبر ۱۸۷۱ء (۱۶ کر ذی قعدہ)؛ ۱۷ نومبر ۱۸۷۱ء (۱۷ کر ذی قعدہ)؛ ۱۸ نومبر ۱۸۷۱ء (۱۸ کر ذی قعدہ)؛ ۱۹ نومبر ۱۸۷۱ء (۱۹ کر ذی قعدہ)؛ ۲۰ نومبر ۱۸۷۱ء (۲۰ کر ذی قعدہ)؛ ۲۱ نومبر ۱۸۷۱ء (۲۱ کر ذی قعدہ)؛ ۲۲ نومبر ۱۸۷۱ء (۲۲ کر ذی قعدہ)؛ ۲۳ نومبر ۱۸۷۱ء (۲۳ کر ذی قعدہ)؛ ۲۴ نومبر ۱۸۷۱ء (۲۴ کر ذی قعدہ)؛ ۲۵ نومبر ۱۸۷۱ء (۲۵ کر ذی قعدہ)؛ ۲۶ نومبر ۱۸۷۱ء (۲۶ کر ذی قعدہ)؛ ۲۷ نومبر ۱۸۷۱ء (۲۷ کر ذی قعدہ)؛ ۲۸ نومبر ۱۸۷۱ء (۲۸ کر ذی قعدہ)؛ ۲۹ نومبر ۱۸۷۱ء (۲۹ کر ذی قعدہ)؛ ۳۰ نومبر ۱۸۷۱ء (۳۰ کر ذی قعدہ)؛ ۱ دسمبر ۱۸۷۱ء (۱ کر ذی قعدہ)؛ ۲ دسمبر ۱۸۷۱ء (۲ کر ذی قعدہ)؛ ۳ دسمبر ۱۸۷۱ء (۳ کر ذی قعدہ)؛ ۴ دسمبر ۱۸۷۱ء (۴ کر ذی قعدہ)؛ ۵ دسمبر ۱۸۷۱ء (۵ کر ذی قعدہ)؛ ۶ دسمبر ۱۸۷۱ء (۶ کر ذی قعدہ)؛ ۷ دسمبر ۱۸۷۱ء (۷ کر ذی قعدہ)؛ ۸ دسمبر ۱۸۷۱ء (۸ کر ذی قعدہ)؛ ۹ دسمبر ۱۸۷۱ء (۹ کر ذی قعدہ)؛ ۱۰ دسمبر ۱۸۷۱ء (۱۰ کر ذی قعدہ)؛ ۱۱ دسمبر ۱۸۷۱ء (۱۱ کر ذی قعدہ)؛ ۱۲ دسمبر ۱۸۷۱ء (۱۲ کر ذی قعدہ)؛ ۱۳ دسمبر ۱۸۷۱ء (۱۳ کر ذی قعدہ)؛ ۱۴ دسمبر ۱۸۷۱ء (۱۴ کر ذی قعدہ)؛ ۱۵ دسمبر ۱۸۷۱ء (۱۵ کر ذی قعدہ)؛ ۱۶ دسمبر ۱۸۷۱ء (۱۶ کر ذی قعدہ)؛ ۱۷ دسمبر ۱۸۷۱ء (۱۷ کر ذی قعدہ)؛ ۱۸ دسمبر ۱۸۷۱ء (۱۸ کر ذی قعدہ)؛ ۱۹ دسمبر ۱۸۷۱ء (۱۹ کر ذی قعدہ)؛ ۲۰ دسمبر ۱۸۷۱ء (۲۰ کر ذی قعدہ)؛ ۲۱ دسمبر ۱۸۷۱ء (۲۱ کر ذی قعدہ)؛ ۲۲ دسمبر ۱۸۷۱ء (۲۲ کر ذی قعدہ)؛ ۲۳ دسمبر ۱۸۷۱ء (۲۳ کر ذی قعدہ)؛ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۱ء (۲۴ کر ذی قعدہ)؛ ۲۵ دسمبر ۱۸۷۱ء (۲۵ کر ذی قعدہ)؛ ۲۶ دسمبر ۱۸۷۱ء (۲۶ کر ذی قعدہ)؛ ۲۷ دسمبر ۱۸۷۱ء (۲۷ کر ذی قعدہ)؛ ۲۸ دسمبر ۱۸۷۱ء (۲۸ کر ذی قعدہ)؛ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۱ء (۲۹ کر ذی قعدہ)؛ ۳۰ دسمبر ۱۸۷۱ء (۳۰ کر ذی قعدہ)؛ ۱ جنوری ۱۸۷۲ء (۱ کر ذی قعدہ)؛ ۲ جنوری ۱۸۷۲ء (۲ کر ذی قعدہ)؛ ۳ جنوری ۱۸۷۲ء (۳ کر ذی قعدہ)؛ ۴ جنوری ۱۸۷۲ء (۴ کر ذی قعدہ)؛ ۵ جنوری ۱۸۷۲ء (۵ کر ذی قعدہ)؛ ۶ جنوری ۱۸۷۲ء (۶ کر ذی قعدہ)؛ ۷ جنوری ۱۸۷۲ء (۷ کر ذی قعدہ)؛ ۸ جنوری ۱۸۷۲ء (۸ کر ذی قعدہ)؛ ۹ جنوری ۱۸۷۲ء (۹ کر ذی قعدہ)؛ ۱۰ جنوری ۱۸۷۲ء (۱۰ کر ذی قعدہ)؛ ۱۱ جنوری ۱۸۷۲ء (۱۱ کر ذی قعدہ)؛ ۱۲ جنوری ۱۸۷۲ء (۱۲ کر ذی قعدہ)؛ ۱۳ جنوری ۱۸۷۲ء (۱۳ کر ذی قعدہ)؛ ۱۴ جنوری ۱۸۷۲ء (۱۴ کر ذی قعدہ)؛ ۱۵ جنوری ۱۸۷۲ء (۱۵ کر ذی قعدہ)؛ ۱۶ جنوری ۱۸۷۲ء (۱۶ کر ذی قعدہ)؛ ۱۷ جنوری ۱۸۷۲ء (

چودھری گولیاں دتامل بڑے محیر اور سمندر و قسم کے انسان تھے۔ افسوس کہ ان کا انجام بہت المیہ حالات میں ہوا جب ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کا اعلان ہوا، اور فیصلہ ہوا کہ گولیاں دتامل کی تحصیل شکر گڑھ (ویرم دتال سمیت) پاکستان کا حصہ بنیگی، تو اعزہ و اقارب کے مشورے اور اصرار کے باوجود انھوں نے ویرم دتال سے ہجرت کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں سب میرے دوست ہیں، یہیں کسی کا مخالف، نہ میرا کوئی دشمن۔ مجھے یہاں کیا تکلیف ہے کہ میں اپنا جہنم بھوم اور بزدل گور، کا وطن ترک کر کے کسی اور جگہ جاؤں!۔ یہاں تک کہ انھوں نے پاکستان سے اپنی دوستی اور اخلاص اور وفاداری کے اعلان کے طور پر اپنے مکان پر پاکستانی جھنڈا بھی لگا دیا۔ لیکن تقدیر کا نوشتہ پورا ہو کر رہا۔ چند دن بعد لوگوں نے ان کے گھر پر حملہ کر دیا، اور انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اب زمانے کی ستم ظریفی کا دوسرا پہلو دیکھیے۔ قاصر صاحب اس زمانے میں امرتسر میں مقیم تھے۔ قسیم کے کھیل یہاں ان کا مکان جنونیوں نے اس لیے نذر آتش کر دیا کہ انھوں نے اپنے مسلمان دوستوں اور ان کے خاندان کے افراد کو یہاں پناہ دی تھی۔ دلاور حسین (پرسپل ایم، اے او کالج، امرتسر) شیخ حوام الدین (احمدی لیڈ) مولانا محمد حسین عرشی (مشہور شاعر اور عالم) وغیرہ انھیں پناہ گزینوں میں تھے۔ قاصر صاحب کا بیش قیمت کتابخانہ بھی اسی حادثے میں جل کر راکھ ہو گیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے مکان کے جل جانے کا اتنا افسوس نہیں، جتنا ان قیمتی کتابوں کے تلف ہونے کا، جسے مجھے جان سے زیادہ عزیز تھیں۔

میں ان کے والد کی وفات کے واقعے کو بیان کرتے ہوئے بہت دوڑ بھاگ گیا۔ قاصر صاحب کے ماں باپ نے اپنے گورو کے مشورے سے ان کا نام برہم داس رکھا تھا، لیکن انھوں نے بعد کو اسے بدل کر برہم ناتھ کر لیا کہ بہر حال، داس (غلام) سے ناتھ (مالک) آقا بہتر ہے۔ پڑھنے لکھنے کی منزل آئی، تو انھیں مقامی پرائمری مدرسے میں بٹھا دیا گیا۔ یہاں پانچویں درجہ تک تعلیم کا انتظام تھا۔ مڈل کے درجوں کے لیے گورنمنٹ نوالہ جانا پڑا۔ اور دسویں کی سند دیاں سنگھ ہائی اسکول، لاہور سے حاصل کی۔ اب انھوں نے دیانند میٹروپولیٹن کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ لیکن خدا معلوم کیا بچوگ پڑا کہ پڑھنے لکھنے

سے دل اچاٹ ہو گیا، مشکل سال بھر یہاں رہے ہونگے۔ والد نے دیکھا کہ بیٹا پڑھنے کی گول کا نہیں۔ تو اسے پولیس میں بھرتی کرادیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے اثر و رسوخ سے اسے جلد ترقی دلوں اور تھانیدار بنوادیں۔ لیکن یہ پیشہ صاحبزادے کی پسند کا نہیں تھا۔ چنانچہ جب وہاں سے حاضری کا پروانہ آیا، تو یہ حاضر نہ ہوئے۔ والد کو اس کی خبر ملی، تو سخت ناراض ہوئے؛ اور اپنی خفگی کا اظہار اس طرح کیا کہ کہا: اگر ہماری نہیں مانتے، تو جاؤ جہاں سینک سمائیں، وہاں چلے جاؤ۔ والدہ، جب یہ ابھی دس بارہ برس کے تھے، جنت سدھار چکی تھیں۔ گھر میں اور کون تھا، جو والد کے اس جبریل حکم پر احتجاج کرتا۔ یا انھیں پناہ دے سکتا تھا! یہ بھی اپنی سہٹ کے پکے؛ پاپیادہ گھر سے کل کھڑے ہوئے، اور کہاں کہاں کی خاک چھاننے کے بعد قلیل تنخواہ پر ٹالہ (ضلع گورداسپور) کے ایک تاجر کے ہاں نوکری کرلی۔ پھر اسی کے ساتھ دہلی چلے آئے اور یہاں ایک درآمد برآمد کار کام کرنے والی تجارتی فرم میں ملازم ہو گئے۔ کوئی سال بھر یعنی ۱۹۱۲ء تک یہاں رہے۔ اس کے بعد امرتسر چلے گئے اور وہاں ایک دوسری فرم ڈیسریزیلی رام بہادی لال کے ہاں ملازمت کرلی؛ ان کی بدیسی فرموں سے خط و کتابت ان کے ذمے تھی۔

تدوین بعد انھوں نے یہ ملازمت ترک کر دی اور امرتسر ہی میں اپنا ذاتی کاروبار شروع کر دیا۔ وہ یہاں سے سو فی تاگا و ساد کو برآمد کرتے تھے۔ تجربہ موجود ہی تھا اور محنت مشقت گھٹی میں پڑی تھی۔ اس پر زور قلم، اور سب سے بڑھ کر ایمانداری اور خلوص گویا کامیابی کے تمام اسباب موجود تھے۔ خدا نے برکت دی اور وہ کامیاب تاجروں میں گئے۔ بدیسی منڈیوں میں ان کی بڑی ساکھ تھی اور وہاں کے تاجروں کو ان پر بھروسہ تھا؛ ان کی تین تین ہینے کی ہنڈ دی جمع ہو جاتی تھی۔ ان کا یہ کاروبار ۱۹۵۴ء تک بہت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ اس سال حکومت نے درآمد برآمد پر سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ عمر کے ساتھ صحت بھی آہستہ آہستہ جواب دینے لگی تھی؛ اور وہ بیکروٹی اور طینا سے کام کرنے کے لائق نہیں رہے تھے۔ لہذا انھوں نے یہ سلسلہ بند کر دینے میں عافیت دیکھی؛ اور اس کے بعد سہ ماہی و ادب کے لیے وقف ہو گئے۔

شعر گوئی انھوں نے، ۱۹۰۶ء میں شروع کی، جب وہ ہنوز آٹھویں درجے کا طالب علم تھے؛ مگر پانچ چھ برس تک کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ جب ۱۹۱۲ء میں امرتسر آئے، تو حکیم فیروز الدین فیروز دطغرائی کے سامنے زادے تلخذا تہ کیا۔ حضرت فیروز دطغرائی اس پایے کے صاحب علم و فضل بزرگ تھے، جن پر خطہ پنجاب کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ افسوس، ان کی مکاتفہ، قدر نہیں ہوئی، جس کے لیے ان کی گوشہ نشینی اور استغنا بھی بہت حد تک ذمے دار ہیں۔ ۱۸۸۲ء میں امرتسر کے ایک سربراہ آوردہ کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں پشتوں سے تجارت کا سلسلہ چلا آ رہا تھا، قسمت کی بات، کاروبار میں لاکھوں کا خسارہ ہوا۔ ان کے والد اس صدمے کی تاب نہ لاسکے، اور حرکت قلب بند ہو جانے سے آنا فانا جان بحق ہو گئے۔ اس وقت فیروز الدین احمد کی عمر یہی ڈیڑھ دو برس کی تھی۔ کبھی کبھی جاداد لوالہ خفین نے خرد برد کر دی، اور فیروز الدین احمد کو یا ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی قلاش ہو گئے۔ ملک الایام ندا و لکھا میں الناس۔

جہاں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوں، وہاں تعلیم کا کیا سوال! سن شعور کو پہنچے، تو ہووے ماں نے یتیم بیٹے کو محلے کی مسجد کے محنت میں بھیج دیا۔ وہاں قرآن اور عربی تو پڑھنا ہی تھی، لیکن اس سے کہیں زیادہ انھیں پڑوس میں رہنے والے ایک ایرانی بزرگ سے فیض پہنچا۔ ان سے رفتہ رفتہ فارسی میں وہ جہارت پیدا کر لی، جس نے انھیں بعد کو گیارہ روزگار بنا دیا۔ دس برس کے تھے، جب قرآن اور دینیات کی بیشتر کتابیں ختم کر چکے تھے۔ لیکن کسب معاش کا مسئلہ اتنا اہم تھا کہ انھیں لازماً کوئی کام کرنے کی ضرورت تھی۔ اس پر انھوں نے دفوگری کا پیشہ اختیار کیا، جس سے اپنا اور ماں کا پیٹ پالنے بھر کی کمائی ہونے لگی۔ دفوگری محنت اور دیدہ دیری کا ہمہ وقتی کام ہے۔ تاہم اس سے جو وقت بچتا، اس میں مختلف موضوعات کی فارسی اور عربی کی ادنیٰ کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ لیکن وہ دفوگری سے عاجز آ گئے۔ آخر اسے چھوڑ کر چونگی میں محو ہو گئے کہ اس میں فراغت اور تعلیم حاصل کرنے کے نسبتاً زیادہ امکانات تھے۔

چونکہ خدا نے دل و دماغ کی صلاحیتیں بدرجہ وافر و دیوت کی تھیں، بہت جلد، کسی استاد کی مدد کے بغیر، ترقی کی منازل طے کر کے اردو اور پنجابی میں شعر کہنے لگے جس نے سنا، اس نے داد دی، دل بڑھایا اور یوں ان کی شہرت پھیلنے لگی۔ اور تو اور مقامی ماہنامے "میسما" کے مدیر کی جگہ خالی ہوئی، تو اس پر ان کا تقرر ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب کہن سال استاد مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی (ف: دسمبر ۱۹۲۲ء) نے "مجدد السنہ ترقیہ" کے بلند بانگ دعوے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام پر جرح و قدح کا طوفان بپا کر دکھایا تھا۔ فیروز طغرانی نے "میسما" میں خود مولانا شوکت میرٹھی کے کلام لکھا جائزہ لینا شروع کیا، اور ستم یہ ہوا کہ اس کی خامیاں دکھا کر اصلاح بھی دے دی۔ شوکت سے کوئی جواب نہ بن پڑا، تو چپ سادھ لی۔ اس پر فیروز طغرانی نے ایک اور چٹکی لی اور اپنے پرچہ میں اعلان کر دیا کہ چونکہ مولانا شوکت نے ہمارے اعتراضات پر خاموشی اختیار کر لی ہے، اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ انھوں نے "کل اعتراضات" اور اصلاحوں کو تسلیم کر لیا ہے اور اس میں انہیں کوئی کلام نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو وہ ضرور مدلل تردید کر کے ہمیں قائل کرتے۔ مولانا شوکت نے دیکھا کہ پانی سر سے گزر رہا ہے۔ لہذا وہ امر تسریٰ پہنچے اور مقامی مشہور عالم مولوی شاعر امجد امجد تسریٰ کو بیچ میں ڈال کر فیروز طغرانی سے مصالحت کر لی۔ یہ واقعہ ۱۹۰۴ء کا ہے، جب فیروز طغرانی بمشکل ۲۲ برس کے تھے۔

"میسما" بند ہو گیا، تو فیروز طغرانی نے اپنا ذاتی ماہنامہ "ایشیا" جاری کیا۔ لیکن اس کے لیے جتنا سرمایہ درکار تھا، اس کا فراہم کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ کاروباری تجربہ بھی برائے نام تھا۔ اس لیے پرچہ جلد ہی بند ہو گیا۔ اس دور میں "دیکل" اخبار کا مالک بھرمی غلغلہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (ف: فروری ۱۹۵۸ء) اس کے مدیر اور مولانا عبداللہ عمادی (ف: اگست ۱۹۳۷ء) مترجم تھے۔ فیروز طغرانی ان کے معاون مقرر ہو گئے۔ ان کا کلام نظم و نثر بھی دیکل میں چھپنے لگا۔ لیکن جب ۱۹۰۶ء میں مولانا آزاد دیکل سے الگ ہو گئے تو فیروز طغرانی نے بھی یہ تعلق منقطع کر لیا۔

شمس الاطباء حکیم غلام جیلانی لاہوری (ف: فروری ۱۹۲۶ء کو اپنے تصنیفی کام کے لیے ایک معاون کی ضرورت تھی، جو عربی اور فارسی میں بہارتِ تامہ کا حامل ہو۔ انھوں نے سنا، تو فردزطرانی کو لاہور بلا لیا۔ یہ ساڑھے تین برس وہاں رہے حکیم غلام جیلانی کے نام سے جو عربی کی کئی کتابوں کے تراجم شائع ہوئے ہیں، ان میں سے بعض فردزطرانی ہی کا کارنامہ ہے، بقیہ کچھ اور اصحاب کی کاوشِ طبع کا نتیجہ ہیں، حکیم غلام جیلانی ایک ماسنامہ "رفیق الاطباء" بھی شائع کرتے تھے۔ اس زمانے میں فردزطرانی کے کئی مضمون (منتقل اور تراجم) اس میں بھی چھپے تھے حکیم غلام جیلانی کا تصنیفی پردگراں مکمل ہو گیا، تو فردزطرانی واپس امرتسر چلے آئے اور یہاں اپنا مطب کھول لیا۔ اس سے شہر کے اصحابِ علم و فن کو ضرور فائدہ پہنچا کہ بلا مانعہ آئے، ان کے پاس بیٹھتے اور استفادہ کرتے البتہ جہاں تک مطب کے ان کا ذریعہ معاش بننے کا تعلق ہے، وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ اب انھوں نے کوئی اور روزگار اختیار کرنے کی کوشش کی۔ بالآخر ٹھہری کو فارسی وغیرہ پڑھانے پر محکمہ تعلیم میں شامل ہو جائیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ انھوں نے کسی مدرسے میں باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی، نہ کوئی سند ہی ان کے پاس تھی؛ اور محکمہ تعلیم میں فوکری کے لیے یہ اہلِ اہل۔ لہذا اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر انھوں نے دوستوں کے کہنے سے پنجاب یونیورسٹی کائنشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد آسانی سے اسلامیہ اسکول امرتسر میں فارسی کے مدرس مقرر ہو گئے۔ پھر اسی حیثیت سے جموں تبادلوں ہو گیا اور دودھائی برس وہاں رہنے کے بعد واپس چلے آئے۔

اب کے امرتسر پہنچے، تو "وکیل" کے مدیر اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ لیکن یہ اس احیاء کا گویا سنبھالا تھا۔ جلد ہی اس کے مالکوں میں باہمی اختلاف پیدا ہو گیا۔ جب معاملات کسی طرح نہ سلجھے، تو ان لوگوں نے پرچہ ہی بند کر دیا۔ فردزطرانی پھر بیرونِ گار ہو گئے۔ جلد بعد انجمن حمایتِ اسلام لاہور نے انھیں اپنے شعبہ تالیف و تصنیف میں مصحح کی اسامی پیش کی، جو انھوں نے قبول کر لی۔ انجمن کے پاس جتنے مسودے آتے تھے، ان کی زبان کی تصحیح وغیرہ ان کے فرائض میں داخل تھی۔ لیکن اب انھیں لاہور کی آب و ہوا اور اس

ہنیں آئی؛ مسلسل بیمار رہنے لگے۔ اس لیے مستعفی ہو کر امرتسر واپس آ گئے۔ اس کے
تھوڑے ہی دن بعد ۸ فروری ۱۹۳۱ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ عمر پچاس کی بھی نہیں
تھی۔ ان کے شاگرد رشید حکیم محمد حسین عرشی نے تاریخ کہی،

ترتیبِ فرزندِ طغرائی کہ باد جلوہ انگن اندرونِ رخسار
جہتمش سالِ وفات از عارفی بے تامل گفت: "مغفورِ خدا"

آدم بر سرِ مطلب: قاصر صاحب بھی ۱۹۱۲ء میں ان کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ وہ استاد کے
عاشق تھے۔ ان کی تحریروں میں جہاں کہیں ان کا نام آیا ہے، ان کے علم و فضل، قابلیت و
صلاحیت، متانت و ثقاہت، شفقت و عظمت کے اعتراف اور تعریف میں ان کی زبان
سکھتی ہے۔

ان کی شادی ۵-۱۹ء میں پٹن دادن خان (ضلع جہلم) کے شری دھنپت رائے چھپر کی صاحبزادی
(دیران دیوی) سے ہوئی تھی۔ جناب دھنپت رائے بڑے متمول اور خاندانی آدمی تھے اور ان
کی بہت وسیع جاداد تھی۔ وہ ریاست جھالاوار میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے، لیکن
ہمارا جا کی کسی حرکت سے دل برداشتہ ہو کر مستعفی دے دیا اور وطن واپس چلے آئے۔
قاصر صاحب کے دو بیٹیاں (رسانی اور شکلا) اور ایک بیٹا (وشوانا) تھے۔ وشنو ۱۹۲۷ء
میں انتقال ہو گیا، جب قاصر صاحب کی عمر عرض ۳۶ برس کی تھی۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ
تھا، صحت اور صورتِ شکل میں بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ سب نے دوسری شادی کا مشورہ دیا، بلکہ
اصر اکیلا۔ لیکن اس مردِ خدا نے سب کو جواب دے دیا۔ وشنو انا تھا اس وقت صرف سال بھر
کے تھے (ولادت: ۲۰ مارچ ۱۹۲۶ء)۔ قاصر صاحب نے کہا کہ میں ان بچوں کے لیے ماں اور باپ
بن کر ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کروں گا۔ مجھے کسی اور چیز کی ضرورت ہے نہ آرزو۔ اور
یہ انھوں نے کر دکھایا۔ اس کے بعد وہ عمر بھر مجرور رہے۔

تقسیمِ وطن کے بعد بیشتر زمانہ امرتسر ہی میں گزرا۔ وفات سے کوئی نو دس مہینے پہلے اپنے
بیٹے وشنو انا تھا دتتا کے پاس کو روک تیریں رہنے لگے تھے۔ وشنو انا تھا صاحبِ گوشت کا دلچسپ
لاہور میں ایم اے کے طالبِ علم تھے کہ ملک تقسیم ہو گیا، اس پر انھوں نے مشرقی پنجاب یونیورسٹی

سے ایم اے کیا اور پھر ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے دوبارہ ماسٹریج میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد ولایت چلے گئے اور وہاں کیمبرج یونیورسٹی سے ایم لٹ کی سند حاصل کی۔ آج کل گوڈوٹر یونیورسٹی میں صدر شعبہ تاریخ اور سوشل سائنس فیکلٹی کے ڈین ہیں۔

قاصر صاحب کا ذیابیطس کا مرض پرانا تھا؛ دل کا عارضہ بھی تھا۔ زندگی کے آخری ۲۵ برس کم و بیش علالت ہی میں بسر ہوئے۔ یہی کیا کم تھا کہ کیتسر ہو گیا۔ لیکن موت کا بہانہ عارضہ دل ہوا۔ ۲۵ نومبر ۱۹۷۵ء کو حرکت قلب بند ہوجانے سے رگہ رگہ عالم جادوئی ہو گئے۔ انھوں نے موت کا جس خدہ پشانی سے خیر مقدم کیا اور جیسے آخر تک خاندان کے مختلف افراد اور دوسرے حاضرین سے باتیں کرتے رہے۔ ”وہ بستم بستم اوست“ کا حیرتناک نمونہ تھا۔ حقیقتاً ان کی موت سے ایک عظیم انسان ہم سے جدا ہو گیا۔ ایسا خوددار اور نڈر آدمی دیکھنے میں نہیں آیا۔ وہ سیاسی تحریک کے زلزلے میں قید رہے تھے؛ جلیانوالہ باغ امرتسر کے المناک سانحے کے وقت وہاں موجود تھے اور اسی کے بعد ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔ لیکن اس کے باوجود کہ بعد کے زلزلے میں ان کے تمام سیاسی اکابر سے ذاتی تعلقات تھے، انھوں نے انعام پدم و خدیو طلب کرنا تو درکنار، کبھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ وہ سچے وسیع المطالعہ شخص تھے۔ چونکہ فادسی اور انگریزی میں دستگاہِ کامل تھی، اس لیے مذاہب عالم اور فلسفہ اور تاریخ کا خاص طور پر مطالعہ کیا تھا۔ اسی سے ان کی اپنی زندگی بالکل قدیم فلاسفہ اور روحانی پیشواؤں کی سی ہو گئی تھی۔

متعدد کتابیں ان سے یادگار ہیں: (۱) ڈال ڈال، پات پات (مکتوبات، ۱۹۶۱ء) (۲) پرچم ضیا (۱۹۶۱ء)؛ (۳) جواہر پارے (۱۹۶۲ء)؛ (۴) گلاب (کلام اردو)؛ (۵) اہل سیف (۱۹۶۴ء)؛ (۶) ہومر (۱۹۶۵ء)؛ (۷) میراجی (۱۹۶۶ء) (۸) ذکر و فکر (کلام، ۱۹۶۷ء) منکھ مکتوب الیہ میں وہ خطوط جمع کیے تھے، جو ان کے احباب نے ان کے نام لکھے تھے۔ ان کی شرماتیل و ذل کا نمونہ ہے۔ سلاست اور ایجاز بیان ان کے جوہر خاص تھے۔ چونکہ علم و ادب پر گہری نظر تھی اور حافظہ بہت قوی تھا، اس لیے اپنے نقطہ نظر کے اثبات کے لیے تحریر میں تاریخی اور مذہبی تعلیمات کثرت سے استعمال

کرتے تھے حکومت ہندوستانی خدمات کے اعتراف میں انھیں ۱۹۶۹ء میں "پدم شری" کا اعزاز عطا کیا تھا۔

اب ان کے چند شعر دیکھیے:

وہ قلعہ گاہ میں ہے خنجر آزمایا قاصر! چلو کہ وقت ہے اب قسمت آزمائی کا
 کساک کیسی ہے یہ دردِ ہنساں کی سینس ہم بھی تو، قاصر! آپ کا داغ
 بسنے کا لطف خاک ہے ہمدرد! جہاں میں جیسا ہے اپنے بس میں نہ موت اختیار میں
 ہزارا بلبے ہم، ہزار بار سے جہاں میں نقشِ کفِ پائے رہڑاں کی طرح
 حرم میں، دیر میں کیا اختلاف ہے قاصر! یہاں بھی ان کے طلب گار ہیں وہاں کی طرح
 بشر کو چاہیے آہستہ آہستہ ہو، اسے قاصر! نہ مود کا بھی سردارہ دل دکھا کے چلے
 بلبل کو دیکھنا ہوں کہیں، گرچہ سنے دوں ردائوں زار زار کہ خود ہوں وطن سے دور
 حسیں ہیں اور بھی دنیا میں، لیکن محبت ہو گئی ہے کچھ تھیں سے
 کسی کے گیسو ورنج کی یہ قمیض ہے غرض ہے کھڑے ہم کو، نہ دیں سے
 بتاؤ، دل دیا ہے کس کو، قاصر! نظر آتے ہو کچھ اندوہ گیسو سے
 یہ سادگی بھی عجب سادگی ہے، اسے قاصر! کسی نے وعدہ کیا، تم نے اعتبار کیا
 کیا کہوں خود کو مٹا دینے کے قاصر فائدے

دائے خرم بن گیا، مٹی میں مل جانے کے بعد

شورشِ سرمو سم گل پر نہیں ہے منحصر جوشِ وحشت ہو رہا ہے بار بار اب کے برس
 کیسے دن آئے ہیں، قاصر! گردشِ تقدیر سے دل ہے کچھ حد سے زیادہ بقیہ اب کے برس
 لے جا کے اس گلی میں، یہ دل نے کہا مجھے پہنچا دیا یہاں آتھے، آگے نہ افسیب!
 ساتھ ہی اس کے نکل آئیگا دل میرے سینے سے نہ ظالم! تیر کھینچ
 آخر شب، وقت ہے تاثیر کا دل سے قاصر! نالہ شکر، کھینچ
 ہوتی ہے ان کی باتیں، "نہیں" بھی ملی ہوئی

اقراء بھی وہ کرتے ہیں، انکا دکھ کی طرح

اپنے ہی پہلو میں دشمن ہو، تو کوئی کیا کرے !

دل سارا آشنا کا، نا آشنا کا ہو گیا

ہواے باغ کی ہے، ہم صیغروا کس کو آگاہی

یہاں کبجِ قفس ہی میں ہوئے ہیں بالِ دہر پیدا

حال پوچھو نہ زندگانی کا ہے کرم مرگب ناگہانی کا

آلامِ عشق، راحتِ پیہم سے کم نہیں اے بواہوس ! یہ زخم بھی مرہم سے کم نہیں

منحصر دیکھا کرم کو جرم پر، تو حشر میں بیگنا ہی بول اٹھی میں بھی گنہگاروں میں ہوں

خمصے سود و زیاں کے اس تجارت میں نہیں میں دل و جاں سے محبت کے خریداروں میں ہوں

نہیں آتا کبھی مالہ بلوں تاب ہمارا ضبطِ غم ہے کیا فغاں سود

نہ ترے دل میں جگہ ہے، نہ تری محفل میں اب وہ اخلاص کہاں، دور کے نظار میں

آنکھیں مری کھلی ہیں، اسیری میں ہم صیغرا کبجِ قفس میں خاک کہوں، جہلے دل

زندگی کا کوئی مقصد نہیں، قاصرِ معلوم خواب دلچسپ ہے، پر حاملِ تعبیر نہیں

سر پھوٹنے کو سنگِ سر راہ کم نہیں دیوانگی میں کیا ہے دردِ بام سے غرض

رسوائیاں کسی کی محبت میں ہیں، تو ہوں مطلب، ننگ سے نہ ہمیں نام سے غرض

قاصر ہو ان پہ حالِ دل را ز منکشف اتنی ہی بس ہے شکوہِ آیام سے غرض

نا رسا آہ، غد و چرخ، زمانہ دشمن اپنی بگردی ہوئی تقدیر بنائیں کیونکر

کیا رسوا محبت میں مجھے فریاد و شیون نے

اگر تاب تحمل ہو، تو دنیا را ز داں کیوں ہو !

سراغ ان کا اگر پاؤں، تو ان سے اس قدر پوچھو

نہاں ہو کر عیاں کیوں ہو عیاں ہو کر نہاں کیوں ہو !

یہ جانتا ہوں کہ اچھی نہیں ہے بتیابی

ہو ضبطِ خاک، اگر دل کو تاب ہی نہ

ابوالکلام آزاد

اک جہانِ علم و فضل، اک کائناتِ عقل و ہوش
 عرشِ اعلیٰ سے زمیں کے نامِ پیغامِ سر و شوش
 ایک کوہِ استقامت، پیکرِ عزم و ثبات
 ایک بحرِ بیکرانِ رازِ باہرے کائنات
 ایک دل، دانندہ اسرارِ خلقِ نگاہِ ذات
 اک نظرِ بینندہ نظارہٴ حسنِ صفات
 تھے صفات اس کے فقط شرحِ فروعِ حسنِ ذات
 ذات تھی اس کی فقط نظارہٴ حسنِ صفات
 اس کی شخصیت میں پنہاں ایک بکتِ اکجاں
 ایک بزرگِ گل میں اقصاں رنگِ بے گلستاں
 وارثِ عہدِ قدیم و خالقِ عصرِ جدید
 مصدرِ فکرِ سلیم و مخزنِ خُلقِ حمید
 مرجعِ اہلِ سیاست، مرشدِ اصحابِ دین
 مطلعِ انوارِ عرفان، مشرقِ مہرِ یقیں
 رزم میں تیغ و سناں، اور بزم میں باغ و بہار
 ایک طرحِ آتشِ فشاں، اور دوسرا رخِ لالہ بار
 صورتِ مسحور کن سے، یوسفِ مصرِ جمال
 نطقِ دلکش سے، کلیمِ طورِ عرفان و کمال
 زندگی افزا، حیاتِ افروز، اس کا سرِ سخن
 بہرِ تخلیقِ مقاصدِ عزم اس کا حرفِ کن
 اس کے ہر لفظ میں صد رمزِ علم و آگہی
 اس کی درویشی کے سر پر سرنگوں شاہنشاہی

شرع و ملت کا امیں، فقہ و سیاست کا امام
 وہ فصاحت کا، بلاغت کا، صحافت کا امام
 جس نے دیکھا اور سمجھا طرز و طورِ بوالکلام
 اس پہ ثابت ہے کہ ہے یہ دورِ دورِ بوالکلام
 قریبا بایک کہ تاریخِ مردِ حر و دعوایاں
 عبدہ در ملکِ مصر، آزاد در ہندوستان
 جس کے اک اک لفظ میں پنہاں تھی جانِ ندگی
 بزم میں جس کا حکم تھا نشانِ زندگی
 جس کا لفظِ سحر انگن سر بسرِ سخن تھا
 جس کا فکرِ عرش پیدا ہر کی تفسیر تھا
 ملک ہے خروم آج اُس عظمتِ کردار سے
 تشنہ ہے ذوقِ ادب اُس ندرتِ افکار سے
 سرزمینِ ہند دقتِ یاسِ بے اندازہ ہے
 دفترِ علم و بصیرت آج بے شیرازہ ہے
 آسماںِ راجی بود گھرِ خوں بیار و بزمِ زمیں
 بہرِ وفاتِ حضرتِ آزاد، امیرِ ملک دیں

سید مسعود حسن رضوی ادیب اور وکیل

جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، مسعود صاحب نسباً سید تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ خاندان مغلیہ کے زمانہ زوال میں نیشاپور سے ہندستان آئے۔ یہاں ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی اور وہ لگاتار بعد نسل حکومت میں مختلف عہدوں پر متمکن رہے، جاگیریں بھی عطا ہوئیں، اور منصب بھی۔

مسعود سن ۱۵ محرم ۱۳۱۱ھ (مطابق ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء) کو بہرائچ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید مرتضیٰ حسین صاحب علم بزرگ اور پیشے کے لحاظ سے طبیب تھے۔ وہ دراصل بنواری ضلع آٹاؤں کے رہنے والے تھے، لیکن کھنڈو میں تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے بہرائچ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے ملنے والے ان کی حذاقت فن اور اشتغالات طبع کے معترف تھے۔ ان کا ۸ شوال ۱۳۱۹ھ (۲۸ دسمبر ۱۹۰۳ء) کو انتقال ہوا۔ انھوں نے اپنے پیچھے تین خرد سال بچے چھوڑے: سید مسعود حسن؛ اور ان کے چھوٹے بھائی سید آفاق حسین رضوی (یہ پیشے کے لحاظ سے ہویمو پیٹھک ڈاکٹر ہیں) ولادت: ۱۱-۱۱-۱۱ اور ایک بیٹی سیدہ بیگم جو مسعود حسن صاحب سے صرف ڈھائی سال چھوٹی تھیں؛ یہ اپنے خاندان کے ساتھ بہرت کر کے لاہور میں مقیم ہو گئی تھیں؛ وہیں انتقال ہوا۔

سید مسعود حسن صاحب نے خود کھانا کھا، چار برس، چار مہینے، چار دن کی عمر میں میری رسم پڑھائی ہوئی۔ ان کے والد انھیں بھی اپنی طرح "طبیہ یونانی کا ماہر اور علوم اسلامی کا عالم"

بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی تعلیم اسی پنج پر شروع ہوئی۔ لیکن والد کی بیعت و تقی نے اس کا رخ بدل دیا۔ حالات جید ناسازگار تھے، اور گرو دستگیروں اور سہرہ دوں سے دشمن اور بدخواہ زیادہ۔ ایسے میں بھی اس دور یتیم نے ہمت نہیں ہاری اور مالی مشکلات اور مناسب مشورے کے فقدان کے باوجود اپنا تعلیمی دور نہایت شاندار طریقے پر بسر کیا۔ ابتدائی تعلیم نجی طور پر ہیرا راج میں ہوئی۔ یہاں زیادہ تر اردو سے مزاد لیت رہی۔ اس کے بعد لکھنؤ آئے اور خیر آباد ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا، جہاں درجہ میں لیے گئے۔ بہر حال اس کے بعد تعلیمی زمانہ بہت کامیاب رہا۔ اسکول کے زمانے میں ہر درجہ میں اول آئے اور ہر مضمون میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرتے رہے۔ بالآخر ۱۹۱۷ء کیننگسمان ہائی اسکول سے بی، اے کی سند لی۔ اگلے برس (۱۹۱۷ء) ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا، لیکن تندرستی خراب ہو جانے کے باعث امتحان میں شامل نہ ہو سکے۔

اسی زمانے میں صوبہ متحدہ شمال و غرب (حال اتر پردیش) میں ایک نئی اسامی نکلی۔ کام یہ تھا کہ صوبے میں جو کتاب چھپے، اس کے ضروری کوائف سرکاری گزٹ میں شائع ہوں۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں سید مسعود حسن کا اس اسامی پر اقرار ہو گیا۔ وہ یہاں ساڑھے تین سال رہے۔ انھوں نے خود کوئی جگہ لکھا ہے کہ میں نے اس دوران میں مختلف علوم کی چھوٹی بڑی تقریباً دس ہزار کتابیں مطالعہ کیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں ہر طرح کی ضخامت کی کتابیں ہونگی۔ کچھ بھی ہو، روزانہ اوسطاً آٹھ کتابوں کے مجموعی صفحات ۳۵۰۰ سے کم کیا ہونگے! اور یہ مطالعہ مسلسل تین برس تک جاری رہا۔ صرف یہی نہیں، وہ ان مطبوعات کی فہرست بناتے، ہر ایک کا خلاصہ تیار کرتے، اور اس پر تبصرہ لکھتے۔ یہ کوائف یو پی کے سرکاری گزٹ میں ہر تیسرے مہینے چھپتے تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس متنوع مطالعے کا ان کے دل و دماغ کی تشکیل اور علم و عرفان کی تکمیل پر کیا اثر ہوا ہوگا! یہ حقیقت ہے کہ بعد کی زندگی میں ان کی محنت کی عادت اور تصنیفی فزولت کی بنیاد اسی زمانے میں پڑی۔

ہ کاش! کوئی اللہ کا بندہ ان مضامین کا کھوج لگا کر انھیں جمع کر دیتا۔

۱۹۲۲ء میں انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے "ایل ٹی" (یعنی پڑھانے کی سند) حاصل کی اور اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول، فتح گڑھ میں مدرس مقرر ہو گئے۔ لیکن اس کے چھ سات سہفتے بعد ہی انھیں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے جوینیئر لیکچرر کے عہدے کی پیشکش ہوئی۔ حال آنکہ اس نئے عہدے کی تنخواہ اور مستقبل کی توقعات فتح گڑھ کی مدرسے سے ہمیں کم تھیں، انھوں نے فتح گڑھ کو خیر باد کہا، اور اپنے وطن ثانی لکھنؤ چلے آئے، جہاں اردو کی خدمت کے مواقع زیادہ تھے۔ یہیں سے انھوں نے اثنائے ملازمت میں ایم، اے (فارسی) کی سند درجہ اول میں حاصل کی (۱۹۲۴ء) اس نمایاں کامیابی پر انھیں یونیورسٹی کی طرف سے طلائی تمغہ بھی عطا ہوا تھا۔

وہ درجہ بدرجہ اردو کے سینئر لیکچرر (۱۹۲۷ء)، فاری ریڈر (۱۹۳۰ء) اور صدر شعبہ اردو فاری (۱۹۳۰ء) مقرر ہوئے۔ آخر کار طویل انتظار کے بعد ۱۹۵۳ء میں پروفیسر مقرر ہوئے، اور ۳۲ سالہ کامیاب ملازمت کے بعد یہیں سے جون ۱۹۵۴ء میں سبکدوش ہوئے۔ ان کے زمانہ تدریس میں لکھنؤ یونیورسٹی میں علم و تحقیق کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ سچ ہے شمع لاکھ اندھیرے میں کیوں نہ دکھ دی جائے، اس کا ارد گرد منور ہو جاتے ہیں۔ ان کی بدولت یونیورسٹی کتابخانے کے مشرقی شعبے میں بھی بہت ترقی اور توسیع ہوئی۔

وہ ابھی تعلیم کے ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کر سکے تھے کہ ۱۹۱۰ء میں انھیں درود سرکا مودی عارضہ لاحق ہو گیا اور اس کے بعد وہ سات آٹھ برس تک مسلسل اس کا شکار رہے۔ بدقسمتی سے بعد کے زمانے میں اس پر تجنیر کی شکایت متسلزاد ہو گئی۔ توام شروع سے کچھ کمزور تھا، ان عوارض نے اور بھی بدھال کر دیا۔ کوئی اور موتا، تو ہتھیار ڈال دیتا۔ ہمیں آفرین ہے ان کی ہمت پر کہ انھوں نے نہ تعلیم سے ہاتھ اٹھایا، نہ کبھی محنت سے جی حرا یا۔ خدا نے بھی مدد کی اور وہ ملام کی شکلات کے باوجود ترقی کے منازل طے کرتے چلے گئے۔ اردو سے انھیں دلچسپی ہی نہیں، عشق تھا۔ ان کی دوسری دلچسپی فارسی سے تھی۔ اسی شوق کی تسکین کے لیے انھوں نے ۱۹۳۳ء میں فارسی کے گہوارے اور سندھان کی تاریخ و تمدن کے منبع ایران کی سیاحت کی۔ واپسی پر عراق گئے اور وہاں مقامات

کی زیارت کرتے ہوئے وطن واپس آئے۔ یہ سفر خالص علمی ذوق و شوق کا نتیجہ تھا، اور مولانا محمد حسین آزاد کے سفر ایران کے بعد اپنی نوعیت کا غالباً دوسرا سفر تھا۔

مسعود صاحب ۵۵ برس تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ ذیل میں ان کی نصف صدی کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ امتحان وفا (۱۹۲۰ء) انگلستان کے ملک شہر ایسی سن کی طویل نظم انیکا رڈن کا نثری ترجمہ، دیباچے اور حواشی کے ساتھ۔

۲۔ دستان اردو (۱۹۲۵ء) بچوں کے لیے نظم و نثر کے اسباق۔

۳۔ ہماری شاعری (۱۹۲۷ء) اس میں اردو شاعری پر جو اعتراض کیے جاتے ہیں ان کا مدلل جواب دیا ہے۔ اسے حالی کے ”مقدمہ شہر و شاعری کا تہمتہ خیال کرنا چاہیے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ ۱۹۷۱ء تک اس کے گیارہ ایڈیشن خود مصنف نے شائع کیے۔ ان کے علاوہ چودا شہروں نے اسے تین مرتبہ ان کی اجازت کے بغیر چھاپ لیا۔

۴۔ فرنگ امثال (۱۹۲۸ء) اس میں فارسی عربی کے تقریباً ۱۲۵۰ امثال کا ترجمہ اور محل استعمال بتایا ہے۔ اس کے مزید دو ایڈیشن ۱۹۳۸ء اور ۱۹۵۸ء میں

چھپے۔
۵۔ مجاہدین رنگین (۱۹۲۹ء) سعادت یار خان رنگین کی قابل قدر کتاب مقدمے اور اشعار پر اور رجال و بلاد کی وضاحت کے ساتھ۔

۶۔ فیض میر (۱۹۲۹ء) میر نے یہ کتاب فارسی میں لکھی تھی۔ رضوی صاحب نے فارسی متن پر مختصر اردو ترجمہ اور حواشی و فرنگ کا اضافہ کیا۔ یہ دوسری مرتبہ ۱۹۶۳ء میں چھپی۔

۷۔ نظام اردو (۱۹۳۱ء) آرزو لکھنوی کی کتاب ہے اس میں تیسوق کلمات اور مرادفات کے وصول وغیرہ سے بحث ہے۔ مسعود صاحب نے اس پر مفصل تشریحی حواشی کا

اضافہ کیا ہے۔

۸۔ ردیہ انیس (۱۹۳۱ء) اس میں انیس کے سات مرثیوں کا انتخاب، کچھ سلام اور رباعیاں و فرنگی اور حواشی کے ساتھ شامل ہے۔ یہ کتاب مزید چار مرتب (۱۹۵۰ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۸ء، ۱۹۷۲ء) میں شائع ہوئی۔

۹۔ جو اہر سخن (۲) (۱۹۵۳) ہندستانی اکادمی، الہ آباد نے اردو شاعری کا انتخاب چار جلدوں میں شائع کیا تھا؛ اس کی دوسری جلد محمد حسین چراگوتی نے مرتب کی تھی۔ مسعود صاحب اس کی تصحیح کی تھی۔ یہ جلد عہد میر کے شعرا کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ شروع میں ہر ایک شاعر کے مختصر حالات بھی دیے گئے ہیں، جس سے اس کی شکل تذکرے کی ہو گئی ہے۔

۱۰۔ شامک برائیس (۲) ۱۹۴۴ء میں انیس کا مشہور مرثیہ ”جب قطع کی مسافت شب فدا ہے“ محنت منن اور فرنگی کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ اس کی کتابت لکھنؤ کے مشہور خطاط مرزا جو آدم مرحوم نے کی تھی اور اس کے ساتھ کچھ تصویروں بھی تھیں۔ یہ نظامی پر لکھنؤ سے پوری آب و تاب کے ساتھ چھپا تھا۔ اس کی قیمت ۲ روپائی تھی۔ مذہبی حلقوں نے ان تصویروں کی سخت مخالفت کی تھی جس پر بعد کو انھیں کال دینا پڑا۔

۱۱۔ فائز دہلوی اور دیوان فائز (۱۹۴۶ء) اس کی اشاعت کے بعد جلد ہی ملک تقسیم ہو گیا اور اسی کے ساتھ کتاب کے بیشتر نسخے بھی ضائع ہو گئے، اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ مسعود مرحوم نے جس محنت سے متن کی تصحیح کی ہے اور فائز کے حالات جمع کیے ہیں، اس کی تمام دیدہ و نقدادوں نے داد دی ہے۔

۱۲۔ متفرقات غالب (۱۹۴۷ء) مسعود صاحب کے پاس ایک بیاض تھی جس میں غالب کے ۴۹ فارسی خطوط اور کچھ متفرق اردو فارسی منظوم کلام شامل تھا۔ اس کو انھوں نے ایک مسودہ منقذے (۱) و ضروری حواشی کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن غالب صد سالہ برسی کے موقع پر ۱۹۶۹ء میں چھپا۔

۱۳۔ اردو زبان اور اس کا رسم خط (۱۹۲۸ء) یہ بھی دوسری مرتبہ ۱۹۶۱ء میں چھپی۔
۱۴۔ آب حیات کا تنقیدی مطالعہ (۱۹۵۴ء) مرحوم کا مولانا محمد حسین آزاد کی انشاء اور تحقیق، دونوں پر ایمان تھا۔ اس مختصر کتاب میں انھوں نے ان اعتراضوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، جو آب حیات پر کیے گئے ہیں۔ حذف و اضافہ کے جدید کتاب دوسری مرتبہ ۱۹۶۲ء میں چھپی تھی۔

۱۵۔ مذہب نامہ آئیں (۱۹۵۷ء) انیس کے متعدد مرثیوں کا انتخاب ایک لڑی میں پردہ کر مسرہ داستان واقعات کو بلا مرتب کی ہے۔ کہیں کہیں ربط قائم کرنے کی خاطر اپنی طرف سے کوئی شعر یا مصرع بھی اضافہ کیا ہے، جس کا اعتراف دیباچہ مرکب میں موجود ہے، لیکن افسوس کہ متن کتاب میں کسی جگہ حاشیے میں نشاندہی نہیں ملتی کہ یہ اضافہ کہاں ہے، تاکہ قارئین کو التباس نہ ہو تاکہ کوئی کلام انیس کا ہے اور کونسا مرتب کی طرف سے اضافہ۔ اس کتاب پر انڈین حکومت نے ایک ہزار کا انعام عطا کیا تھا۔

۱۶۔ تذکرہ نادر (۱۹۵۷ء) از مرزا کلبچین نادر اس میں ۵۲۵ شعرا کے حالات ہیں۔

۱۷۔ فسانہ عبرت (۱۹۵۷ء) عجمی کے مصنف رجب علی بیگ سرور کی یہ نسبتاً کم مشہور کتاب ہے، اسی کو کتب معمول عمدگی سے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

۱۸۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج (۱۹۵۷ء) اس کتاب پر یوپی حکومت کی طرف سے ایک ہزار روپیہ کا انعام ملا تھا۔

۱۹۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج (۱۹۵۸ء) اس پر بھی انڈین حکومت نے ایک ہزار انعام دیا تھا۔

۲۰۔ اردو ڈراما اور اسٹیج (۱۹۵۸ء) یہ درمل (۱۸) اور (۱۹) کا مجموعہ ہے اسی کتاب پر مرحوم کو ۱۹۶۰ء میں سائبیہ اکاڈمی کا پانچ ہزار کا انعام ملا تھا۔ ان تینوں کتابوں میں انھوں نے خوب خوب داد و تحیق دی ہے۔ امت کی اندر سبھا کا صحیح متن پیش کیا ہے اور اس کی حیثیت متعین کی ہے۔ یہ تینوں کتابیں دوسری مرتبہ ۱۹۶۸ء میں

شائع ہوئی تھیں۔

۲۱۔ آئینہ سخن فہمی (۱۹۵۹ء) سید محمد احمد بنخود موہانی نے ادیب صاحب کی کتاب "ہادی شاعری" پر اپنے دو رسالوں جو ہر آئینہ اور منظر آئینہ میں اعتراض کیے تھے، یہاں انھیں کا رد کیا گیا ہے۔

۲۲۔ گلشن سخن (۱۹۶۵ء) مروان علی خان تبلا کا تذکرہ شعراے اردو۔
۲۳۔ ایرانیوں کا مقدس ڈراما (۱۹۶۶ء) ایران میں زمانہ محرم میں تعزیہ شبیہ گردانی کا رواج ہے۔ اس موقع پر جو رسوم ادا کی جاتی ہیں، ان کی شکل مذہبی ڈرامے کی سی ہے، یہاں اسی کا بیان ہے۔

۲۴۔ قواعد کلیتہً بھاکا (۱۹۶۸ء) کتاب تحفۃ الہند کا پہلا باب

۲۵۔ اندر بھاکا (۱۹۶۸ء) امانت کی مشہور نظم

۲۶۔ ناہکرت "نبرم سلیمان" (۱۹۶۸ء)

۲۷۔ شاعر اعظم انیس: مختصر تعارف (۱۹۶۹ء) اس میں منتخب کلام بھی شامل ہے۔

۲۸۔ گارشات ادیب (۱۹۶۹ء) مجموعہ مضامین

۲۹۔ اسلاف میر انیس (۱۹۷۰ء) میر انیس کے اجداد کے حالات اور کلام کا نوٹ۔ اس پر

اتر پردیش اردو اکاڈمی نے ۱۹۷۲ء میں دو ہزار روپے انعام دیا تھا۔

۳۰۔ شرح طباہانی اور تنقید کلام غالب

۳۱۔ مراثی رنجیت (مقدمہ) (۱۹۷۱ء)

۳۲۔ انیسیات (۱۹۷۶ء) یہ ان کی وفات کے بعد اتر پردیش اردو اکاڈمی کے زیر

انتہام شائع ہوئی۔ اس میں ان کے چھوٹے بچے ۱۰ مضامین شامل ہیں، جو اس

سے پہلے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے تھے۔

ان کے علاوہ یہ کتابیں ان کی زندگی میں طبع نہیں ہو سکی تھیں، اگرچہ ان کا مسودہ مکمل ہو گیا تھا۔

۲۔ وائی میں مرثیہ گوئی۔

۱۔ سلطان عالم و اجد علی شاہ

۳۔ ایران میں مرثیہ گوئی: ایک تاریخی جائزہ سیلطان عالم واجد علی شاہ کو ان کی وفات کے بعد ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی ساس سے معلوم ہو گا کہ اگرچہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ مرثیہ گوئی میں بھی بند نہیں تھے، لیکن ان کے خاص موضوع یہ ہیں:

- ۱۔ مرثیہ؛ ۲۔ انیس؛ ۳۔ اودھ کی شاہی زمانے کی تاریخ، بالخصوص غبار واجد علی شاہ۔ انھوں نے ان موضوعات پر گرانقدر اور زمیں پرانی کتابیں لکھی ہیں۔ لیا تھا، جس کا بیشتر حصہ انھوں نے آخری ایام میں لکھا، اس کا کچھ حصہ مختلف یونیورسٹیوں میں پھیل گیا ہے۔

لکھنے کے معاملے میں وہ سست رہتے تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ عید مختاط تھے، جب تک موضوع کے ایک ایک جز و تک کے بارے میں انھیں اطمینان نہ ہو جاتا، وہ نہ تو اپنے نتائج فکر کو آخری شکل دیتے، نہ اس کا کوئی حصہ شائع کرتے۔ یہی باعث ہے کہ ان کی مخطوطات کی تعداد زیادہ نہیں۔ کمال اور بے دوڑی کا معاملہ ہوتا، اور محض سستی شہرت حاصل کرنا ہی ان کا مصلح نظر ہوتا، تو یہ فہرست بہت طویل ہو سکتی تھی۔ لیکن بحالت موجودہ یہ اتنی مختصر بھی نہیں کہ کوئی سنجیدہ مورخ ادب اس سے صرف نظر کر سکے۔ اپنے تنوع اور معیار کے لحاظ سے یہ سچ قابل قدر اور مستند علیہ ذخیرہ ہے اور یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ مدتوں اس پر آسانی سے اضافہ نہیں ہو سکیگا۔

ان متعلق کتابوں کے علاوہ، ان کے مضامین اور شذرات کی بھی خاصی بڑی تعداد مختلف رسائل و جرائد میں منشر ہوئی ہے۔ اگر انھیں جمع کیا جائے، تو ان سے کئی مجلد تیار ہو سکتے ہیں۔

ان کی مسلسل علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف حکومت نے بھی کیا، اور اردو دان حلقے نے بھی؛ متعدد کتابوں پر انعام ملے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں صدر جمہوریہ سندھ نے انھیں فارسی کے فاضل کی حیثیت سے اپنا خاص اعزاز عطا کیا، جو ایک سند، شال اور چین حیات تین ہزار روپیہ سالانہ وظیفے پر مشتمل ہے۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں حکومت نے ”پدم شری“ کا خطاب بھی دیا۔ پھر ۱۹۷۲ء میں حکومت اتر پردیش نے ان کی تصنیفی

کاوشوں کے لیے انھیں پانچ ہزار کاغذات عام، ایک مہشت دیا اور ایک سند بھی عطا کی۔

۱۹۲۶ء میں ان کی شادی ٹیکاپور (کا پورہ) کے مشہور طبیب حکیم سید محمد اصغر جعفری نعمت اللہ عرف پیارے صاحب کی صاحبزادی حسن جہان بیگم سے ہوئی۔ سید محمد اصغر جعفری کا سلسلہ حضرت شاہ نعمت اللہ دہلوی کرمانی سے ملتا تھا، جن کا آئندہ کی پیشگوئیوں پر مثل قصیدہ شہرہ آفاق ہے؛ اسی لیے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ "نعمت الہی" کا اضافہ کر لیا تھا۔

بیگم مسعود مرحومہ کو علم سے شغف اپنے والد سے ملا تھا۔ وہ انگریزی بھی جانتی تھیں؛ اردو میں شعر بھی کہتی تھیں؛ حزیں تخلص تھا۔ انیس کی عاشق تھیں، بلکہ حافظ بھی۔ ان کا انیس کا مطالعہ کس درجے کا تھا، اس کا کچھ اندازہ اس سے لگائیے، کہ جب بھی مسعود صاحب کو انیس کے کسی بند کے بارے میں معلوم کرنا ہوتا کہ وہ کس مرتبے میں ہے، تو وہ ان سے دریافت کرتے۔ مرحومہ نہ صرف نشاندہی کرتیں، بلکہ متعلقہ جلد لاکر پیش کر دیتیں۔ موت سے کچھ پہلے وہ اردو ضرب الامثال جمع کر رہی تھیں، لیکن یہ کام نامکمل رہ گیا۔ ان کا ۲۳ اکتوبر ۱۱۱۱ بھارتی قریب انتقال ہوا۔

ان بیگم سے مسعود صاحب کی سات اولادیں ہوئیں: (۱) سب سے بڑی صاحبزادی ارجمندانو یہ ڈاکٹر مسیح الزماں (الہ آباد یونیورسٹی) (ف: فروری ۱۹۷۵ء) کے عقد نکاح میں آئیں۔ (۲) مسعود صاحب کے سب سے بڑے بیٹے ڈاکٹر سید اختر مسعود؛ پشاور یونیورسٹی (پاکستان) میں فادسی کے استاد ہیں۔ (۳) ان سے چھوٹی صاحبزادی برجیس بانو ایم اے (اردو) کراچی کے ایک تعلیمی ادارے سے وابستہ ہیں۔ (۴) تیسری بیٹی انیس بانو اپنے شوہر کے ساتھ امریکا کے شہر کیلی فورنیا (لاس انجلس) میں مقیم ہیں۔ (۵) ڈاکٹر نیر مسعود دوسرے بیٹے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فادسی میں تدریس ہیں (۶) ان سے چھوٹے بیٹے سید انور مسعود رضوی نیشنل میو پیو پیٹھک کالج، لکھنؤ میں پڑھاتے ہیں۔ (۷) سب سے چھوٹے صاحبزادہ اظہر مسعود رضوی، یو پی اردو اکادمی، لکھنؤ میں مہتمم نشر و اشاعت ہیں۔

ادیب مرحوم کے قائم کردہ اشاعتی ادارے "کتاب نگار" کی نگرانی بھی انھیں کے ذریعے ہے۔

کبرسنی کے ساتھ تندرستی جواب دینے لگی تھی۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں بگم کے انتقال کا انھیں قدر بہت صدمہ ہوا، اور اس کے بعد بہت افسردہ رہنے لگے تھے۔ حالانکہ بھی بہت کمزور ہو گیا تھا، بات جلدی بھول جاتے تھے۔ اس کے باوجود تقویراً بہت لکھنے کا شغل جاری رہا۔ لیکن جولائی ۱۹۷۵ء میں طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور بیشتر وقت خود رستگی سی طاری رہنے لگی تھی۔ ۲۹ جولائی کو خاموشی اور شدید افسردگی کا دورہ پڑا، اور کھانا پینا بالکل چھوٹ گیا۔ اس کے بعد دواؤں سے کچھ افادہ ضرور ہوا، لیکن بستر سے اٹھنے کی سکت سلب ہو گئی۔ پورے چار ماہ اسی حالت میں گزرے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۷۵ء (شب ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ) رات کے پونے نو بجے خالق حقیقی کے بلاؤں پر لبیک کہی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

خاذاہ اگلے دن (۳۰ نومبر) اٹھا۔ اہل سنت اور اہل تشیع نے الگ الگ نماز جنازہ پڑھی یعنی جماعت کی امامت شیدائے علماء مولانا سید علی نقی صاحب مجتہد (عرف نقی صاحب) نے اور اہل سنت کی مولانا محمد ہاشم انصاری فرنگی محلی (رن مولانا صبغتہ اللہ شہید انصاری) نے کی۔ بعض اصحاب نے دونوں نمازوں میں شرکت کی۔ انھیں کربلائے نشی فضل حسین میں اپنی مرحومہ بیگم کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ یرحمہما اللہ تعالیٰ
کئی اصحاب نے تاریخ وفات کہی۔ ڈاکٹر رفیق حسین رفیق لکھنوی کی عیسوی میں ہے، شیدائے انیس، افسوس اب ہم سے ہوا رخصت ہماں ہوئے جنت کے مسعود حسن رضوی بیاختہ نکلا ہے منہ سے یہ رفیق اپنے "آگاہ حقائق تھے مسعود حسن رضوی"

(۱۹۷۵ء)

ہجری: صریح حکیم عزیز قدوسی کا مٹھی کا ہے :

۵، صریح مسعود حسن رضوی (۱۳۹۵ھ)

پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم نے کسی زمانے میں شاعری بھی کی تھی، ادیب تخلص کیا بعد کو

جب شرنکاردی سے مزاحمت بڑھی، تو یہ شغس ترک ہو گیا۔ لیکن اس زمانے کا جو کلام تھا، اس کا ایک مختصر انتخاب انھوں نے "سہادی شاعری" کے دیباچے میں درج کر دیا تھا۔ میں نے جب ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا کہ کچھ اور کلام بھی عنایت فرمائیں، تو کہا کہ بس، اب آئی گا، کلام سمجھیے! لہذا میں وی اشعار یہاں درج کر رہا ہوں۔ کلام کے متور تباد ہیں کہ اگر وہ یہ شوق جاری رکھتے، تو آج ان کا ممتاز شعرا میں شمار ہوتا۔

جذب دہا بے نیاز ی سے اثر بڑھتا گیا میں ہٹا جس جس طرف، عالم ادھر بڑھتا گیا
کچھ عجب عالم ہے، راہ نزل مقصود کی جتنا جتنا میں بڑھتا، میرا سفر بڑھتا گیا
فرط غیبی سے دنیا بن گئی آئینہ دار ایک ہی صورت نظر آتی ہے ہر تصویر میں
کیا کہو، دیوانگی عشق کی رسوائیاں زلف کے پابند بھی باندھے گئے زنجیر میں
اک ناز و تمنا، اک بہارستان شوق کیا بتائیں، ہم نے کیا دیکھا، تری تصویر میں
ہے الکفشہ دل مجبور کی اٹھتی امنگوں کا لبِ ساحل جابوں کا ابھرنا اور مٹ جانا
درہل نہیں سنس کے کہنے دے زدا، اے شوق ضبط!

اک دلِ نا آشنا کا امتحاں لینا ہے آج
آج کی چشمِ کرم نازِ میسائی ہے ابھی کچھ مردہ تمناؤں میں جان آئی ہے
پاؤں میں ہوتی ہے بری کی گرائی محسوس دھیان جب یہ نہیں رہتا کہ اب آذا دہوں میں
بلا جن سے نشین، جب وہ شعلے دل سے اٹھتے ہیں

تو چادر آسنو بہا آتا ہوں میں خاکِ نشین پر
یہ سعیِ پردہ داری ہو، اور رالگاں ہو وہ حالِ دل جو پچھیں ہر موئے تن زبان ہو
سمجھے تھے طوفانِ ہستی میں جسے جانے پناہ ایک موجِ کوہِ پیکر، وہ بھی کفّی، ساحلِ شہقا
اب خبر دیکھیے، پیاد کی کیا آتی ہے ہر طرف سے مجھے رونے کی صدا آتی ہے
اس کی چشمِ مست ہستیادوں کے دکھلے دل کی دنیا کے بہتے باز اب ہم پر کھلے
ان دنوں کیوں جی نہیں لگتے گلشن میں کہیں برق کو شاید ہے پھر میرے نشین کی تلاش
خوفِ رسوائی نہیں، تو ضبطِ غم سے کام کیا پختہ کا دان جنوں کو ہوشِ ننگ نام کیا

خط سے کیا مطلب مجھے، قاصد سے مجھ کو کام کیا

دل میں جو رہتا ہے، اس کو نامہ و پیغام کیا
مجھے قاسمِ ازل سے کبھی کچھ گلا نہ ہوتا جو یہ تم ملے تھے مجھ کو، تو یہ دل ملا نہ ہوتا
وہ سیرِ دشتِ وحشت، اور وہ میرے دل کی دیرانی

اُدھر تھا میں بیا بیا میں، اُدھر مجھ میں بیا بیا تھا
گر یہ غم پہ بھی آگے جسے آتی تھی ہنسی وہی دلِ خندہ شادی سے بھی دیکر ہے اب
تھے ہم آزاد، جب آباد تھی دنیاے خیال حلقہٴ حدِ نظر، حلقہٴ ذخیرے اب
صفحہٴ دل کے سوا، جو کہیں دنیا میں تھی ذرے ذرے میں جہاں کے وہی تصویر اب
اب کہاں میں وہ کہ جس کے بس کا ہو اُغلاے

دل میں طاقت چاہیے، ضبط و نفاذ کے واسطے
بس اک یہی حسرت ہے اب، اے طولِ جدائی!

مجھ سے جو ملیں وہ، تو میں جی کھول کے ردول
ہم سخنِ لاکھوں ہیں، لیکن ہم زبان کوئی نہیں

مجھ کو دنیا کی بھری محفل بھی خلوت خانہ ہے
خوشی میں رنج! کہیں کیا مال کے غم کو خزاں کا خوف ہے جوشِ بہار میں ہم کو
اپنی تدبیروں پہ، اے غافل! نظر تو نے نہ کی

درد نہ پڑھ لینا خطِ تقدیر کچھ مشکل نہ تھا
غمِ شکستِ عہدِ ضبط و صبر کا سہنا پڑا اپنے مہرِ دردوں سے آخرِ دردِ دل ہنا پڑا
ہر تبسم میں وہاں پنہاں تھی برقِ عقل سوز میں سمجھتا تھا کہ اندازِ جفا کچھ اور ہے
ہم خاک کو سمجھا کیے اکیر ابھی تک تدبیر رہی تالیعِ تقدیر انھی تک
پھر ظلم پہ مائل ہیں تو اتنا بھی سمجھ لیں باقی ہے مری آہ میں تاثیر ابھی تک
شکوہ کیا، مجھ کو جو بزمِ ناز سے اٹھو اے ہے

حال کس بسمل کا اس نازک سے دیکھا جائے ہے!

دیکھیں نگاہِ شوق کی گستاخیاں ادیب! یتور بدل گئے مرے نازک مزاج کے
پیری آئینے سے خود ہیں کو یہ دیتی ہے صدا

اب میرا جانوں کہ ترے ناز اٹھائے کوئی
دنیا کو کیا خبر مرے حالِ ستاہ کی فرصت کہاں ہجومِ مصائب میں کی
دیکھے قسمت کی محرومی کہ مثلِ سنگ ہے آہ جس کے قدموں سے لگائیں اسے ٹھکرایا
طاقت پر داز بھی ہے، ہمت پر داز بھی، ش پر ہوتے، نکلتی حسرت پر داز بھی
دیا یہ شوق پر داز آں قفس کے رہنے والے کو
مجھے تجھ سے بس اتنا، میرے فطرت سا دکھنا ہے

تمکین سرمست، سید محمد قادر الدین خان

حیدر آباد کن کے ایک معزز اور صاحب علم گھرانے میں ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب سید مسیح الدین خان ریاست نظام کے منصبدار تھے۔ وہ عوام میں بڑے بخشنے کے عرف سے مشہور تھے۔ حیدر آباد کے محلہ مغلیہ پورہ میں مسیح الدین خان کی ڈیوڑھی اٹھیں سے منسوب ہے۔ نواب معین الدولہ ان کے حقیقی بھانجے تھے۔ جب معین الدولہ کی کم عمری میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو جاگیر کورٹ آن وارڈ کی تجویز میں چلی گئی۔ اور حضور نظام نے نواب مسیح الدین خان کو معین الدولہ کا ولی اور نگران مقرر کر دیا۔ نتیجہ الدین خان کا ۱۹۱۱ء میں انتقال ہوا۔ اس وقت ۵۵ سال کی عمر تھی۔

نواب مسیح الدین خان کے پانچ بیٹے ہوئے (۱) ہدایت محی الدین؛ (۲) عبدالقادر؛ (۳) دستگیر الدین خان؛ (۴) قادر الدین؛ (۵) سلطان محی الدین؛ اور تین بیٹیاں؛ لاڈلی بیگم، قادری بیگم اور جمیلانی بیگم۔

سید قادر الدین خان کو بچپن سے ادبی ماحول ملا۔ والد اگرچہ شعر نہیں کہتے تھے، لیکن ان کا ادبی ذوق بہت بلند تھا، جیسا اس عہد کے اکثر رؤسا کے یہاں ملتا ہے۔ قادر الدین کے تین بھائی شعر کہتے تھے۔ سید عبدالقادر کا تخلص ناصر تھا۔ ان سے چھوٹے سید دستگیر الدین کا تخلص کرتے تھے، ڈراما نویس سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کے بعض غیر مطبوعہ ڈرامے ان کے خاندان میں محفوظ ہیں۔ سید قادر الدین سے چھوٹے بھائی سلطان

حی الدین بھی شعر کہتے تھے اور قاسمی تخلص کرتے تھے۔
 سید قادر الدین کی پوری تعلیم گھر پر ہوئی؛ کسی مدرسے نہیں گئے۔ فارسی میں پوری دستگاہ
 تھی؛ انگریزی بھی بقدر ضرورت حاصل کر لی تھی۔ مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کے دل
 کا خاصا بڑا کتابخانہ تھا۔ انھوں نے اس سے پورا استفادہ کیا۔ خود بھی کتابوں کا ذخیرہ
 جمع کر لیا تھا۔ اپنے ماحول کے زیر اثر جلد ہی شعر کہنے لگے۔ تمکین تخلص تھا۔ "مرست"
 کا اضافہ اپنے کسی صوفی بزرگ کے نقب سے کر لیا تھا۔ آغاز شعر گوئی میں کچھ دن غلام
 محمد عرف ترک علی شاہ ترکی (ف: مارچ ۱۹۱۹ء) سے اصلاح لی۔ بعد کو مدنیوں نظم
 طباطبائی (ف: مئی ۱۹۳۳ء) سے مشورہ کرتے رہے۔ وہ نظم طباطبائی کی فنی اور علمی
 قابلیت اور مہارت کے بہت قائل اور متاثر خوان تھے؛ ادھر کہا کرتے تھے کہ مجھے ان سے
 بہت فیض حاصل ہوا۔

ان کا کلام اپنے عہد کے موقر جرائد میں شائع ہوتا رہا۔ لیکن داد مست مزاجی کا یہ عالم تھا
 کہ کبھی اسے مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لہذا آج تک ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں
 ہو سکا۔ اندیشہ ہے کہ اگر فوری توجہ نہ کی گئی، تو اس باکمال شاعر کی کوئی یادگار نہیں
 رہی۔ اگرچہ بنیادی طور پر نعل سے مرزا ولایت تھی، لیکن انھوں نے بعض معرکے کی
 قنایں بھی سہی ہیں۔

سادہ عمر کہیں جم کر کام نہیں کیا۔ بعض اعزہ و احباب نے سیل پیدا کی بھی، لیکن ان کے
 لا رہائی پن نے یہ حلق زیادہ دن تک قائم نہ رکھا۔ نواب معین الدولہ ان کے پھپھرے بھائی
 تھے۔ جب وہ دارالمہام مقرر ہوئے، تو انھوں نے بلدے میں ان کا بحیثیت مددگار
 پولیس تقرر کر دیا۔ لیکن یہ ٹریننگ کے دوران ہی میں مستعفی ہو کر گھر چلے آئے۔ اسی طرح
 تعلقہ دار درجہ اول نواب کا نظم جنگ نے (جو شعر کہتے اور کبھی کبھی ان سے مشورہ بھی کر لیتے
 تھے) ان کے لیے نوڈ آفیسر کے عہدے کا انتظام کر دیا۔ شاہرہ معقول تھا، اور اس پر کام
 اور ذمہ داری برائے نام۔ لیکن یہ شاید ایک سال سے زیادہ نباہ نہ کر سکے۔ غرض تھوڑا بہت
 جو کچھ اپنی خاندانی جاگیر اور منصب سے مل جاتا، ضرر سے اسی پر قانع رہے۔ لیکن پولیس کچن

اور اس کے بعد نضام ریاست پر یہ آمدنی بھی ختم ہو گئی۔ لطف یہ کہ اس پر بھی ان کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ وہی وضع داری اور آن بان اور ٹھاٹ، جو ساری عمر ان کا شعار رہا تھا، اس کے بعد بھی قائم رہا۔

آخری زمانے میں اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ غذا بالکل ترک ہو گئی تھی۔ بہت مجبور کرنے پر دو چادر لپیٹ کر کھالیتے یا دودھ پی لیتے۔ کمزوری ہونا ہی چاہیے تھی۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۷ء کو فجر کے وقت آنکھ کھلی، تو طبیعت کی خرابی کی شکایت کی۔ بیگم نے خیال کیا کہ کمزوری کے باعث یہ تکلیف ہے۔ وہ گیسٹ کے گرم دودھ لاکے انھیں پلائیں۔ واپس آئیں، تو روح نفیس عنصری سے پرہیز کر چکی تھی۔ اِنَّا لِلّٰہِ اِنَّا رَاجِعُونَ۔ اسی دن بعد نماز عصر تجہیز و تکفین عمل میں آئی، اور درگاہ شاہ خاموش کے احاطے میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کی شادی صدیق علی شاہ (سابق تحصیلدار سہارنپور) کی صاحبزادی بدر النساء بیگم سے ہوئی۔ وہ اردو فارسی بہت اچھی جانتی ہیں۔ شعری کہتی ہیں، بہت تخلص ہے۔ مرحوم سے دو بیٹے (سید یوسف شرف الدین (عرف یوسف سرمست) اور سید قیصر صلاح الدین (عرف قیصر سرمست) اور ایک بیٹی جمیلہ حامدۃ النساء بیگم یادگار ہیں۔ یوسف سرمست عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرار ہیں۔ ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ "بیسویں صدی میں اردو ناول" شائع ہو چکا ہے۔ چھوٹے بیٹے قیصر سرمست معروف آرٹسٹ ہیں، سرورق کا ڈیزائن بنانے میں ان کی خاصی شہرت ہے۔ تینوں شادی شدہ اور ماشاء اللہ صاحب اولاد ہیں۔

کلام بہت نچتہ اور جاندار ہے۔ افسوس کہ مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ ذیل میں غزلیات کے مختصر انتخاب اور ان کی ایک نظم بطور نمونہ دے رہا ہوں جو ان کی بیگم اور صاحبزادے قیصر سرمست کی مہربانی سے تمہیا ہوئی ہیں ان کے حالات بھی انھیں سے ملے ہیں:

ہم یاد کر رہے ہیں انھیں کس امید پر اب تو غم فراق کا بھی آسرا نہیں
حال آں کہ تم نے کب کا بھلا بھی دیا، مگر تم مجھ کو بھول جاؤ گے، دل ماننا نہیں
کہنے کو اب بھی زندہ ہوں، لیکن ترے بغیر کب زندگی پہ موت کا دھوکا ہوا نہیں

وصل و فراق کھیل ہیں نیرنگِ شوق کے دردِ جنونِ عشق کا کچھ مدعا نہیں
 تمکین! جفلے یا رکھو معلوم ہو تو ہو اپنی وفا کا مجھ پہ تو عقدہ کھلا نہیں
 اک لمحہ فریبِ اجل کے سوا مجھے کس دقت انتظار تھا راہِ نہیں
 دنیا و دین لٹا کے اسے دیکھ تو لیا یہ اور بات ہے کہ کہیں کا راہ نہیں
 مقامِ توش میں پوچھو کہ دیوانوں پہ کیا گزری
 جب آئی شمعِ محفل میں، تو پروانوں پہ کیا گزری
 خزاں میں جو گلستانوں پہ گزری سب پہ ظاہر ہے
 کسی کو کیا خبر لیکن، بیابانوں پہ کیا گزری
 ذرا جوشِ جنوں، دردِ محبت! اور بڑھنے دو
 یہ داماں خود بتا دینگے، گریبانوں پہ کیا گزری
 ہو کچھ بیتی، سو بیتی مجھ پہ، لیکن کیا کہوں تمکین!
 مرے ضبطِ مسلسل سے سترانوں پہ کیا گزری
 کہاں کی روشنی، ہم لطفِ تاریکی بھی کدو بیٹھے
 شبِ غم اپنی آنکھوں پر بھر دسا کر کے پھٹکے
 امیدوں کا طوفان ہے، نہ اب طغیانِ زمینی
 کچھ ایسا درد ہے دل میں کہ جس سے جی نہ گھرائے
 حقیقت میں وہی رُودادِ عس و عشق ہے، تمکین!
 کہ لب تک بھی نہ آنے پائے، اور دل میں تر جائے
 اسی کو یاد کہتے ہیں، یہی تو یاد آنا ہے وہ اپنے زعم میں جس کو کھلا دیتا سمجھتے ہیں
 اب اس میں کیا کسی کو، میں ہوں کس کا کون سا میرا بظاہر میں ہوں ان کا جو مجھے اپنا سمجھتے ہیں
 عجب چیتاں ہے یہ کیفیتِ دل نہ اونے میں داخل، نہ سننے میں داخل
 کئی کیا ہے منزل کی راہِ طلب میں کہ راہِ طلب میں نہیں کوئی منزل
 محبت میں مشکل سے مشکل بھی آساں محبت میں آساں سے آساں بھی مشکل

گو تم بھی پاس ہو، اور حاصل ہے ہر خوشی بھی

پھر بھی میں کچھ کمی سہی ہر شے میں پار ہوں
ہر ذرہ کائنات کا اک آفتاب تھا وہ بھی تھی، اور یہ بھی شبِ بابتاب ہے
جو تجھ کو چاہتے ہیں، تجھے چاہتے رہے یہ مان کر بھی اس کا نتیجہ خراب ہے

مت پوچھ، وہ تیری فرقت میں کس ل سے گزرا کرتے ہیں
جو تیری تمنائیں، تیری دودی بھی گوارا کرتے ہیں
ہے فتح و شکست اہل، فاد اہل جفا میں فرق یہی
یہ باد کے جتنا کرتے ہیں، وہ جیت کے بارا کرتے ہیں
دروٹوں کو سہانا تو سیکھو، تم دل کا لجاؤ تو سیکھو
لے دوست! ڈبو سکتے ہیں دی، جو پار اتارا کرتے ہیں
کیا بات ہے، کیوں ہر بھر کے ترا ہی نام زباں پر آتا ہے
ہم نے تو مٹا تھا، مشکل میں اپنوں کو پکارا کرتے ہیں
دوروں کے بھی اہل دانش سے دم بھر نہ گزرا دی جاگی
جو زندگی تیرے دیوانے منس نہیں کے گزرا کرتے ہیں

جان کس کو نہیں عز، مگر پھر بھی ترک وفا کریں کیونکہ
ہر قوت دل کو آزما کر دیکھا اک اک بت کو خدا بنا کر دیکھا
تسلیم! مگر بھولنے والا میرا بھولا نہ گیا، لاکھ بھلا کر دیکھا
بھولا مواراستہ دکھایا مجھ کو میرا اپنا پتا بتایا مجھ کو
دشمن کو میں کیوں دوت رکھوں تسلیم دشمن نے تو آدمی بنایا مجھ کو

ایس نہ ہو، دوری منزل پہ نہ رو
دہر کا کوئی غم نہ کر، ادساں نہ کھو
بھٹکے ہوؤں کا بھی اک وسیلہ ہے یہاں
خود راستہ مل رہیگا، گمراہ تو ہو

مفلس کی دنیا

کہ جس کی یاد میں مجروح اب تک ہے جگر میرا
 جہاں کے وادی دکھ سارا، افلاس تھی دستی
 جہاں ہر صورتِ امید، نو میدی کی نالی ہے
 جہاں کے طائروں کی بولیاں بس آہ و شیون ہے
 جہاں کا چپہ چپہ دوزخوں کا کام دیتا ہے
 جہاں کی شام بیکسر دشمن امید ہوتی ہے
 جہاں کی دھوپ سمیت سوزا درمسموم ہوتی ہے
 جہاں دن دوپہر ڈھل جاتا ہے سورج زندگانی
 جہاں اکٹھوں پہر آرام سے تقدیر سوتی ہے
 جہاں ہر ولولہ ہو جاتا ہے رہن تھی دستی
 جہاں حساس خود داری کی نبضیں چھوڑ جاتی ہیں
 جہاں صبر و رضا ہو جاتے ہیں مجبور و غداری
 جہاں آداب بھی قید کے سانچے میں ڈھلتی ہے
 جہاں پروان چڑھتے ہیں خیانت، جرم، مکاری
 جہاں کے خوف سے نبیوں کے دل بھی تھر تھرتھاتے
 جہاں ہر وقت دن کو بھی دکھائی دیتے ہیں تارے
 ذلیل، خوار اپنی ہستیوں سے آپ شرماے
 فلک کی آنکھ کے ناسورِ قلب ہر کے چھالے
 قنارے عزم و مرگ ارتقا کی زندہ تصویریں
 امیروں کے رگِ ایوان، مگر از قسم انسانی
 تمدن جن کو اک انسان نا حیوان سمجھتا ہے

قضا ر ایسی دنیا میں ہوا اک دن گزر میرا
 جہاں کی سرزمینِ ذلت، جہاں کا آسمان لستی
 جہاں چاروں طرف مایوسیوں کی حکمرانی ہے
 جہاں حدِ نظر تک، رخ و غم کے پرِ خطر بن ہیں
 جہاں کا دُردہ ذرہ دعوتِ آلام دیتا ہے
 جہاں کی صبحِ حزن و یاس کی تہید ہوتی ہے
 جہاں کی چاندنی تاریک اور مغموم ہوتی ہے
 جہاں ہے ایک ہی مفہوم مرگ، زندگانی کا
 جہاں دن رات سر پکڑے ہوئے تقدیر تھی ہے
 جہاں ہر شوق ہو جاتا ہے صرف فاقہِ بدستی
 جہاں جوشِ اولوالعزمی کی سانسیں ٹوٹ جاتی ہیں
 جہاں صدق و صدا کا خون فی لیتی ہے ناداری
 جہاں بے جرمیاں بھی جرم کا غالب بدستی ہیں
 جہاں نشوونما پاتے ہیں چوری، جھوٹ، غیاری
 جہاں ہر ہر قدم پر پائے ایمان دگر گاتے ہیں
 یہیں بستے ہیں ننگِ زندگی، دہ پیٹ کے مارے
 زلے بھر کے دھتکائے، خدائی بھر کے ٹھکرائے
 مجسم آہ، سر تا پا زبانِ حال کے نالے
 غلامی کی حیاتِ تیرہ کی تابندہ تصویریں
 قاتلِ جہل و پستی، کشتہ ادا مِ دنادانی
 تمول جن کو یکسر پیکرِ بیجاں سمجھتا ہے

نقطہ اک خشاکِ ردئی جن کے جسمِ جاں کی قیمت ہے
 مشیت کھیلتی ہے رات دن جذبات جن کے
 ہو کرتی ہیں سامانِ تفریحِ عصمتیں جن کی
 ارادوں پر بھی غالب جن کے غیروں کا ارادہ
 دبے ہیں جن کے جوہر اس قدر رنگِ نالت میں
 ہے بس لے دیکے جن کی کائناتِ زندگی ساری
 جنہیں انسان کہتے آدمیت پہنچاتی ہے
 فضاے بحر و بر، کون و مکان کو غار ہے جن سے
 فقط اک حکم جن کے مذہبِ ایمان کی قیمت ہے
 مستخر کرتی ہے تقدیر احاسات جن کے
 رہا کرتی ہیں برگشتہ ہمیشہ قیمتیں جن کی
 نہ جن کی اپنی مرضی ہے، نہ جن کا اپنا مشا
 کہ شک ہونے لگا ہے خود انھیں سنی شرافت میں
 علامی مفلسی، فائدہ معیبت، بھیٹ بھاری
 جنہیں زندہ سمجھتے، زندگی کو شرم آتی ہے
 اجل کو جن سے نفرت، زندگی بنیاد ہے جن

کوئی غمخوار ہے جن کا، نہ کوئی پوچھنے والا
 خداوند! الہا! داد! اے دادرس مولا!

محمود بیگ، میرزا

مغلوں کے ایک معزز اور پرانے خاندان کے نام لیا جاتے تھے۔ ان کے موروثی اعلیٰ داراب بیگ
عبدعالمگیری میں وسط ایشیا کے شہر فرغانہ (حال تاجکستان) سے ہندستان آئے اور دہلی
میں بس گئے۔ یہاں انھوں نے اور ان کی اولاد نے بسراوقات کے لیے مختلف پیشے اختیار کیے۔
پہلے کے حالات کچھ یقین سے نہیں کہے جاسکتے، لیکن جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا ہے، تو ان
کے دادا میرزا فضل بیگ کا شہر کے متمول لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ کئی دوسرے گھرانوں کی
طرح یہ لوگ بھی در کے مارے شہر سے نکل گئے۔ یہی خیال تھا کہ جب امن قائم ہو گیا، واپس
آجائیں گے۔ لیکن ستمبر ۱۸۵۷ء میں انگریز کا دہلی پر دوبارہ قبضہ ہو گیا، تو دار و گیر کا وہ بازار
گرم ہوا، اور سربراہ آدودہ مسلمانوں کی جاداد پر اس طرح مساب کی گئی یا نیلام ہو گئی، کہ
ان غریبوں کو بڑی مشکل سے محلہ در و گرداں (فراسخانہ) دہلی میں سرچھپانے کو جگہ ملی۔
اس کے بعد خاندان کی مالی حالت بھی بہت کمزور ہو گئی، اور مشکل سے گزر بسر ہونے
لگی۔

میرزا فضل بیگ کے پانچ بیٹے تھے: میرزا منور بیگ، میرزا امجد بیگ، میرزا اسحاق بیگ،
میرزا یعقوب بیگ، میرزا شہباز بیگ، تبدیل شدہ حالات کے باعث سب کی مناسب
تعلیم دترہ بہت کا انتظام بہت مشکل تھا۔ اس لیے والدین نے بڑے تینوں بیٹوں کو پیش
سلکھانے پر روزی کمانے کو چھوٹے موٹے کام پر لگا دیا، صرف چھوٹے دودر کے تعلیم

حاصل کر سکے۔ اس طرح میرزا یعقوب بیگ کسی نہ کسی طرح آٹھویں درجے تک پڑھے، اور اس کے بعد میڈیکل کمیٹی میں ملازم ہو گئے۔ سب سے پہلے میرزا شہباز بیگ سب سے زیادہ خوش قسمت رہے۔ نڈل تک وہ سرکاری والاں کے عریک اسکول میں پڑھے۔ یہاں انھوں نے مولانا حالی سے پڑھا تھا؛ اور اس کے بعد جون ۱۸۹۲ء میں دسویں درجے کی سند پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کا ۲ جنوری ۱۹۰۸ء (یوم عید الفطر) انتقال ہوا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

یہی میرزا شہباز بیگ سہارے میرزا محمود بیگ کے والد بزرگوار تھے۔

میرزا شہباز بیگ دسویں درجے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہی (۱۸۹۲ء میں) نہر جن (عربی) کے دفتر میں بطور کلرک بھرتی ہو گئے تھے۔ لیکن وہ نہ اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے، نہ مستقبل سے متعلق غافل رہے۔ ملازمت کے دوران میں بھی وہ مختلف امتحانوں میں بیٹھے اور کامیاب ہوتے رہے جس سے تدریج عہدے میں بھی ترقی ہوئی، اور تنخواہ میں بھی۔ ۱۹۳۲ء میں جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں، تو سنٹرل پی، ڈبلیو، ڈی کے دفتر میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ افسر تھے۔

پہلی بیوی کی وفات کے بعد ۱۹۰۰ء میں شہباز بیگ کی دوسری شادی میرزا محمود حسین بیگ دیکل ریاست جاوہر کی صاحبزادی نذیر بیگم سے ہوئی۔ میرزا محمود حسین بیگ بھی ان کے ایک جدی اور میرزا داراب بیگ ہی کی ایک دوسری شاخ کے چشم و چراغ تھے۔ اس بیگم سے میرزا شہباز بیگ کے ماشاء اللہ دس لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئیں۔ ان میں سے دو لڑکے صغیر سنی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چونکہ انھوں نے تعلیم کے فوائد کا اپنی زندگی میں تجربہ کیا تھا اور یہ انھوں نے خود اپنے زور بازو سے حاصل کی تھی، اس لیے میرزا شہباز بیگ نے اپنے سب بچوں کی تعلیم پر خاص توجہ کی۔ میرزا محمود بیگ بیٹوں میں تیسرے تھے، ان سے دو بڑے بھائی میرزا داؤد بیگ اور میرزا مسعود بیگ تھے۔ میرزا محمود بیگ ۲۰ اگست ۱۹۰۸ء کو دلی میں پیدا ہوئے چونکہ وہ اپنے والد کے ساتھ رہے، اس لیے ان کی تعلیم انھیں شہر دلی میں ہوئی،

جہاں وہ مختلف اوقات میں تعینات رہے۔ چنانچہ انھوں نے دسویں درجے کا امتحان ۱۹۲۳ء میں مزنگ ہائی اسکول، لاہور سے پاس کیا، جہاں اس زمانے میں ان کے والد کاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازم تھے۔ اس امتحان میں وہ پہلے درجے میں پاس ہوئے اور اپنے اسکول میں آئے۔ اس کے بعد اگرچہ انھوں نے لاہور کے فورین کرسچین کالج میں داخلہ لے لیا تھا، لیکن سال بھر بعد والد کا تبادلہ دہلی ہو گیا، لہذا یہاں اگر وہ انیکلو عربک کالج کے انٹر (سال دوم) میں داخل ہو گئے۔ لیکن اس ادلا دلی اور یہاں سائنس کے مضمون کی پڑھائی کا انتظام نہ ہونے کے باعث فیل ہو گئے۔ یہ ناکامی تازہ ثابت ہوئی، اس کے بعد انھوں نے خوب محنت کی اور ۱۹۲۷ء میں انٹر کا امتحان اس نتیجہ سے پاس کیا کہ پوری یونیورسٹی میں آئے۔ اب انھوں نے دہلی کے پرانے کالج سانٹیفیس میں داخلہ لے لیا اور یہاں سے ۱۹۲۹ء میں بی، اے اور ۱۹۳۱ء میں ایم اے (فلاسیفی) کی اسناد حاصل کیں، ان دونوں میں بھی پہلا درجہ حاصل کیا، اور یونیورسٹی بھری کامیاب طلبہ میں آئے۔

تعلیمی ریکارڈ اتنا اچھا رہنے کے بعد ملازمت ملنے میں کیا مشکل ہو سکتی تھی! کوئی سال سو سال حکومت سند کے محکمہ تعلیم میں ملازمت کرنے کے بعد اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جگہ نکلنے پر اپنے (انیکلو عربک) کالج ہی میں فلاسیفی کے مدرس مقرر ہو گئے اور پندرہ برس یعنی ستمبر ۱۹۴۷ء تک اس عہدے پر متمکن رہے۔

تقسیم ملک کے بعد کالج کا نام بدل کر "دہلی کالج" رکھ دیا گیا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں بیگ صاحب اس کے نئے پرنسپل مقرر ہوئے اور یوں سترہ برس، یعنی ستمبر ۱۹۶۴ء تک کالج کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں رہی۔

دہلی کالج کو ان کے زمانے میں بہت ترقی ہوئی، کیا بلحاظ نظم و نسق کے، اور کیا بلحاظ تعداد طلبہ اور نتائج کے، یہ دہلی یونیورسٹی کے ممتاز کالجوں میں شمار ہوتے رہا۔ اس کامیابی کا سہرا بجا طور پر بیگ صاحب کے سر تھا۔ وہ خود بھی اب ہر جگہ تعلیمی اہل میں معتبر اور موقر خیال کیے جانے لگے۔ چنانچہ مدتوں دہلی یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ

کے انتظامی اداروں کے رکن رہے۔ دلی کے باہر اجیر، بھوپال اور بھونیشور کے تعلیمی اداروں کی انتظامیہ کے بھی رکن تھے۔

اکتوبر ۱۹۶۲ء میں حکومت ہند نے ایک تعلیمی وفد مصر بھیجا تھا۔ میرزا محمود بیگ اس وفد کے سربراہ تھے۔ مصر کے بعد یہ وفد مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک، سوڈان، عربیہ السعودیہ، اردن، لبنان، شام، عراق، ایران بھی گیا تھا۔

۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۶ء تک وہ ریاست جموں و کشمیر کے تعلیمی مشیر رہے، اور پھر جموں و کشمیر یونیورسٹی کے بہرہ کشمیر کے پردوائس چانسلر کے عہدے پر بھی فائز رہے (۱۹۶۶-۱۹۶۸)۔ سب سے آخر میں وہ دلی یونیورسٹی کے مراسلاتی نصاب اسکول کے پرنسپل مقرر ہو گئے تھے۔

دلی کا پہلا دورہ ۱۹۷۲ء میں پڑا۔ بہت دن زیر علاج رہے اور بفضلہ سچ نکلے۔ اس کے بعد کچھ احتیاط تو کرتے رہے، لیکن ان کی زندگی کے معمولات میں بہت کم فرق آیا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۵ء کو عید الاضحیہ تھی۔ اس دن صبح سے شام تک عید ملنے والوں کا ہجوم رہا۔ حسب معمول دوستوں کی آؤ بھگت اور خاطر مدارات میں مشغول رہے۔ یوں تمام دن آرام کا ایک لمحہ نہ نصیب ہوا۔ رات گئے جب بستر پر لیٹے ہیں، تو تکان کے مارے بالکل نڈھال ہو چکے تھے۔ اگلے صبح ۱۵ دسمبر ۱۹۷۵ء ساڑھے سات بجے صبح کے قریب دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ روح سوتے میں قفسِ عمری سے پرواز کر گئی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ جاذہ اگلے دن ۱۶ دسمبر کو اٹھا اور انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر کے قبرستان میں اپنے والد کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ساری عمر شادی نہیں کی؛ ملاوٹ فوت ہوئے۔

ان کے دوست غلام احمد علمی نے قطعہ تاریخِ وفات کہا:-

بلبلِ دلی پرواز کر دانه چمن	ہیچو بے گل و یاسمین دمن
گشتِ بادِ اجل شمعِ علم و ادب	کر دے نور ہر محفل و انجمن
رفت یوسف ز کنعان بیابانِ ارا	گشت دلی بہرِ شش چو بیت الحزن

زلیست محمود، محمود رفت از جہاں برودانش بود رحمت ذواللہ
سال نوشت بگفت علمی نکتہ سخن
اہل پیش ، نیکو کار شیریں سخن

(۱۹۷۵ء)

شرذمہ دلی کی کوئٹہ تینمیں دھلی ہوئی زبان اور لب و لہجے پر جیسی قدرت نہیں حاصل تھی، اور یہ تکلف احباب کی مجلس میں جس طرح وہ چمکتے تھے، وہ بیان کرنے کی نہیں دیکھنے اور سننے کی چیز تھی۔ سچ مچ وہ کہیں اور سا کرے کوئی، کا سماں بند نہ جاتا تھا۔ انہوں نے تصنیف و تالیف کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ اور اس سے ادب اور تاریخ دونوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ دلی کی پرانی تہذیب، یہاں کے رسم و رواج، رہن سہن سمجھنا علم انہیں تھا، کاشکے وہ اسے محفوظ کر جاتے۔ وہ برسوں ان موضوعات پر آل انڈیا ریڈیو سے چھوٹی چھوٹی تقریریں نشر کرتے رہے۔ جن لوگوں نے یہ تقریریں سنی ہیں، وہی کچھ ان کا لطف جانتے ہیں۔ ان کی زبان کا لہجہ اور اُتار چڑھاؤ، ردِ مزہ کی چاشنی، گھریلو اندازِ بیان، لہجہ کا سحر و رنگ۔ بھولنے کی چیز نہیں۔ ان کی ۱۴ تقریروں کا ایک بہت ہی مختصر مجموعہ "بڑی حویلی" کے عنوان سے چھپا تھا (دلی ۱۹۶۹ء) جو صحیح معنوں میں بقامت، کثرت و بقیامت بہتر کا مصداق ہے۔ وفات کے بعد ۱۹۸۵ء کے سنگامے کے بارے میں ۱۳ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ دلی اٹھارہ سو ستاون کی "کے عنوان سے چھپا (دلی ۱۹۷۶ء)۔ یقیناً ابھی اور بہت سی تقریریں ہونگی۔

نجم آفندی، میرزا تاجمل حسین

مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ میرزا جعفر علی فصیح اپنے عہد کے چار نامی مرثیہ گو شعرا میں سے تھے۔ بقیہ تین تھے: خلیق اور ضمیر اور دلگیر۔

فصیح کے والد مرزا ممدی علی فیض آباد کے محلہ مغلیہ ورہ میں رہتے تھے فصیح کے علاوہ ان کے دو اور بیٹے تھے: بلیمخ اور حبیب فصیح۔ ۱۸۷۱ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے آخر عمر میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے، وہیں وفات پائی۔

انھیں فصیح کے برادرِ خرد میرزا تاجمل علی بلیمخ اور بلیمخ کے بیٹے میرزا بلیمخ بھی شاعر اور مرثیہ گو تھے۔ میرزا بلیمخ کے بڑے بیٹے میرزا عاشق حسین مرحوم بزم آفندی ہوئے جو اس سلسلہ الذہب کے لیے بھی باعثِ فخر تھے۔

بزم ۱۸۶۰ء میں کٹرہ حاجی حسن، آگرے میں پیدا ہوئے۔ شاعری گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی، بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ جب نیک و بد کی تمیز ہوئی، تو اپنے حقیقی ماموں سید اسماعیل حسین میز شکوہ آبادی (اٹ: اگست ۱۸۸۰ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ میرزا خود فنِ مرثیہ میں دبیر کے شاگرد تھے، اور غزل میں ناسخ کے۔

بزم نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کہا۔ لیکن افسوس کہ اس میں سے بہت کم شائع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ غزلیات کے سات دیوان تھے، لیکن ان میں سے صرف دو، چراغِ بزم اور آریاغِ بزم، منصفہ شہر دہلی آئے۔ سیکڑوں مرثیے کچھ تھے، سلامِ قصائد، رباعیات، ان کے

علاوہ، ربا عیات کا ایک مختصر انتخاب کسی زمانے میں دلی سے شائع ہوا تھا۔ بزم نے ایک "مولودِ معراج" خواجہ حسن نظامی (ف: جولائی ۱۹۵۵ء) کی فرمائش پر کہا اور ایک مختصر اجتماع میں درگاہِ حضرت نظام الدین اولیا میں سنایا۔ خواجہ صاحب مرحوم نے اسی مجلس میں بزم کو "معراجِ اشعرا" کا خطاب عطا کر دیا۔ بزم کا ۲۳ مارچ ۱۹۵۳ء کو ۹۳ برس کی عمر میں آگرے میں انتقال ہوا۔

میرزا تاج محل حسین نجم آفندی بھیس بزم آفندی کے بیٹے تھے۔ رمضان ۱۳۱۰ھ (مارچ/اپریل ۱۸۹۳ء) میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی، عربی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اور ان زبانوں میں اچھی استعداد پیدا کر لی۔ چندے مفید عام اسکول، آگرہ میں حاضری دی، اور یہاں سے ٹیڈل (اٹھویں) کی سند لی، جس سے انگریزی میں بھی کچھ شہد بد ہو گئی تھی۔

جس ماحول میں ان کی پرورش اور نشوونما ہوئی، اس میں شعر گوئی لایمکن تھی۔ چنانچہ دس بارہ برس کے سن میں شعر کہنے لگے۔ مشورہ اپنے والد بزم آفندی سے رہا، اور ان کے سوا کسی سے اصلاح نہیں لی۔ روزگار کا مسئلہ پیش آیا، تو ریلوے کے محکمے میں ملازمت لگئی، اور ۱۹۱۲ء میں دلی میں تعینات ہو گئے۔ یہاں سائل اور بنیود اور امر ناتھ صاحب کی صحبت میں آئی۔ تینوں اہل زبان اور صاحبِ علم و فن بزرگ تھے؛ نجم نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور خود استاد کا درجہ حاصل کر لیا۔ دلی کے چند سالہ قیام کے بعد ان کا تبادلہ غازی پور ہو گیا۔ یہاں نجم نے ایک مجلس "انجمنِ شبابِ سخن" کے نام سے قائم کی۔ اس انجمن نے ان اطراف میں اردو کی اچھی خدمت سرانجام دی، اس کے زیرِ اہتمام برس ہر مہینے مشاعرہ ہوتا رہا۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس ان دنوں عروج پر تھی۔ ہر سال اس کے سالانہ اجلاس بڑے بڑے شہروں میں ہوتے اور صنفی لکھنؤی مرحوم (ف: جون ۱۹۵۰ء) ان میں اپنی تاریخی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ کانفرنس کا ۱۹۱۵ء کا اجلاس (۱۵-۱۷ اکتوبر) الہ آباد میں ہوا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت انریبل سید ابوجعفر (راجا جانیڈ راول) نے کی تھی۔ اس جلسے میں

نجم آفندی نے اپنی نظم "دریتیم" پڑھی۔ نظم بہت کامیاب رہی اور اس کے ایک ایک مصرع کو بار بار پڑھوایا گیا۔ نظم ختم ہونے پر کئی حضرات نے انھیں گود میں اٹھالیا۔ حضرت عزیز لکھنوی اور محشر لکھنوی نے جو جلسے میں موجود تھے، انھیں ایک ایک طلائی تمغہ دینے کا اعلان کیا؛ ایک طالب علم سید صاحب حسین نے اپنی طرف سے نجم آفندی کو ایک گھڑی پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ غرض بہت جوش و خروش تھا۔ فیصلہ ہوا کہ نظم نیلام کی جائے۔ مختلف اجابے بولی دی اور آخری بولی (۱۸۰۰ روپے) صاحب صدر راجا سید ابو جعفر پر ختم ہوئی۔ بعد کو چونکہ یہ روپیہ داخل یتیم خانہ کرنے کی رائے ہوئی لہذا حسب تجویز جناب صدر قرار پایا کہ ہر شخص جو بولی بولا ہے، وہ اپنا روپیہ ضرور داخل کرے۔ اس طرح سے اس نظم کی قیمت (۵۶۵۰ روپیہ وصول ہوئی)، جو یتیم خانہ (قائم شدہ ۱۹۱۲ء) کو دے دی گئی۔ (یہ نظم نجم آفندی کے پہلے مجموعہ کلام کچھو لوں کا ہار میں شامل ہے)

یہ ملک میں سیاسی تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ انگریزوں سے ترک موالات کا غلغلہ بلند ہوا۔ نجم آفندی شروع سے انگریز دشمن اور وطن دوست رہے تھے۔ دفتر میں ان کا امنز ایک انگریزینو من تھا۔ ایک دن وہ ان کی کھدر پوشی پر معترض ہوا۔ نجم نے دو بد جواب دیا، تو بطور سزا ان کا تبادلہ آفسول کر دیا گیا۔ اسی زمانے کی ایک غزل کا مقطع ہے :

جینا ہے حصارِ بحر و شام میں اے نجم!

بنگالے میں گھر ہو کہ دوا بے میں بسر ہو

بعد کو جب سرکاری ملازمتوں کے ترک کرنے کا سوال اٹھا، تو انھوں نے بھی ریلوے کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور ردولی چلے گئے۔ یہاں ان کا تین سال قیام رہا۔ رشیچ جعفر تھری رزم ردولی، مشہور شاعر اور مرثیہ گو، اسی زمانے میں ان کے شاگرد ہوئے تھے (ردولی سے وہ آگے آگے؛ یہاں وقت بہت پریشانی میں گزر رہا۔ کسب معاش کیلئے انھوں نے ہر طرح کے پاڑ پیلے۔ ایک ماینامہ "مشورہ جاری کیا، تجارت کی"

زراعت بھی کی۔ لیکن ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر تنگ آ کر انھوں نے دکن کی راہ لی، اور حیدر آباد میں سخت سفر کھول دیا۔ بارے، نصیبیا اور تھا۔ نظام سابع میر عثمان علی خان مرحوم کے چھوٹے بیٹے شاہزادہ معظم جاہ شجاع کے دربار سے وابستہ ہو گئے، اور منجملہ اور اصحاب کے وہاں سے بھی مشورہ کرنے لگے۔ اس کے بعد ہرزہ گردی ختم ہو گئی۔ حیدر آباد میں ۳ برس قیام رہا۔ ۱۹۷۱ء میں اپنے چھوٹے بھائی سلیمان میرزا کو کب آفندی سے ملنے کراچی چلے گئے۔ جب واپسی کا عزم کیا تو عزیز واقارب اور عقیدتمند احباب نے اصرار کیا کہ اب یہیں قیام کیجیے، حیدر آباد جا کے کیا کیجیے گا۔ دراصل وہاں کی مٹی نصیب میں لکھی تھی۔ وہیں ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء (۱۵ ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ) بوقت ساڑھے نو بجے صبح انتقال ہوا۔ اسی دن قبرستان سخی حسن دربار (نار تھ ناظم آباد) میں دفن ہوئے۔

نجم آفندی نے بہت بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے؛ ۲۵-۲۶ مطبوعہ کتابیں موجود ہیں، اور جو غیر مطبوعہ رہ گیا، وہ بھی کچھ کم نہیں ہوگا، انھیں میں غزلیات کا دیوان بھی ہے۔ ان کے دو مرثیے "معراج فکر" اور "فتح ممیض" بڑے معرکے کے ہیں؛ ان میں انھوں نے بلکہ پہلو سے زیادہ فلسفہ و شہادت اور حضرت امام حسین اور ان کے وفکار عالم مقام کے کردار کی عظمت اور ان کے پیغام پر زور دیا ہے۔ ان کے سلام بھی بہت بلند پایہ ہیں۔ یہی حال رباعیات (تہذیبِ بوکت) کا ہے، جن میں ان کے حکیمانہ اور منظرانہ اور فلسفیانہ انداز کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ ذیل میں چند شعرا کی غزلوں کے ملاحظہ ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نجم کا اصلی میدان مرثیہ، رباعی اور سلام ہے۔ انھوں نے ہندی میں بھی کہا ہے۔ غزل میں شاید انھیں بورخ ادب کوئی مقام نہ دے سکے۔

ہر اک زبان پہ چرچا ہے سرفروشوں کا	اجل کے سایے میں کیا زندگی نکھر آئی
غدا بھونگی راہِ ثواب، ارے توبہ!	ہزار بار طبیعت گناہ پر آئی
کسے اب اعتبار گردشِ آیام آتا ہے	نہاں ہے بعد دیکھیں کس کے بت تک جام آتا ہے
گزدنی ہے حیات، اک جادہ مرگِ مسلسل سے	بڑی مشکل سے اربابِ دُعا میں نام آتا ہے

بدلتی ہے دنیا، مختلف مفہوم معنی میں
 جب آتا ہے ادھر سے، ایک ہی پیغام آتا ہے
 یہ موت ہوگئی، اے دوست! زندگی نہ رہی
 جو دل میں کوئی تمنا بری بھلی نہ رہی
 حقیقتوں کی کسی وقت بھی کمی نہ رہی
 تصویر فکر و نظر ہے، جو تشنگی نہ رہی
 پڑا رہا ہے عداوت پہ عمر سب پرودہ

مگر نگاہ محبت کبھی چھپی نہ رہی
 دو گھڑی، عیشِ مصلا چھوڑ دے
 تاکجا محراب و منبر کی پناہ
 یوں نہ جی، اُدنا شناسِ زندگی!
 موت برحق ہے، تو بن جا حق پرست
 موت سے پہلے ہی کیوں جی چھوڑ دے
 بنم! کچھ لفظی تکلف چاہیے
 بات وہ کیا، جو کلیجا توڑ دے

بھری بہار تھی، پھولوں میں اشیانا تھا
 میں سوچتا ہوں، حقیقت تھی یا فسانا تھا
 ملاں کس کو ہے، دشمن نہیں، وہ دوست ہی
 مجھے کسی نہ کسی سے فریب کھانا تھا
 ساری دنیا اک فریبِ جلوہ جانا ہے
 یہ حرم ہے دور سے، نزدیک سے تنہا نہ ہے
 وقت کا میری طرح، ان کو بھی شکوہ ہے، مگر
 میرے شکوہ کا زرا اندازِ بیباکانہ ہے
 پرستش احوال پر ججزِ شکر کچھ کہتے نہیں
 بوردیے پر بھی مزاجِ اہلِ دل شاہانہ ہے

کہونگا کچھ نہ قلب دوستاں کی یہ منزل ہے حباب دوستاں کی
 چین کی آبر و محفوظ رہتی لٹا دیتے جو دولت آسماں کی
 میکرے میں مرے ساتھی تھے، ہمدرد بھی تھے
 جب مسجد میں ٹھکانا ہے، اکیلا ہوں میں

ہر جا رہ و منزل میں ہے سجدے کی ادا اور
 معبد کی فضا اور ہے، مقتل کی فضا اور
 اللہ گلا کر کے میں پھٹتا یا ہوں کیا کیا
 جب ختم ہوئی بات کہیں، اس نے کہا: "اور"

طالب رزاقی، محمد قطب الدین حسن قادری

ان کا خاندان یوپی کے مردم خیز مقام دریا بادی (ضلع بارہ بنکی) کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے والد جناب الحاج محمد یوسف قادری ہجرت کر کے حیدر آباد (دکن) چلے گئے تھے۔ محمد یوسف قادری مرحوم مولانا عبدالماجد دریا بادی (ف: جنوری ۱۹۰۷ء) کی سگی بھوپتی (محبوبین) کے بیٹے تھے، ان کے والد کا نام فضل رب تھا۔ اس طرح گویا رشتے میں طالب رزاقی مرحوم مولانا عبدالماجد دریا بادی کے بھتیجے تھے۔

الحاج محمد یوسف قادری صدیقی منش بزرگ تھے۔ اردو، فارسی کا اچھا ذوق تھا۔ حیدر آباد میں انھوں نے اولاً حکومت وقت کے محکمہ مالی میں ملازمت اختیار کی۔ بعد کو راجہ شیو راج بہادر کی جاگیر کے انتظامیہ میں اچھے خاصے ذمہ دار عہدے پر تقرر ہو گیا۔ ان کا اس صدی کے پانچویں دہے میں انتقال ہوا ہے۔ درگاہ حضرت شاہ خاموش (حیدر آباد) کے ملحقہ قبرستان میں مدفون ہیں، خود بھی کچھ پیری مریدی کا سلسلہ قائم کر لیا تھا۔

طالب رزاقی یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو حیدر آباد ہی میں پیدا ہوئے۔ انیسویں کہ تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے، بسو ذرائع اسکول کے درجوں میں تھے کہ خدا معلوم کیوں وہاں سے بھاگ نکلے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی حاصل کیا، اپنے نجی مطالعے سے، اوریوں خاصی استعداد پیدا کر لی تھی۔

شاعری کا شوق اسکول کے زمانے ہی میں پیدا ہوا۔ ان کے بزرگوں میں حضرت شاہ عبدالرزاق ہوئے ہیں، جن کا مزار بالنسہ تشریف (ضلع بادہ بنکی) میں موجود ہے اسی سے اپنے نام کے ساتھ "ذاتی" لاحقہ کا اضافہ کیا۔ ابتدا میں فانی بدایونی (ف: اگست ۱۹۴۱ء) کی شاگردی اختیار کی۔ ان کے انتقال کے بعد پانچ برس تک حضرت حیرت بدایونی (ف: فروری ۱۹۷۵ء) سے کلام پر اصلاح لیتے رہے آخر میں استاد نے فارغ التحصیل قرار دے دیا، اس کے بعد خود ان کے تلامذہ کا طبقہ خاص وسیع ہو گیا تھا۔ اسوس، کہ ان کا مجموعہ، کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔

طالب کی پوری زندگی پریشان حالی میں گزری۔ حیدر آبادی میں مختلف جگہ ملازمت کا ڈول بنا، لیکن کبھی منتقل انتظام نہ ہو سکا۔ چندے عثمانیہ یونیورسٹی کے کتابخانے میں بھی ملازم رہے۔ طبیعت کے بہت حساس تھے اور حالات سے سمجھوتا کرنا گویا جانتے ہی نہیں تھے۔ ذمہ داریاں بھی بہت تھیں۔ ان کی شادی حیدر آباد کے ایک خاندان مشائخ میں جناب سید مومن علی کی صاحبزادی (افضل بیگم) سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے ماشاء اللہ سات بچے ہوئے، چار لڑکے اور تین لڑکیاں، انھیں پریشانیوں کے باعث کسی جگہ جم کر کام نہ کر سکے۔ تجارت تک کا تجربہ کیا، لیکن اس میں بھی ناکام رہے۔ ان کے کلام میں طنز اور سوز کا سرچشمہ بھی ان کی مادی بے اطمینان صورت حال میں دیکھا جاسکتا ہے۔

موت: ذی رض کینسر سے ہوئی۔ اس کی تشخیص اس وقت ہوئی، جب معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ مقامی کینسر اسپتال میں زیر علاج رہے، لیکن بیسود۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۵ء کو دوپہر کے وقت اپنے مکان (دبیر پورہ) میں داعی اجل کو لبیک کہی۔ تدفین اگلے دن (یکم جنوری ۱۹۷۶ء) عمل میں آئی اور انھیں بعد نماز عصر یا قوت بخش فیض کی کمان میتعہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

کئی اصحاب نے تاریخ وفات کہی۔ خود شیر جنیدی کا قطع ہے :
 ہے، کیا لٹ گئی بہارِ غزل سب کی آنکھیں ہیں سو گوارِ غزل
 لوگ منہ دیکھتے رہے، خود شیر! "چل بسا شاعر نگارِ غزل"
 (۶۱۹۷۵)

ایک قطعے میں عیسوی اور ہجری تاریخ جناب قادری الملتانی نے کہی۔ ہر ایک
 مصرعے سے تاریخ برآمد ہوتی ہے :
 اٹھ گئے دنیا سے طالب فکرِ دل شدہ کام

(۱۹۷۵) ہے فانی ہو چکا، کیفیت حیرت کا جام
 پاک عالم قطب رزاقی کی ہے تاریخ وصل (۱۳۹۵)
 (۱۹۷۵) جنت الفردوس رحاں اب ہے طالبِ کارِ مقام

۱۳۹۵

ذیل میں کلام کا مختصر انتخاب بطور نمونہ دے رہا ہوں، جو ان کی بیگم کی مرسلہ غزلوں
 سے کیا گیا ہے :

عاشقی ہے منزلِ شکر و شکایتِ بلند	دوست کام آیا تو کیا؛ دشمن کام آیا تو کیا
ٹھہرا رہا، تو فکرِ رہِ پیچ و خم رہی	جب چل پڑا، تو راستہ مشکل نہیں
یہ صبحِ وصل، یتیمِ بنیقاب و دلف بدوش	کبھی تھیں، کبھی حسنِ سحر کو دیکھتے ہیں
بہارِ آئی ہے گلشن میں جب اے طالب!	کبھی قفس کو، کبھی بالِ و پر کو دیکھتے ہیں
نشاطِ گل نہ سہی، خارِ عم اثر ہی سہی	چمن میں کوئی تو اپنا مزا جاں ہوتا
مالِ گل تر سے واقف اگر ہو	کلی سے تبسم کیا جائے نا
نہیں عشقِ معصوم، ہر اک کے بس کا	پہر آدمی سے کیا جائے نا
یہ دل ہے، ہر اک کو دیا جائے نا	جسے دے دیا، پھر یا جائے نا
بغیر اذنِ ساقی، پیا جائے نا	گنہِ بیشکلف کیا جائے نا
وہ میکش ہوں، نیتِ بسودر بسودے	پیالا پیالا پیا جائے نا

محبت میں ہے فرض، مرم کے جینا وہ مر جائے، جس سے جیا جائے نا
 جو ہونا ہے، وہ خود بخود ہو رہا ہے جیسے جا رہے ہیں، جیا جائے نا
 وہ دل اک نظر کے عوض دے دیا ہے جو دو جگ کے بدلے دیا جائے نا
 یہ کہتی ہے، طالب! مرے دل کی دھڑکن
 ترانام مجھ سے لیا جائے نا

دل طالبِ غم ہو کہ نظر طالبِ جلوہ مفہوم طلب، عشق میں درلودہ گری ہے
 ناراض جہاں، بخت خفا، آپ بھی ناخوش سانسوں کا تسلسل، کوئی جینا تو نہیں ہے
 ترا غم جان کے، ہر غم کو دیا دل کا ابو میں محبت ہوں، مجھے دادِ وفا دی جا
 پوچھو جلوہ باطل میں ہے کتنی کشش، طالب! حقیقت اتنی مبہم ہے کہ پہچانی نہیں جاتی
 وہ ایک یاس کہ جس سے ڈرا ہے ہو مجھے وہ ایک یاس بھی راس آگئی، تو کیا ہوگا!
 زہر درد و غم سے ہم کب کے مر گئے ہوتے وہ تو آبر و رکھ ل اعتبارِ فردانے
 میکدہ ہے یہ، طالب! کھل کے گفتگو کیجیے اجنبی نہیں کوئی، سب ہیں جانے پہچانے
 کیسی بہار، کیسی خزاں، کیا غم و نشاط ان رے فریب، زندگی متعادل کا
 میں اختیار پاک بھی، بے اختیار ہوں کتنا حین جبر ہے پروردگار کا
 تم بے نیازِ درد ہو، دل آشنائے درد تم اختیار کے ہو، نہ دل اختیار کا
 جذبہ چادہ گری ہے، نہ مروت نہ خلوص پریش حالِ دلِ زار سے ہوتا کیا ہے!

جو درد و فاسے عادی ہو، احساس کی دولت جس میں ہو
 اس دل کو کسے کیا دل کوئی، وہ آدمی انساں کیا ہوگا!
 دل میں تپش، جگر میں خلش، آنکھ میں سرشک یہ نعمتیں ملی ہیں مجھے، زندگی کے ساتھ
 جب اس جہاں میں بخ و خوشی کو نہیں قیام یہ زندگی گزاردے، زندہ دلی کے ساتھ

اشاریہ

۱۔ اشخاص

رکس ہند سے کے نیچے خطایہ ظاہر کرتا ہے کہ اس صفحے پر وہ نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے

۱۲۹	: احمد شجاع (حکیم)	۲۰۹	: ابرہہ سلطان حسن
۷۴	: احمد عباس، خواجہ	۶۹	: ابراہیم علی صدیقی
۲۲۰	: احمد علی (پروفیسر)		: ابو جعفر، شید (راجا پنڈرا دل ۳۵۰)
۶۵، ۶۴	: احمد علی شاہ عباسی	۳۵۱	
۲۷۰، ۲۶۹	: اختر حسین (حکیم)		: ابوالکلام آزاد، دیکھے آزاد، مولانا
۲۷۷، ۹۹	: اختر شیرانی	۹۵، ۹۴	: اثر، صدیق احمد
۳۳۲	: اختر مسعود (ڈاکٹر)	۲۹۲	: اثر لکھنوی، جعفر علی خان
۳۳۲	: احمد بانو	۲۶۶	: اثر رامپوری جعفر علی خان (پرس)
۳۴۴	: اسحاق بیگ، میرزا	۲۰۹، ۲۰۷	: اثر، محمد حسن (قاضی)
۱۹۲	: اسرار البصری	۲۲۶، ۲۲۵	: احتشام حسین (پروفیسر)
۲۷۱	: اسلم (پیر حامد)	۲۹۲	: احسان دانش
۵۳، ۵۲	: اظہر، احمد الدین (اے، ڈی)	۱۷۶	: احمد (اتا)
۵۵، ۵۴		۷۴، ۷۳	: احمد (ڈبلیو ڈی)
۱۴۹	: اظہر علی	۲۳۶	: احمد، احمد علی
۳۳۲	: اظہر مسعود	۲۱۰	: احمد جلیس
۲۱۹، ۲۱۸	: اعجاز حسین، شید		: احمد شاہ بخاری: دیکھے پطرس، احمد شاہ

- ایش چنار : ۲۹۸
 آتش لکھنوی : ۲۱۸
 آدہری ، پردیس : ۷۹
 آرد لکھنوی ، انور حسین : ۲۲، ۲۴
 ۳۲۷ ، ۳۲۷
 آذاد ، ابوالکلام ، مولانا : ۲۰، ۱۹۸
 ۲۹۰ ، ۲۹۱ ، ۳۱۶
 آذاد ، چراغ علی شاہ : ۲۲۸
 آذاد سحانی : ۳۰۴
 آذاد ، محمد حسین : ۳۲۷ ، ۳۲۹ ، ۳۷۹
 آذرہ ، محمد صدر الدین : ۸۷
 آغا جون : ۲۶۵
 آغا حشر کاشمیری : ۳۱
 آغا شاعر قرظ لباش : ۲۹۸
 آفتاب احمد خان (صاحبزادہ) : ۶۷
 آفتاب ، منے آغا لکھنوی : ۲۹۴
 آنند بہاری لال گپتا : ۲۵
 آنند نرائن ملا ، دیکھیے ملا آنند نرائن
 آریزے ، لورین : ۲۸۲
ب
 باقر عظیم آبادی : ۱۶ ، ۱۷
 باقر اختر (سلمان) : ۲۳۶
 بخشش علی : ۱۵۸
 بدر الدین : ۲۶۱
 بدر النساء بیگم : ۳۳۹
 بدری پرشاد سھوٹے : ۴۸
 برج رانی : ۲۵
 برج موہن لال : ۵۰
 برجیس بانو : ۳۳۲
 برجیس فاطمہ : ۶۶
 برق دہلوی ، ہاراج بہادر : ۲۹۸
 ۲۹۹
 برکت علی خان (کریم جاہ) : ۹۵
 برندارانی : ۴۸
 برین ، مسٹر : ۲۷۸
 بزم آفندی ، عاشق حسین : ۳۲۹
 ۳۵۰ ، ۳۵۱
 بسل الہ آبادی ، سکھ دیو پرشاد سنہا :
 ۳۰۹
 بشارت علی جانب دہلوی : دیکھیے جانب
 دہلوی
 بشن مرادی لال : ۲۹۹
 بشیر احمد ، میان : ۲۲۷
 بشیر پرشاد سنہا : ۳۰۹ ، ۳۱۰
 بلقیس : ۸۴

- بلخ لکھنوی، بخت علی : ۳۴۹
 بہار، شید جعفر حسین : ۲۹۵، ۲۹۴
 بہراد لکھنوی، سردار احمد خان : ۱۲۴
 بخود دیوانی، محمد احمد : ۳۳۰
 بخود دیوانی، وحید الدین : ۳۵۰
 بیدم شاہ دارثی : ۱۰۵
 بلی، ٹامس گرام : ۷۸، ۷۷، ۷۶
 بھگت رام، پنڈت : ۲۰
 بھگوان سردپ : ۴۷
 بھوانی سنگھ (ہارا نا) : ۳۷، ۳۸
 بھیم سین : ۱۴۱

پ

- پال زلر : ۷۴
 پراگ داس : ۴۵
 پر بودہ چندر : ۲۹۰
 پریشان، عبد الحمید : ۱۵۰
 پطرس بخاری، احمد شاہ : ۱۸۴، ۷۷، ۷۸

۲۸۱، ۲۷۹

پھراج (عرف لکھو) : ۱۰۴

پنڈی داس : ۲۹۰

ت

تایٹر، محمد دین (ڈاکٹر) : ۱۷۸، ۱۷۹

۲۷۷، ۲۱۸۴

تاج انبیاز علی : ۱۷۵، ۷۸
 تاجور نجیب آبادی، احسن اللہ خان :

۲۷۸، ۱۷۳

تاجل جلاپوری، تاجل حسین : ۱۷۳

ترکی، غلام محمد : ۳۳۸

تسکین : ۲۹۶

تسینم، محمد حبیب اللہ : ۳۱

تمیزین : ۲۸۰

تسکین : ۲۷۱

تسکین سرمست، محمد قادر الدین : ۲۳۷

تنہا عادی : ۱۶، ۱۵

تیجا سنگھ : ۱۹۳

تیمور، امیر : ۶۴

ط

ٹامس گرام بلی، دیکھی بلی، ٹامس گرام

ٹیکور، رابندر ناتھ : ۱۸۰، ۹۰

ٹینی سن : ۳۲۷

ٹھاکر پونجھی، جگن ناتھ : ۱۲۲، ۱۲۱

ث

ثابت لکھنوی، افضل حسین : ۲۸۱، ۲۷۷

ثاقب، احسن اللہ خان : ۲۱۴، ۲۱۶

۲۱۵

ثاقب، شید حسن رضا : ۱۵

ج

چاند رانی : ۵۰
چغتائی، عبدالرحمن : دیکھیے عبدالرحمن
چغتائی

چکبست : ۳۰۴

چھب لال : ۲۵

ح

حالی : (۵، ۶۵، ۶۷، ۸۲)

حامد (استاد) : ۱۷۶

حامد الہ آبادی، حامد حسین : ۲۶۹

حامد، حامد علی : ۱۴۹

حامد حسین : ۳۰۶

حامد علی خان : ۱۲۴

حبیب (پیر حسّان) : ۱۲۷

حبیب حسن : ۱۲۸

حبیب الرحمان خان شردانی : ۶۷

حام الدین : ۳۱۳

حام الدین قاضی : ۱۱۸، ۱۱۷

حام الدین حیدر : ۲۳۳

حسرت، چراغ حسن حیدر : ۱۰۰، ۱۳۶

حسن جہان بیگم : ۳۳۲

حسن نظامی (خواجہ) : ۱۹۵، ۲۰۷

۳۵۰

نثر چھروی، عبدالحفیظ صدیقی : ۱۵۸

نثر فاطمہ (غوثیہ) : ۱۷۰

ج

جالب دہلوی، بشارت علی : ۱۹۱، ۱۹۲

۳۰۴

جادید اقبال : ۱۶۰

جعفر حسن بہار : دیکھیے بہار، جعفر حسن

حاکم مراد آبادی : ۸۸

حکنا تھ پرشاد سٹھوے : ۲۸

خلیل مانچوری : ۹۲، ۹۵

خلیل، علی احمد : ۹۶

جالی، طفیل احمد : ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۳۷

جمعیت رائے : ۲۶۱

جیل میاں (پیر حمید احمد خان) : ۸۲

جیل منظری : ۳۳

جیل حسین : ۳۰۶

جمیلہ حامدۃ النساء بیگم : ۳۳۹

جوان، منی لال : ۲۲

جوش لمبیانی : ۶۰، ۶۱

جوش ملیح آبادی : ۲۳۶

جیلانی بانو : ۲۱۰

جیلانی بیگم : ۳۳۷

جیس، مٹر : ۸۹

دستگیر الدین خان : ۳۳۷	حنات احمد شاہ ، : ۱۶۶
دلاد حسین : ۳۱۳	حسین اختر (مراد) : ۲۳۶
دیگر درمئیہ گو : ۳۴۹	دیکھیے آغا حشر کاشمیری
دیش بندھو گیتا : ۲۹۸	حکیم علی : ۱۴۸
دیوان سنگھ مفتون : ۱۸۹، ۱۸۸، ۱۸۷	حمید احمد خان : ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷
۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷	حمید نظامی : ۱۷۵
۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱	خود خاتم : ۲۴۰
دیو جانش کلبی : ۱۳۲	حیات اشد انصاری : ۲۸۲
دھپیت راکے : ۳۱۸	حیدر علی : ۱۴۹
	حیرت بدایونی ، تید حسن : ۲۰۸، ۲۰۷، ۲۰۶
	حیفی ، ریوی سہاے : ۲۷

خ

ڈاکٹر حسین (ڈاکٹر) : ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷	خضر تیمسی ، مولا بخش : ۱۰۰، ۹۹
ڈارنگ ، مالکم (سر) : ۲۷۸	خلیق ، میر : ۳۴۹
	خلیل احمد : ۱۷۱
	خلیل احمد خان : ۸۲
	خورشید جیندی : ۳۵۷
	خورشیدہ : ۲۸۹
ڈاکٹر حسین (ڈاکٹر) : ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷	داراب بیگ ، میرزا : ۳۴۴، ۳۴۵
ڈوق : ۲۹۸	داغ : ۳۱۰، ۲۹۸، ۲۰۹، ۹۴، ۴۵
	داؤد بیگ ، میرزا : ۳۴۵
راجندر سنگھ (ہمدانا) : ۳۷	دردانہ (شہزادی) : ۱۸۲
راجندر ناتھ : ۷۱	
راجندر حسین : ۱۴۹	
راشدن ، م : ۲۷۷، ۲۷۶، ۲۷۵	
۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳	
رافعہ دینت نثار (ٹادی) : ۱۴	
رام چھپال سنگھ شیدا ، دیکھیے شیدا ، رام چھپال	

- رام سروپ (رام درما) : ۴۷
 راجو دمن سنگھ (جہاد راجا) : ۱۹۷، ۱۹۸
 رحیم بخش : ۱۷۶
 رخشاں، عزیز الدین : ۱۱۷، ۱۱۸
 رزم ردو لوی، جعفر مہدی : ۳۵۱
 رسا، محمد علی : ۲۳۶
 رشید، پیارے صاحب : ۳۰۴
 رشید احمد صدیقی : ۱۲۵، ۲۹۲
 رضا، امام : ۲۲۵
 رضا آبادی، رضا علی خان : ۲۰
 رعد، حب لال : ۴۷
 رفیع احمد قدوائی : ۲۳۶
 رفیع الدین، قاضی : ۱۱۷
 رفیق لکھنوی، رفیق حسین : ۳۳۳
 رکن الدین عباسی : ۶۴۲
 رگھو بیر نندن : ۲۱
 رگھو نندن سرن : ۱۲۳، ۱۲۴
 رنجیت سنگھ (جہاد راجا) : ۱۷۶
 رنگی لال : ۵۰
 زکین، سعادت یار خان : ۳۲۷
 روشن نکو دری، روشن لال : ۶۰
 روشن پانی پتی، شگن چندر : ۲۹۹
 روشن صدیقی : ۲۷۷
 رئیس امر دہوی : ۲۹۱
 ریاض، ریاض احمد : ۲۸
 ریاض انصاری، ریاض الدین : ۱۱۷
 ریڈنگ، لارڈ : ۱۹۷
 ریچاز (رہنما حسان) : ۱۲۷
 زبر لکھنوی، ننھے آغا : ۲۹۴
 زکی حسین : ۲۳۶
 زیب النساء (بگم نجی) : ۳۴
 زین العابدین احمد (زین علی) : ۲۲۰
 زینت (رہنما نجی) : ۳۴
 سارول : ۶۰
 ساحر دہلوی، امر ناتھ دھان : ۳۵۰
 ساغر نظامی : ۴۲
 ساگر نکو دری، بلونت کمار : ۶۰
 سالک لکھنوی، محمد حسن : ۲۶۶
 سالک رام درما صاحب : ۲۹۷
 ساغر صدیقی، محمد اختر : ۱۲۸، ۱۲۹
 سائل دہلوی، سراج الدین احمد خان : ۲۰
 سبط حسن فاطمہ (سید) : ۲۶۵، ۲۶۶
 سید : ۲۷۷

سبط رسول، فاروقی :	۶۹	سید علی :	۲۲۵
سجاد ظہیر، سید :	۲۲۰	سید مسعود حسن رضوی :	۱۳۲۴، ۲۰۶
سحر، عبد المجید :	۳۸	۳۳۳، ۳۲۷، ۳۲۴، ۳۲۵	
سحر، محمد حسین قاضی :	۲۰۹	سید سلیمان ندوی :	۱۶۷، ۱۲۵، ۹۵
سر دول سنگھ کویشر :	۱۹۶	سیدہ بیگم :	۳۲۲
سر لادیوی :	۷۱	سیرین، ولیم :	۲۸۲
سرجانی دیوی :	۱۹۷	سیما، اکبر آبادی، عاشق حسین :	۲۸
سرور، رجب علی بیگ :	۳۲۹	۲۶۲، ۱۶۰، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۴، ۱۰۲	
سری رام (لالہ) :	۲۹۴	ش	
سعید احمد خان :	۸۲	شاد عظیم آبادی، علی محمد :	۱۵
سعید کامٹوی :	۱۶۳	شانقی (بنت قاصر) :	۳۱۸
سعید حسین :	۳۰۶	شاہد احمد دیوی :	۷۳
سعید رضا گہر، دیکھے گہر، سعید رضا :		شاہدہ (بنت نجی) :	۳۴
سعیدہ (بنت نجی) :	۳۴	شاہین (بنت راشد) :	۲۸۰
سکندر لودھی :	۶۴	شائق، نرگین سہاے :	۷۴
سکندر حیات خان (سر) :	۴۹	شبلی :	۶۷، ۶۷
سلطان محی الدین :	۲۳۷	شجاع الدولہ :	۲۹۴
سلیم پانی پتی، وحید الدین :	۳۰۴	شجاع، معظم جاہ (پرنس) :	۲۵۲
سیکمان خان :	۲۷۸	شرر، عبد الحکیم :	۳۰۴، ۶۷، ۶۶
سنگیت (بنت طالب) :	۲۹۹	شرف الدین شاہ :	۱۶۶
سورج پرشاد سٹھوے :	۴۸	شعبہ (پیر خان) :	۱۲۷
سید حسین فوق :	۲۲۰، ۲۱۸	شفق عماد پوری، سید حسین ترضی :	۴۹
سید عابد حسین :	۱۲۵، ۱۲۴	شفقت کاظمی فضل الحسن :	۲۲۸، ۲۲۶، ۲۲۵
		شفقت اللہ :	۸۴

- شیخ امیر : ۱۶۲
 شیدا اٹاوی : ۱۰۶
 شیدا، رام چھپال سنگھ : ۱۹۱
 شیر سنگھ فیروز پوری : ۱۹۰
 شیر شاه سوری : ۴۱
 شیر محمد اختر : ۱۴۵، ۱۴۳، ۱۴۲
 شیل، دالتر (مستر) : ۱۸۱
 شیلا انجیلینی : ۲۸۱، ۲۸۰
 شیو راج بہادر (راجا) : ۳۵۵
 شیو شنکر لال : ۳۱۰
 ص
- صابر حسین : ۳۵۱
 صادق ایوبی، حاجی محمد : ۲۲۷
 صدفۃ اللہ شہید انصاری : ۳۳۳
 صدر الدین چغتہ : ۱۷۹
 صدیقی حسن خان (نواب) : ۳۰۳
 صدیق علی شاہ : ۳۳۹
 صغیر النسا : ۶۵
 صفدر علی : ۱۴۹
 صفی بکھنوی، علی نقی : ۲۵۰، ۲۹۴
 صفی اللہ : ۱۶۲
 صفیہ (بنت حسان) : ۱۲۷
- شفیق الرحمان قدوائی : ۱۲۳
 شکلا (بنت قاصر) : ۳۱۸
 شکیب (پیر حسان) : ۱۲۷
 شکیلہ بیگم : ۶۹
 شکیلہ خاتون : ۲۰۹
 شمس مینری، شمس الدین احمد : ۳۱
 ۲۱۳، ۲۱۲
 شمس الدین : ۶۲
 شمس الدین (میر شمس) : ۲۳۳
 شمس الرحمن فاروقی : ۲۷۱
 شمیم کرہانی، شمس الدین حیدر : ۲۲۳
 ۲۳۶، ۲۳۵
 شنکر داس (نشی) : ۳۱۲
 شہاب الدین (چودھری سر) : ۴۹
 شہباز بیگ، میرزا : ۲۴۵، ۳۴۴
 شہریار (پیر دانش) : ۲۸۱، ۲۸۰
 شودش کاشمیری، عبدالکریم : ۲۸۷
 ۲۸۸، ۲۹۰
 شوق قدوائی، احمد علی : ۳۰۵
 شوق، عبدالصمد : ۳۸
 شوکت میرٹھی، احمد حسن : ۳۱۶
 شوکت تھانوی، محمد عمر : ۷۳
 شوکت حسین رضوی : ۲۳۴

ض

عبدالباری (عبادی) ندوی: ۷۸

عبدالجلیل : ۱۵۹

عبدالحق (شیخ): ۱۶۶

عبدالحق (مولوی): ۲۰۴، ۳۰۵

عبدالحمیم : ۱۵۸

عبدالحق نہال: دیکھیے نہال سیوادی

عبدالرحمن (سر): ۱۸۳

عبدالرحمن چغتائی: ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸

۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۲۷۷

عبدالرحمان نگرانی: ۱۶۷

عبدالرحیم چغتائی: ۱۷۶، ۱۸۱

عبدالرزاق (شاہ) ۳۵۶

عبدالغفور خان: ۲۶۱

عبدالقادر: ۳۳۷

عبداللطیف (منشی): ۳۷

عبدالماجد: ۱۵۸

عبدالماجد: ۲۷۵

عبدالمجید خواجہ: ۱۲۲

عبدالماجد دریابادی: ۳۵۵

عبدالولی: ۶۷

عبداللہ چغتائی: ۱۷۶، ۱۷۹

عبداللہ عمادی: ۳۱۶

عبداللہ سندھی: ۱۷۶

ضامن، ضامن علی (پروفیسر) ۲۰۴

ضمیر (مرثیہ گو): ۳۴۹

ضمیر الدین منیری: ۲۱۳، ۲۱۴

ضیاء الدہوی: ۴۶

ضیا، عظمت علی:

ط

طالب دہلوی شیش چندر: ۲۹۷

۲۹۸، ۲۹۹

طالب رزاقی، محمد قطب الدین حسن:

۳۵۵

ظ

ظالم سنگھ (رانانا): ۳۷

ظفر علی خان: ۷۶، ۲۸۸، ۲۸۹

۲۹۱، ۲۹۲

ظفر ہدی: ۲۶۶

ع

عابد اختر (عماد): ۲۳۶

عابد، عابد علی: ۲۷۷

عادف بکھنوی، علی محمد: ۳۰۴

عادف الرحمن چغتائی: ۱۸۶

عالمگیر اد رنگ زیب: ۳۷۷

عباس (ملا): ۶۳

غ

عثمان علی خان (نظام: ۹۵، ۹۴)

۱۸۲، ۳۵۲

غالب: ۸۲، ۳۲۸

غضنفر علی: ۱۴۹

غضنفر علی بخش: ۲۳۳

غلام احمد علمی: ۳۲۷

غلام جیلانی (حکیم): ۳۱۷

غلام جیدرخان: ۷۶

غلام ساحر علوی: ۳۸

غلام کبریا: ۱۶۲

غلام محمد صدیقی: ۶۵، ۶۶

غلامی، غلام رسول: ۲۷۶

غوث محمد: ۱۶۳

غوثیہ (ثمر فاطمہ): ۱۷۰

غیاث الدین بلبن: ۶۲

ف

فانی: ۸۸

فائز دلوی: ۳۲۸

فدا بخادی: ۲۲۸

فردوس جہان: ۱۴۹

فرزاتہ (سنت حسّان): ۱۲۷

فرید احمد عباسی: ۶۵

فرید الدین (مستر): ۸۷

عنایت اللہ خان مشرقی: دیکھیے مشرق علامہ فصاحت لکھنوی: ۲۹۴، ۳۴۴

عرشی، محمد حسین: ۳۱۳، ۳۱۸

عزیز جہالاداری، محمد عزیز الرحمن:

۳۷-۳۸

عزیز قدوسی: ۱۶۴، ۳۳۳

عزیز لکھنوی، محمد بادی: ۱۲۹۴، ۳۵۱

عشرت النساء بیگم: ۱۷۰

عطا اللہ شاہ بخادی (سید): ۲۹۱

عظمت علی (قاضی): ۲۰۷

عظیم حسین (میاں): ۴۹

علی بہادر (منشی): ۳۷

علی حسن، عظیم آبادی: ۱۵

علی حسین (حافظ) فوز: دیکھیے فوز

علی حسین

علی محمد: ۱۱۰

علی محمد: ۱۱۲

علی محمد عباسی: ۶۵

علی نقی، امام: ۲۰۵

علی نقی مجتہد: دیکھیے نقی صاحب

عمر الدین نقاش: ۱۷۷

عمر خیام: ۱۸۳

ک

- کاظم خجک : ۳۳۸
 کابل، کابل حسین : ۲۶۶
 کرتار سنگھ : ۱۸۷، ۱۸۸
 کرشن چندر : ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳
 ۷۴
 کریم بخش : ۱۷۶
 کریم خان : ۲۲۰
 کسری منہاس : ۱۱۲
 کشن پرشاد (مہاراجا) : ۲۰۸
 کشور بانو چغتائی : ۱۸۶
 کنھیالال : ۴۵
 کوپرسن، الیگزینڈر : ۲۷۹
 کوبک آفندی : ۳۵۲

گ

- گاندھی (مہاتما) : ۶۰
 گریٹر، مسٹر : ۲۱۲
 گلاب رائے : ۲۲
 گلاب سنگھ (مہاراجا) : ۲۸۷
 گنگا دام (سر) : ۱۷۲
 گوران دتال : ۳۱۲، ۳۱۳
 گووکی : ۷۵
 گوری شنکر د : ۲۷۱، ۲۷۲

نصیح لکھنوی، جعفر علی : ۳۲۹

فضل الہی چشتی : ۲۷۵، ۲۷۶

۲۷۷

فضل حسین (سر) : ۲۹

فوز، علی حسین : ۳۰۳، ۳۰۴

فہیم احمد فہمی : ۲۸

فیاض گوالیاری، فیاض احمد خان :

۱۱۹، ۳۳

فیروز الدین (مولوی) : ۲۶۲

فیروز طغرانی، فیروز الدین احمد :

۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷

فیض، فیض احمد : ۱۳۷

ق

قادری بیگم : ۳۳۷

قادری ملتانی : ۳۵۷

قاصر، برہم ناتھ دت : ۳۱۲، ۳۱۳

۳۱۹

قتیل دانا پوری : ۱۶

قطب الدین

قیس کوٹوی، فیروز محمد : ۲۷۷، ۲۷۸

قیصر جہان : ۱۲۹

قیصر مرست (صلاح الدین) : ۳۲۹

گردند سردپ: دیکھیے انور، منوہر سہلے
گہر عظیم آبادی، سعید رضا

ل

لاڈلی بیگم: ۳۳۷

لاڈلے صاحب: ۱۵

لکے، سنرک: ۱۸۱، ۱۸۰

لنگٹ سنگھ: ۲۱۴

لعل محمد: ۱۶۲

م

الویہ، مدن موہن (پٹنٹ): ۲۰

انی ناگیوری، بشیر خان: ۲۴۰

ابہر بکھنوی، باسط حسن: ۲۶۶

بتلا، مردان علی خان: ۳۳۰

مبشرہ: ۸۴

مفتخ اداس (ڈاکٹر): ۱۸۹

مجید لاہوری: ۱۳۷، ۱۰۰

مجید ملک: ۱۸۴

مجتبیٰ حسین، ماسٹر: ۳۹۵

محبوب الرحمن: ۳۹

محبوب عالم (دمنشی): ۴۹

محبوب علی خان (نظام): ۹۴

محبوبن: ۳۵۵

محسن کاکودی: ۳۸

محسن، محمد محسن: ۲۰۹

محشر بکھنوی: ۳۵۱

محشر مرزا پوری، فرزند علی: ۱۴۸

محفوظ الرحمن: ۳۹

محمد اجل خان (حکیم): ۱۴۴

محمد احسن عباسی: ۶۶

محمد احمد: ۳۰

محمد اختر (سید): ۲۳۶، ۲۳۳

محمد ادیس: ۱۶۳، ۲۱

محمد اسحاق: ۱۶۳، ۲۸

محمد اشرف خان: ۲۶۱

محمد اصغر علی جعفری: ۳۳۲

محمد اکبر خان: ۷۶

محمد ایوب خان (فیلڈ مارشل): ۱۳۶

۱۸۳

محمد بخش چغتائی: ۱۸۵

محمد جلیس، قاضی: ۲۰۷

محمد حسن، اثر قاضی: دیکھیے اثر محمد حسن

محمد حسین (قاضی) سحر دیکھیے سحر، محمد حسین

محمد حسین عوشی: دیکھیے عوشی، محمد حسین

محمد حسین خان: ۱۲۴، ۱۲۳

محمد حمید اللہ خان (نواب): ۱۶۸

محمد داؤد عباسی: ۶۶، ۶۵

- محمد رفیع : ۳۴
محمد زکریا کاندھلوی : ۱۶۹
محمد سردار (جامعی) : ۱۷۵، ۱۷۶
محمد شاہ : ۲۵
محمد شفیع : ۳۲
محمد شفیع فوق (سید) : ۲۱۸
محمد صادق علی : ۳۰۳
محمد عصمت اللہ : ۸۲، ۸۵، ۸۶
۸۹
محمد عالم (حافظ) : ۲۷۷
محمد علی جوہر (مولانا) : ۶۸، ۶۹
محمد مبین چمریا کوٹی : ۳۲۸
محمد مجیب : ۱۲۵
محمد محمد شریف : ۳۱
محمد مخدوم : ۴۲
محمد نبی خان : ۱۲۳
محمد وارث حسن : ۲۶۶
محمد وحید کیلانی : ۲۷۷
محمد وسیع : ۳۴
محمد ہاشم فرنگی محلی : ۳۳۳
محمد یعقوب (شیخ) : ۳۴
محمد یوسف (سید) : ۶۱
محمد یوسف : دیکھیے یوسف، محمد یوسف
- محمد یوسف (بیان) : ۱۷۲
محمد یوسف قادری : ۳۵۵
محمد یوسف مخدوم زادہ : ۶۴
محمد یوز - نوی : ۱۲۵
محمد واجد عباسی : ۶۴، ۶۵، ۶۶
۶۷، ۶۸، ۶۹
محمد واجد خان : ۷۷، ۷۸
محمد بیگ میرزا : ۳۴۴، ۳۴۵
محمد حسین : ۳۰۶
محمد حسین بیگ مرزا : ۳۴۵
محمود صدیقی لکھنوی، محمد حسین :
۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶
منصور، راجندر سنگھ (مہارانا) : دیکھیے
راجندر سنگھ (مہارانا)
مدن موہن مالویہ، دیکھیے مالویہ
مدن موہن
مرتضیٰ حسین (سید) : ۳۲۴
مرزا جواد لکھنوی : ۳۲۸
منتظم باللہ عباسی : ۶۴
مشرقت چغتائی : ۱۸۶
مسعود بیگ، میرزا : ۳۴۵
مسیح الدین خان : ۳۳۷
مسیح الزماں (سید) : ۲۰۴، ۲۰۵
۳۳۲

- مشتاق حسین (ذکار الملک) : ۶۶
 مشرقی (علامہ) عنایت اللہ خان : ۲۷۹
 مصطفیٰ احمد شاہ : (۱۷۰)
 مضطر حیدری ، دلادر حسین : ۲۲۳
 ۲۲۲
 مضطر ، محمد علی : ۱۴۹
 مطیع اللہ : ۸۴
 معظم (پسر حامد) : ۲۷۱
 معین اللہ دکنہ : ۳۳۷ ، ۳۳۸
 معین الدین (ندی) : ۱۶۷
 معین الدین احمد شاہ (ندی) :
 ۱۶۷ ، ۱۶۶
 مفتون کوٹوی : ۲۸ ، ۲۹
 ملا ، آند نزلین (پندت) : ۲۸
 ملا دادا صدی محمد اقصی ، ۱۹۵ ، ۱۹۶
 ملیح مرزا لکھنوی : ۳۲۹
 ممتاز (احمد خان) : ۸۲
 ممتاز محمد خان دولتانہ : ۴۹
 منصور (احمد خان) : ۸۲
 منظر لکھنوی ، منظر حسن : ۲۶۶ ، ۲۶۵
 منظور الحق نعمانی : ۱۷۰
 منور لکھنوی : ۲۱
 منور بیگ میرزا : ۳۴۴
 منور حسین رضوی : ۲۳۴۰
 منیر شکوہ آبادی ، اسماعیل خان : ۳۲۹
 منیر حسین (منیر المحوی) : ۳۰۶
 منیر خان : ۲۴۰
 موپاساں : ۷۵
 موتا سنگھ (ماٹر) : ۱۹۳
 موسیٰ چشتی مانچوری : ۶۵
 موسیٰ کاظم (امام) : ۲۲۵
 مومن علی (سید) : ۳۵۶
 مومنہ : ۸۴
 مؤید حسن : ۲۱۰
 ہجو شمس ، سید عبدالقیوم : ۴۱
 ہندی الزماں (سید) : ۲۰۵ ، ۲۰۴
 ہندی حسن ناصری : ۲۲۲
 ہندرسنگھ : ۲۰۱
 ہندرناتھ : ۷۱ ، ۷۲ ، ۷۳
 ۷۴
 ہر ، نرائین پرشاد : ۴۵ ، ۴۶
 ۴۷ ، ۴۸
 ہیش داس (راے صاحب) : ۲۹۷
 ہیش داس (نشی) : ۳۱۲
 میر ، میر تقی : ۲۰۵ ، ۳۲۷
 میراجی (شنا اللہ خان) : ۲۷۸

- میران بخش (نقاش) : ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹ : نصیر خان : ۲۴۰
- میر حسن (سید) : ۵۲ : نظام الدین : ۲۸۷
- میرن دہلوی (سید حسن ہمدانی) : ۳۰۶ : نظر سہ ماہی ، یوگ راج : ۲۰
- نظم طباطبائی : ۳۳۸، ۱۲۶۳ : نظم طیر خان : ۲۴۰
- نقش صاحب (سید علی نقی مجتہد) : ۱۶۳ : نقن صاحب (سید علی نقی مجتہد) : ۳۳۳
- ناصر حجازی : ۱۲۸ : نکسن ، مسٹر : ۹۰، ۸۹
- نشار امدادی ، شارحین : ۱۰۵، ۱۰۶ : نندکار سنگھ : ۲۰۱
- نجم ، ابراہیم ندوی ، سید : ۱۶۰ : ننھے آغا زبرکھنوی : دیکھیے زبرکھنوی
- نجم آنندی ، میرزا تجمل حسین : ۱۳۴۹ : لوح ناردی : ۳۰۹، ۱۱۸، ۴۷
- نجم الدین : ۲۶۵ : نور الحسن ہاشمی : ۹۰
- نجمہ (دبنت نجفی) : ۳۲ : نور جهان (ملکہ ترم) : ۲۳۴
- نجیب (پیر حسان) : ۱۲۷ : نور محمد : ۱۱۰
- ندھان سنگھ (ڈاکٹر) : ۱۷۸ : نوکشور (نشی) : ۳۰۳
- ندیم جعفری ، فیض احمد : ۲۲۷ : نہال بیوی ہادی ، عبدالحق : ۲۰
- ندیر احمد (دبئی) : ۸۷ : نہرو ، جواہر لال (پنڈت) : ۲۳۶
- نزدت جہان : ۲۲ : نیاز فچتوری : ۱۹۶
- نزہل (پسر اشد) : ۲۸۱ : نیرنگ کاکوروی ، عبدالحق : ۲۸
- نسرین (دبنت حامد) : ۲۷۱ : نیر مسعود (ڈاکٹر) : ۲۳۲
- نسرین (دبنت اشد) : ۲۸۰ : و
- نیمہ خاتون : ۱۵۹ : دادشا حسین : ۲۶۵
- نشر جالندھری ، محمد عبدالحکیم خان : ۲۶۳، ۲۶۲، ۲۶۱

۲۵	هر ناته : ۲۴۰	داسطی، فضل رسول : ۲۴۰
۳۷	هریش شنگه (جهارانا) : ۱۷۰	دجی النسابیکم : ۱۷۰
۲۹۵، ۲۹۴	هرار الکنوی، سید حسن : ۱۵۰	دجیدالآبادی : ۱۵۰
۲۳	هرک، بکے : دیکھے، لیکے، ۲۳	درددا احمد : ۱۷۰
۳۱۸	هر، منصب علی (میر) : ۱۸۵	دزیر النساء، بیگم : ۱۸۵
۸۲	یاسمین (رنت) راشدا : ۳۱۸	دشوانا ناته دتا : ۳۱۸
۱۳۱	یزدانی جالندھری : ۸۲	دقار (احمد خان) : ۸۲
۳۲۵، ۳۲۴	یعقوب بیگ، میرزا : ۳۱۸	دیران دیوی : ۳۱۸
۱۷۸	یوسف حسن (حکیم) : ۵	
۳۲۹	یوسف سرمست (محمد شرف الدین) : ۳۲۹	مادی علی میرزا : ۳۲۹
۶۴	یوسف، محمد یوسف : ۶۴	مادون الرشید : ۶۴
۲۲	یوگ راج نظر سولانی : دیکھے نظر	ماشمی، التفات رسول : ۲۲
۲۳۶	سولانی، یوگ راج : ۲۳۶	ماشمی بانو : ۲۳۶
۳۳۷		مہارستاشمی الدین : ۳۳۷

مطبوعات (کتاب و رسائل)

الف مقصودہ	
۳۳ :	اسلاف میر انیس
۱۶۸ :	اسلام اور عربی تمدن
۲۱۵ :	اشعار نظر
۳۰۹ :	انکارِ بمل
۱۶۸ :	اقبال کی شاعری
۱۹۵ :	اکالی (ہفتہ دار)
۱۹۸ :	ابلاغ (ہفتہ دار)
۱۲۶ :	الشی دوا
۲۹۲ :	الجہاد الجہاد
۸۸ :	الخیل (ماہنامہ)
۱۲۶ :	الزام کس پر ہے
۲۷۱ :	الفاظ کی خوشبو
۱۲۷ :	انقراۃ الرشید
۲۶۲ :	الہام منظوم
۱۹۸ :	الہلال (ہفتہ دار)
۳۰۴۹۰۵ :	الناظر (ماہنامہ)
۲۰۶ :	امانت کی اندر کبھا
۳۲۷ :	امتحانِ وفا
۱۳۷۱۳۶ :	امروز (روزنامہ)
۱۳۲ :	اب میں وہاں نہیں رہتا
۲۰۹ :	ابریق
۹۹ :	احرار (روزنامہ)
۱۳۲ :	اداس تنہائیاں
۲۲۱ :	ادب اور ادیب
۲۲۱ :	ادبی ڈرامے
۱۶۸ :	ادبی نقوش
۲۲۱ :	اردو ادب آزادی کے بعد
۲۰۵ :	اردو ادب کی تاریخ
۳۲۹ :	اردو ڈراما اور اسٹیج
۲۲۱ :	اردو شاعری کا سماجی پس منظر
۲۰۶ :	اردو مرثیہ کا ارتقا
۲۰۶ :	اردو مرثیے کی روایت
۷۵ :	اردو ناول کی سبج
۱۶۳ :	ارمغانِ جدید
۸۲ :	ارمغانِ حالی
۳۰۴ :	ازدواجِ الالبینا
۲۹۲ :	اس بازار میں

۲۹۰ :	آزاد (روزنامہ)	۲۹۸ :	امریکن رپورٹر :
۱۲۶ :	آستین کاسانپ	۹۴ :	امیراللغات :
۱۷۵ :	آفاق (روزنامہ)	۱۳۷ :	انجام (روزنامہ)
۲۰۹ :	آئینہ	۳۳۰ :	اندوسبھا
۲۵ :	آئینہ بحور	۳۰۴ :	انسانی قربانیاں
۳۳۰ :	آئینہ سخن فہمی	۳۲ :	انصاف کا کوڑا
۲۲۱ :	آئینہ معرفت	۲۹۹ :	انوارِ نظر
ب		۳۰۵ :	انورنامہ
		۳۳۰ :	انبیاء
۷۵ :	بچن (منہدر ناتھ)	۳۱۹ :	اہلِ سیف
۳۲ :	بد نصیب بادشاہ (نجمی)	۳۲۹ :	ایاغِ بزم
۷۴ :	بمات (منہدر ناتھ)	۲۷۱ :	ایجادات کی کہانی
۱۲۶ :	برف کا گھر (حسین حسان)	۲۸۲ :	ایران میں اجنبی
۲۳۶ :	برقہ و باران (شیم)	۳۳۱ :	ایران میں مرثیہ گوئی
۳۱۹ :	برگ و بار (قاصر)	۳۳۰ :	ایرانیوں کا مقدس ڈراما
۳۳۰ :	بزمِ سلیمان (ادیب)	۳۶۱/۳۲۱ :	ایشیا (مہفتہ وار)
۳۴۸ :	بڑی حویلی (محمود بیگ)	۷۵ :	ایک شمع ہزار دیوانے
۴۸ :	بوستان (سعدی)	۳۲۹ :	آبِ حیات
۲۱ :	بوسے گل (اکمل)		
۲۹۲ :	بوسے گل، نازِ دل، دودِ چراغِ محفل	۳۰۶ :	آبشار
۱۵۸ :	بیان الغرائب	۲۹۸ :	آجکل (ماہنامہ)
۳۳۹ :	بیسویں صدی میں اردو ناول	۷۴ :	آدمی اور سکے
۲۷۱ :	بھارت کے نامور سائنسدان	۱۴۲ :	آدھے چاند کی رات
۱۴۲ :	بھنور (ٹھاکر پوٹھی)		

تیری صورت میری انگلیں (ہندو ناتھ): ۷۵

ترونی (مفتون): ۲۰۲

تصادیر چغتائی: ۱۸۲

تصویر چین (ماہنامہ): ۱۳۷

تعبیر، تشریح، تنقید (سیح الزماں): ۲۵

تفصیل زحانات (جوان): ۲۵

تلاشِ سحر (شیم): ۲۳۶

تمغہ خدمت (شورش): ۲۹۲

تیمور کا گھرا نا (چغتائی): ۱۸۲

تنہا تنہا (ہندو ناتھ): ۷۷

تہذیبِ مودت (نجم): ۳۵۲

تہذیبِ نسوان (ماہنامہ): ۱۷۲

تیج (روزنامہ): ۲۹۸

ط

ٹریڈرسٹ (ماہنامہ): ۱۶۰

ٹیلیفون کی کہانی (سیح الزماں): ۲۰۶

ٹھوکر (ہندو ناتھ): ۷۵

ج

جام جم (مضطر): ۲۲۲

جامعہ (ماہنامہ): ۱۲۵

جانِ برادر (شیم): ۲۳۶

جب پتھر روتے ہیں (ٹھاکر پونجی): ۱۴۲

جذباتِ بسل: ۳۰۹

ب

پاکستان سے ہندوستان تک (ہندو ناتھ): ۷۲

پت جھڑکے پھڑکے (ٹھاکر): ۱۲۲

پرچمِ ضیا (قاصر): ۳۱۹

پردہِ ساند (مہجور شمس): ۲۲

پسِ دیوارِ زمان (شورش): ۲۹۲

پنجایت (ماہنامہ): ۱۰۰

پیاد کا موسم (ہندو ناتھ): ۷۵

پیاسے بادل (ٹھاکر پونجی): ۱۲۲

پیامِ تعلیم (ماہنامہ): ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۲۶

پیغامِ صلح (مفتہ دار): ۱۷۲

پھولوں کا ہار (نجمِ آفندی): ۲۵۱

ت

تابعین (شاہِ معین الدین احمد): ۱۶۷

تاریخِ اسلام (معین الدین احمد): ۱۶۷

تاریخِ امروہہ (محمود احمد عباسی): ۶۸

تاریخِ فیروز شاہی: ۳۰۵

تاؤ کے اپدیش (حسین حسان): ۱۲۶

تجلیاتِ انور (انور کامٹی): ۱۶۳، ۱۶۴

تحقیقِ انساب (محمود احمد عباسی): ۶۸

تحقیقِ مزید (محمود احمد عباسی): ۷۰

تذکرۃ الکرام (محمود احمد عباسی): ۶۸

تذکرہ شعراے امروہہ ("): ۷۰

حضرت آرزو کی اصلاحیں (جوان) : ۲۵۰
حقیقت قوم کبوتر (محمود احمد عباسی) : ۷۰
حمید نظامی (شورش) : ۲۹۲
حیاتِ یلمان (ندوی) : ۱۶۸
حیاتِ سیدنا (امجاد) : ۲۲۱

خ

خالصاخبار (سفہ دار) : ۱۹۰
خانہ زنجیر (ندیم) : ۲۲۷
خدا نگر ناز (طالب) : ۳۰۰
خلافت معاویہ دینرید (محمود احمد عباسی) : ۷۰
خلفائے راشدین (شاہ معین الدین احمد) : ۱۶۷
خجائے جاوید (سری رام) : ۶۵
خمتان کیفی (طالب) : ۳۰۰
خورشید دراما (سج الزماں) : ۲۰۶
خوش رنگ پھول (جوان) : ۲۵
خیالستان (ماہنامہ) : ۹۹

د

داستان میری، مذکر تیرا (ہندو ناتھ) : ۷۷
داغِ حسرت (شفقت کاظمی) : ۲۲۸
دلستانِ اردو (ادیب) : ۲۲۷
دور کا رشتہ (ہندو ناتھ) : ۷۵
دستگیر (ماہنامہ) : ۲۹۸
دلی اتحادہ سوتادان کی (محمود بیگ) : ۳۳۸

جذباتِ مشرق (دیوان شگفتون) : ۲۰۲، ۲۱۱
جواہر پالے (قاصر) : ۳۱۹
جواہر سخن (ادیب) : ۳۲۸
جے کبکشاں (نجمی) : ۳۲
جہاں میں رہتا ہوں (ہندو ناتھ) : ۷۷
جہاں نما (ماہنامہ) : ۱۰۰

چ

چاندنی کے سایے (ٹھاکر پوٹھی) : ۱۲۲
چاندی کے تار (ہندو ناتھ) : ۷۷
چٹان (سفہ دار) : ۲۹۰
چراغِ بزم (بزمِ آفری) : ۳۲۹
چغتائی آرٹ (چغتائی) : ۱۸۳
چغتائی اور اس کے نقاد : ۱۸۲
چغتائی کی عریان تصویریں : ۱۸۲
چاروں کے چاند (ٹھاکر پوٹھی) : ۱۲۲
چہ قلند انہ گفتم (شورش) : ۲۹۲

ح

حرفِ غزل : ۲۰۵
حرفِ ناتمام (طالب) : ۲۹۹
حرفِ نیم شب (شمیم) : ۲۳۶
حریت (روزنامہ) : ۹۹
حسرت کدہ (شفقت) : ۲۲۸
حسین شہید سہروردی شورش : ۲۵۲

۷۵ :	ردپا	۳۳۰ :	دلی میں مرثیہ گوئی (ادیب)
۲۶۳ :	روح ادب	۱۲۵ :	دنیا کے بچے (حسین حسّان)
۳۲۸ :	روح انیس	۲۱ :	دو چراغ
۲۳۶ :	روشن اندھیرا	۱۲۶ :	دیک (حسین حسّان)
۹۹ :	رومان (ماہنامہ)	۱۶۸ :	دین رحمت (شاہ معین الدین احمد)
۲۶ :	رہنمایان مند	۳۰۵ :	دیوان اظفری
۱۹۹، ۱۹۸، ۱۸۹ :	ریاست (مفتہ دار)	۳۰۵ :	دیوان میر محمدی
۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲ :	ریاستہائے متحدہ کی تاریخ	۱۰۶ :	دھرتی میرے پیار کی (نثار)
۲۰۶ :	زخم حسرت	۳۱۹ :	ڈال ڈال، پات پات (قاصر)
۱۴۲ :	زلف کے سر ہونے تک	۱۲۲ :	ڈیڈی (ٹھاکر پوچھی)
۱۸۹، ۱۲۵ :	زمانہ (ماہنامہ)	۳۱۹ :	ذکر و فکر (قاصر)
۱۲۶ :	زمین کے بھائی بہن	۷۵ :	رات اندھیری ہے
۲۸۸، ۷۶ :	زمیندار (روزنامہ)	۱۲۲ :	رات کے گھونگھٹ
۱۲۲ :	زندگی کی دوڑ	۲۸۲ :	ن، م، را شد پر
۷۵ :	زیم سے ہیرد	۲۵ :	رام بن باس
۷۳ :	ساقی	۱۲۶ :	رامو نے پڑھنا سیکھا
۳۰۰ :	سبزہ بیگانہ	۲۵ :	رباعیات جوان
۱۸۴ :	ستادون	۲۹۹ :	رہن مالا
۲۹ :	سراج الدین علی خان آرزو	۱۹۵ :	رعیت (روزنامہ)
۱۲۵ :	سرکارِ دو عالم	۳۱۷ :	رفیق الاطبا (ماہنامہ)

۸۰ :	رشتو	۱۶ :	سرائے نشاط
۴۶ :	شعاع ہر	۴۶ :	سفید جوگن
۹۹ :	شعراے پنجاب	۸۲ :	سفینہ ادب
۶۱ :	شکنتلا (نامک)	۳۳۰ :	سلطان عالم و اجد علی شاہ
۱۲۵ :	شمع	۶۱ :	سودا (ڈراما)
۱۳۲ :	شمع ہر رنگ میں جلتی ہے	۱۰۵ :	سودا گز بچہ
۱۹۳ :	شہادت کا تازہ قطرہ	۷۵ :	سوز، ریت، گناہ
۱۰۰ :	شیرازہ (سفتہ دار)	۲۵ :	سوز دل
۱۹۱ :	شیر پنجاب (سفتہ دار)	۲۶۶ :	سہیل مین
ص		۲۹۲ :	سید عطاء اللہ شاہ بخاری
۲۳۶ :	صبح فادان	۱۰۵ :	سیر پرستان
ط		۱۶۷ :	سیرۃ النبی
۳۰۵ :	طبقاتِ ناصری	۲۰۱ :	سیف و قلم
۳۲ :	طلوعِ سحر	ش	
ع		۳۲ :	شاخار (دواہی)
۱۶۸ :	عرب کی موجودہ حکومتیں	۳۳ :	شاعرِ اعظم انیس
۱۱۰ :	عروج (ماہنامہ)	۳۷ :	شاعر کا دل
۱۶ :	عظیم آباد کی گزشتہ ادبی محفلیں	۲۷۸، ۱۷۳ :	شامکار
۲۳۶ :	عکس گل	۲۹۲ :	شبِ جلے کہ من بوم
۱۸۳ :	عمر خیام (مستود)	۱۱۲ :	شبِ رفتہ
۱۸۳، ۱۸۳ :	عملِ چغتائی	۲۷۱ :	شبنون (ماہنامہ)
غ		۲۶۳ :	شرحِ بال جبریل
۲۹۰ :	غبارِ خاطر	۳۳۰ :	شرحِ طباطبائی اور تنقیدِ کلامِ غالب

۲۵ : کلمات جوان

۲۰۶ : کلیات مومن

۲۰۶ : کلیات میحس

۷۴ : گالی

۲۹۲ : گفتنی ناگفتنی

۲۱۵ : گلبانگ

۹۵ : گلدستہ فصاحت

۵۴ ، ۴۸ : گلستان (سعدی)

۳۲۰ : گلشن سخن

۱۹۵ : گرد و گشتال (سفہ دار)

۲۱۵ : گوهرین نامہ

۲۰ : گیتا

۲۸۲ : لا : انسان (راشد)

۱۷۲ : لاٹ (انگریزی سفہ دار)

۶۵ : لحن داؤدی

۳۲۹ : لکھنؤ کا شاہی اسٹیج

۳۲۹ : لکھنؤ کا عوامی اسٹیج

۱۸۴ : لکان

۷۵ : لیڈر

۱۳۷ : لیل و نہار (سفہ دار)

ف

۲۵۲ : فتح مبین

۲۵ : فریاد و جواب فریاد

۳۲۷ : فرنگ اشال

۳۲۹ : فائدہ عبرت

۳۲۷ : فیض میر

۲۹۲ : فیضان اقبال

ق

۱۷۵ ، ۱۷۴ ، ۱۷۳ : قذیل (سفہ دار)

۳۳۰ : قواعد کلیہ بھاکا

۲۷۷ : قوس قزح

ک

۱۸۴ : کاجل

۱۸۴ : کار چنتائی

۳۲ : کامیاب تلوار

۵۴ : کتاب القرف

۵۴ : کتاب النحو

۷۸ : کرینٹ (باہنامہ)

۹۰ : کرینٹ مومن (ٹیگور)

۳۰۰ : کشمیر کی سیر

۳۲ : کشور کا تنا

۳۰۵ : کلمات اشعرا

۳۰۵ : کلمات ابجدی

۲۶۶ :	منظر و نظادہ	۱۸۲ :	مادون آرٹس چغتائی کا حصہ
۲۰۶ :	موازنہ انیس و دبیر	۲۸۶ :	مادرا
۲۹۲ :	موت سے واپسی	۹۰ :	ماہ نو
۳۵۰ :	مولود و معراج	۱۰۷ :	ماہ و انجم
۱۶۷ :	مہاجرین	۷۲ :	مالی دار لنگ
۳۱۹ :	منکہ مکتوب الیہ	۲۶۲ :	مشنوی مولانا ردم
۳۱۹ :	میرا بھائی	۳۲۷ :	مجالس رنگین
۳۲۱ :	میری دنیا	۲۶ :	محاورات ہر
۲۰۱ :	نما قابل فراموش	۱۸۹ :	مخزن (ماہنامہ)
۲۱ :	نمالہ دل	۲۲۱ :	مختصر تاریخ ادب اردو
۱۲۵ :	ناموران اسلام	۶۱ :	مذہب و رساگر
۴۶ :	نثر ثریا	۲۲۰ :	مذہب و شعاعی
۲۷۸ :	نخلستان (ماہنامہ)	۱۳۰ :	مراتی ریختہ
۶۱ :	نزیلا (راہلین)	۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱ :	مرقع چغتائی
۸۲ :	نسخہ حمید	۱۸۲ :	
۲۶۳ :	نثر ادب	۳۱۶ :	مسیحا (ماہنامہ)
۳۲۷ :	نظام اردو	۳۵۱ :	مشودہ (ماہنامہ)
۱۹۵ :	نظام المشائخ (ماہنامہ)	۳۵۲ :	معراج فکر
۲۲۸ :	نغمہ حسرت	۲۰۶ :	مجادد میران
۳۰۶ :	نغمہ فردوس	۶۷ :	مکتوبات حالی
۱۸۲ :	نغمہ لذت	۲۲۱ :	ملک ادب کے شاہزادے
۲۲۸ :	نغمہ تاسید	۷۵ :	منزل ایک مسافر

۵

- ہفت رنگ : ۲۶۶
 ہماری زمین : ۶۲۶
 ہماری شاعری : ۳۳۴، ۳۲۷
 ہمارے حسین : ۲۹۹
 ہمایوں (ماہنامہ) : ۲۲۷، ۱۷۳
 ہمدرد (روزنامہ) : ۶۸
 ہمدرد (روزنامہ) : ۱۹۱، ۱۹۲
 ہم قلم (ماہنامہ) : ۱۳۷
 ہمدرد (سہفتہ وار) : ۱۹۵
 ہندوستان (سہفتہ وار) : ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳
 ہندی تصاویر چغتائی : ۱۸۲
 ہومر : ۳۱۹

ی

- یادگار برق : ۲۹۹
 یادگار عشق : ۱۶
 یادوں کے کھنڈر : ۱۴۲
 یاما (کو پڑھیں) : ۲۸۳، ۲۷۹
 یوسف زینبا (جائی) : ۲۸
 یہ تھی دلی : ۳۰۰
 یہ رشتے، یہ روگ : ۱۴۳
 یہاں سے وہاں تک : ۷۴

- نفسیات (ماہنامہ) : ۱۷۳
 نفسیاتی جائزے (ماہنامہ) : ۱۷۳
 نقش چغتائی : ۱۸۲، ۱۸۳
 نقیب (ماہنامہ) : ۱۲۵
 نگار (سہفتہ وار) : ۱۳۷
 نگارشات ادیب : ۳۳۰
 نکلان (سہفتہ وار) : ۱۰۰، ۱۳۷
 نوائے راز : ۴۲
 نوائے وقت (روزنامہ) : ۱۰۰، ۱۷۵
 نو بہار (ماہنامہ) : ۸۸
 نئی بیماری : ۷۴
 نئے ادبی رجحانات : ۲۲۰
 نئے نام : ۲۷۱
 یزنگ خیال (ماہنامہ) : ۷۸، ۲۷۷

و

- دادیاں اور دیرانے : ۱۴۲
 واقعات اظفری : ۳۰۵
 وقت کا آسمان : ۲۸۲
 وکیل (امرتسر) : ۲۶۲، ۳۱۶

۳۱۷

نئی اور اہم مطبوعات

۸۰۰ -	ڈاکٹر خورشید الاسلام	(شعری مجموعہ)	بستہ جتہ
۲۵۰ -	ڈاکٹر شمیم حنفی	(تنقیدی و تحقیقی)	جدیدیت کی فلسفیانہ اساس
۵۰۰ -	نشور واحدی	(شعری مجموعہ)	گل افشانی گفتار
۲۳۰ -	ڈاکٹر مظفر حنفی	(تحقیقی)	شاد عارفی شخصیت اور فن
۵۰۰ -	مصطفیٰ صدیقی	(ریلک ریلیشن)	رابطہ عامہ
۱۲۰۰ -	اطہر پرویز	(تذکرہ)	علی گڑھ سے علی گڑھ تک
۱۶۰۰ -	شاہ عبدالسلام	(تحقیقی)	دبستان آتش
۲۰۰۰ -	حقیق صدیقی	(تحقیقی)	سر سید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ
۱۴۰۰ -	مجیب اللہ ندوی	(مذہب)	فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل
۱۸۰۰ -	اخلاق اثر	(تحقیقی)	ریڈیو ڈرامے کا فن
۱۲۰۰ -	خواجہ احمد عباس	(افسانے)	نئی دھرتی، نئے انسان
۱۲۰۰ -	جیتندر بلو	(ناول)	پرائی دھرتی، اپنے لوگ
۱۶۰۰ -	خواجہ عبدالغفور	(لطائف)	شکوہ زار
۱۲ - ۵۰	ڈاکٹر قیصر جہاں	(تحقیقی)	اردو گیت
۱۲ - ۵۰	پرواز اصلاحی	(تحقیق)	مفتی صدر الدین آزاد
۶۰۰ -	سید شمیم اشرف	(ناول)	ایک مٹھی ہندوستان
۲ - ۲۵	مولانا ابوالعرفان ندوی	(سوانح)	آئینہ اربعہ
۱ - ۵۰	مالک رام	(تحقیقی)	فسانہ غالب
۱۲ - ۲۵	صالحہ عابد حسین	(افسانے)	درد و درماں
۸۰۰ -	مولانا عبدالسلام ندوی	(مذہب)	مسلمان اور وقت کے تقاضے
۱۵۰۰ -	ڈاکٹر عابد حسین	(مضامین)	انشائیات
۱۴ - ۶	مالک رام	(تذکرہ)	تذکرہ معاصرین دوم
۱۸۰۰ -	ڈاکٹر سیفی پری	(تحقیقی)	حیات اسماعیل میرٹھی
۸ - ۵۰	غلام ربانی تاباں	(شعری مجموعہ)	نوائے آوارہ
۱۰ - ۵۰	آمنہ زامن ملا	(شعری مجموعہ)	کرب آگہی
۴۰۰ -	سلمان اختر	(شعری مجموعہ)	کونہ کونہ
۴۰۰ -	جاں نثار اختر	(شعری مجموعہ)	پچھلے پہر
۱۲۰۰ -	سکندر علی وجہ	(شعری مجموعہ)	بیاض مریم

لسبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز) مکتبہ جامعہ لیتھو، پٹودی ہاؤس دریا گنج دہلی 110002